میں اور میرا
پاکستان
عمران خان
Yadgar
Chauki
Khurd
Kohing
Kalat
Bunap
Ghausabad
Tahumulk
Kharan
Kohak
Surab
Sharaf
Nag
Kacha Daman
Ghichak

ناتمام

ہارون الرشید

کپتان کی کہانی

بظاہر یہ ایک کھلاڑی اور سیاستدان کی کہانی ہے لیکن دراصل یہ ایک سپاہی کی داستان ہے۔ وہ آدمی جس نے کرکٹ، کینسر ہسپتال اور سیاست کی رزم گاہوں میں پیش آنے والے حادثات میں زندگی، اور خود کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش ابھی جاری ہے اور جاری رہنی چاہیے۔ تمام اندازے یہ ہیں کہ ابھی وہ غلطیاں کرے گا اور امید یہ بھی ہے کہ ابھی اسے بہت سے مزید کارنامے انجام دینا ہیں۔ سب سے بڑا معرکہ ابھی کچھ دن میں درپیش ہو گا...... اور اللہ کے آخری رسول ﷺ کا فرمان یہ ہے: کوئی اس دنیا سے اٹھے گا نہیں، جب تک اس کا ظاہر و باطن آشکار نہ ہو جائے۔ پروردگار اسے امان میں رکھے اور اس کی آنکھ اپنے آپ پر کھول دے۔ اللہ کا قانون کسی کے لیے بدلتا نہیں۔ جن کے رتبے سوا ہیں ان کی آزمائش بھی سوا ہوتی ہے۔

برطانیہ کا ایک دانشور یہ کہتا ہے کہ یہ طویل تحریر کمال ذہانت سے لکھی گئی۔ دوسرے کا خیال ہے کہ بالکل سادہ سے انداز میں...... دونوں باتیں درست ہیں اور پوری طرح درست۔ ہم جو اسے جانتے ہیں، اس راز سے خوب واقف ہیں کہ بے شک وہ ایک سادہ سا آدمی ہے لیکن گاہے

بہت غور وفکر کرنے والا بھی۔ سب دوسروں کی طرح وہ اسی وقت غلطی کا ارتکاب کرتا ہے، جب اپنے خیال کے سحر میں مبتلا ہو جائے اور کامران تب جب اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر فیصلہ کرے۔ صرف اپنے آپ پر نہیں، اللہ پر بھروسہ کرے۔

یہ اس کی اپنی کہانی ہے اور اتنی ہی پاکستان کی بھی، جس کی تخلیق کے پانچ برس بعد وہ پیدا ہوا۔ ایک آسودہ گھرانے کا اکیلا اور لاڈلا فرزند، زندگی جس پر مہربان تھی لیکن سب دوسروں کی طرح اپنے آپ سے اسے لڑنا تھا۔ دوسرے نیازی لڑکوں سے وہ کس طرح مختلف تھا اور کرکٹ کے دوسرے کھلاڑیوں سے؟ بارہا یہ سوال میں اس کے دوستوں اور بھائیوں سے اور بانداز دِگر خود اس سے بھی پوچھتا رہا۔ یہ بھی سوچتا رہا ایک عام اخبار نویس کی زندگی میں وہ کیسے داخل ہوا۔ اس جہان میں یہ ناچیز کیسے چلا گیا، جس سے کبھی اس کا واسطہ نہ تھا، جو آج بھی کرکٹ کی اصطلاحوں کو سمجھ نہیں پاتا اور شوکت خانم ہسپتال میں، جس کا ایک ذرا سا حصّہ بھی نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ منکشف ہوا، وہ اس لیے مختلف ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا، روپے کی ہوس میں مبتلا نہیں ہوتا، ہمیشہ کا رجائیت پسند ہے اور جس کام میں ہاتھ ڈالے، اسے ادھورا کبھی نہیں چھوڑتا۔

شاید یہ 1981ء تھا، بزرگ کالم نگار عبدالقادر حسن کے ایک جملے نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا اور پھر وہ میری زندگی کا کبھی نہ الگ ہونے والا حصّہ ہو گیا۔ میں نے اس کے بارے میں چھپنے والی تقریباً ہر اس عبارت کو پڑھا جو پڑھ سکا اور اس کے بارے میں کی جانے والی ہر گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے خاندان، خاص طور پر اس کے عم زاد حفیظ اللہ خان سے میری ملاقات تھی جو بتدریج گہری بے تکلفی میں بدل گئی۔ حفیظ اللہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ بلند آواز سے سوچتا ہے، خامی بھی یہی ہے۔ 1996ء میں پہلی بار، اس کے ساتھ میری مفصل ملاقات ہوئی، جب جنرل حمید گل نے ایسا کرنے کا مشورہ دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رفاقت گہری ہوتی گئی۔ ظاہر ہے کہ ہمیشہ اتفاق رائے نہ تھا خاص طور پر بعض عسکری امور اور شخصیات کے باب میں مگر اللہ

کے فضل سے باہمی اعتماد بے حد۔ وہ ایک مستقل مزاج آدمی ہے۔ تعلق اور اس کی نوعیت من مرضی سے استوار کرتا ہے لیکن پھر حتیٰ الامکان بگڑنے نہیں دیتا۔ ادھر یہ ناچیز پرلے درجے کا متلوّن مزاج۔ اللہ کا شکر ہے کہ نبھ گئی اور خوب نبھی! اگرچہ برسوں پہلے عصرِ رواں کے عارف نے، جن کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہے، اور جو اسے بھی خوب جانتے ہیں، یہ کہا تھا: تم اس کے ساتھ شریک اقتدار نہیں ہو گے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مجھے اس امتحان سے محفوظ رکھے اور اسے سرخرو کرے۔

1983ء میں، میں نے ایک مضمون لکھا کہ ایک دن وہ سیاست میں آئے گا۔ آج تک وہ حیران ہے اور میں خود بھی کہ یہ خیال مجھے کیسے سوجھا۔ تب اس سے میری ذاتی ملاقات تک نہیں تھی۔ درویش کا کہنا یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ خود نہیں لکھتا، گاہے اس سے لکھوا دیا جاتا ہے۔

جب اس کتاب کے ترجمے کا مرحلہ آیا تو بہت دن وہ میز پر پڑی رہی۔ انگریزی زبان پر میری دسترس محدود ہے لیکن کسی اور کو سونپنے پر طبیعت آمادہ نہ تھی۔ تجربہ کیا تو ناکام رہا۔ اوّلین مسوّدہ 2001ء میں لکھا گیا اور اب بھی میری لائبریری میں پڑا ہے لیکن پھر نائن الیون کا حادثہ ہوا تو اس نے نظرِ ثانی کا فیصلہ کیا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ مل کر لکھ ڈالیں گے لیکن پھر فرصت عنقا ہو گئی۔ جولائی 2011ء میں ایک دن لگ بھگ چار سو صفحات کی مربوط کتاب اس نے میرے حوالے کی اور حیرت سے میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ کب اور کہاں اتنا وقت وہ نکال سکا؟ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز یہ کہ ایک ایک سطر میں وہ جھلکتا تھا۔ علّامہ اقبال کی تحریروں کا اس قدر انہماک سے وہ کیسے مطالعہ کر سکا اور اس قدر واضح نتائج کیونکر اخذ کر سکا۔ رانا محبوب اختر بار بار مجھ سے پوچھتے: کیا یہ (فکرِ اقبال کا) باب اس نے خود لکھا ہے؟ زچ ہو کر میں نے عرض کیا: مدد ہی لینا ہوتی تو کیا مجھ سے بات نہ کرتا؟ وہ ایک حیران کن آدمی ہے، کسی بھی وقت، کچھ بھی اس سے سرزد ہو سکتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ غیر معمولی ذہانت کا آدمی ہے بلکہ اس لیے کہ اللہ نے عزم کی بے پناہی اسے

بخشی ہے۔جس چیز سے محبت ہو جائے، اس کا ہو رہتا ہے۔اقبالؔ سے اُسے محبت ہے۔ان کے خواب پاکستان سے بھی اتنی ہی شدید۔

2004ء کے بعد جب اس کی پارٹی بکھر گئی تھی اور جمائما بچوں کے ساتھ لندن میں جا بسی تھیں، شام کو فراغت اسے میسر ہوتی۔راول جھیل کے مقابل بلندیوں پر بنے، حاسدوں کے سینے پر مونگ دلتے اس کے گھر کے اردگرد کھلے میدان میں کبھی ہم گھوما کرتے۔برق کی طرح ایک خیال ایک دن ذہن میں چمکا۔خان صاحب آپ خوش قسمت بہت ہیں۔شوکت خانم ہسپتال کے لیے اللہ نے آپ کے ہاتھ میں کشکول پکڑا دیا ورنہ آپ ایک متکبر آدمی ہوتے۔حیرت سے اس نے میری طرف دیکھا اور بچوں کی سی معصومیت سے بولا "تم ٹھیک کہتے ہو۔"

جب یہ مکان زیر تعمیر تھا تو کبھی ایک ہلکی سی اداسی اس کے چہرے پر جھلک اٹھتی، جس کے لیے یہ گھر بنایا جا رہا تھا، اب وہ سات سمندر پار تھی۔بچے اسے یاد آیا کرتے لیکن یہ دُکھ اس نے تنہا سہا اور بہت بعد میں اور سرسری طور پر بیان کیا۔اتنے بڑے مکان میں وہ اکیلا کیسے رہے گا؟ تین کمرے کے فلیٹ میں وہ آسانی سے بسر کرتا تھا۔جمائما نے کہا تھا کہ مکان کی تعمیر کے نصف اخراجات وہ ادا کرے گی، جسے قبول کرنے میں خوددار آدمی متامل تھا، لیکن اب وہ یہاں نہیں تھی۔کبھی وہ اس مکان سے بیزار بھی ہو جاتا: "مکان نہیں یہ ایک کنواں ہے، جس میں روپیہ گرتا رہتا ہے۔" ایک بار اس نے کہا تھا۔اپنی تمام زائد آمدن وہ ہسپتال اور یونیورسٹی کو دے دیتا ہے۔وہ کبھی ایک فضول خرچ آدمی نہ تھا اور نمائش پسند تو ہرگز نہیں۔میں نے کہا: اللہ، تمہیں روپے سے محروم نہ رکھے گا، جو بندوں کے کام میں لگا رہتا ہے، اس کے کام پروردگار کے ذمہ ہوتے ہیں۔آئندہ چند ماہ کے دوران اسے دو لاکھ ڈالر سے زیادہ ملے اور پھر ملتے ہی رہے حتیٰ کہ عالمی کپ میں مبصر کی حیثیت سے نصف ملین ڈالر کی پیش کش ہوئی، جو اس نے مسترد کردی۔اس زمانے کے اور بہت سے واقعات بھی ہیں۔میرے جی میں آتا ہے کہ "کپتان کی

کہانی" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ ڈالوں۔کون جانتا ہے کہ لکھ پاؤں گا یا نہیں۔اس کے باوجود کہ میری کوئی باقاعدہ ذمہ داری نہیں، وقت اب نہیں ملتا۔کبھی تو وہ بھی تعجب سے کہتا ہے: تم تو عید کا چاند ہو گئے۔

پھر مکان مکمل ہو گیا اور ایک شام اس کے صحن میں ہم موجود تھے۔ایک دن اس نے کہا "اتنا بڑا گھر؟ یہ تو ایک وزیراعظم ہی کو زیبا ہے۔" بے اختیار میری ہنسی چھوٹ گئی۔میں نے کہا تاریخ میں شاید یہ پہلی بار ہوگا کہ ایک مکان کی خاطر ایک شخص کو وزیراعظم بنایا جائے۔حسِ مزاح اس کی بہت اچھی ہے مگر اس روز وہ نہ ہنسا۔اس میں لاہوریوں والی بے باکی نہیں۔

عمران خان کی سب سے بڑی کامیابی کیا ہے؟ کرکٹ کا عالمی کپ؟ جس کی وجہ سے اس کا نام کھیل کی عالمی تاریخ میں رہے گا کہ ڈیڑھ سو برس کا سب سے اچھا کپتان کہلایا؟ شوکت خانم ہسپتال جو شاید ایک دن تاج محل سے بڑی داستان ہو جائے؟ کیا وہ کارنامہ جو غالباً ابھی انجام دینا ہے؟ نہیں میرا خیال ہے کہ اس کی سب سے بڑی کامرانی ہستی باری تعالیٰ کا ادراک تھا۔میرے خیال میں اللہ کی آرزو میں اس کا سفر اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے اور اسی کو سب سے زیادہ توجہ کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے۔اس سمندر کا صدف یہی ہے۔مغرب کے اس نادر روزگار صوفی بایزید نے جسے راہ سلوک کے چار بڑوں میں سے ایک مانا جاتا ہے، یہ کہا تھا: چالیس برس میں نے اللہ کو تلاش کیا، جب میں نے اسے پایا تو دیکھا کہ وہ میرے انتظار میں تھا۔پروردگار کا دروازہ ہمیشہ چوپٹ کھلا رہتا ہے لیکن اس کی تلاش میں نکلتا کون ہے؟ پھر جو نکلتے ہیں کیا ان کی اوّلین ترجیح، صداقتِ کاملہ کی تلاش ہوتی ہے؟ میری موجودگی میں پروفیسر احمد رفیق اختر نے کپتان سے پہلی ملاقات میں یہی سوال پوچھا تھا۔درحقیقت ان دونوں کے درمیان یہی جملہ گفتگو کا آغاز تھا۔خان نے جواب دیا: میری سیاست، صرف پاکستان نہیں، عالم اسلام کے لیے ہے۔میری رائے میں اس سوال اور اپنے جواب پر اسے غور کرتے رہنا چاہیے۔بعض پہلو ابھی جواب چاہتے ہیں۔صرف اظہار میں نہیں، عمل میں بھی۔

عمران خان کے روحانی سفر میں پروفیسر صاحب اس کے استاد نہ تھے؛ اگرچہ وہ کہتا یہ ہے: پروفیسر قرآن کریم کے عالم اور اس کے اوراق سے فروزاں بصیرت کے امین ہیں۔ ایک دن شب گیارہ بجے سے صبح پونے چار بجے تک، وہ ان سے فلسفۂ ارتقا پر سوالات کرتا رہا، حتیٰ کہ فجر کی اذان کا وقت آ پہنچا لیکن وہ ان کا شاگرد نہیں۔ اقبالؔ کا ہے اور میاں محمد بشیر کا۔ ان سے بھی پہلے اپنی والدہ محترمہ کا۔ بچے کی زندگی میں اکثر اس کی ماں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ جس شخص کا نام عمران خان ہے، اس کی شخصیت کے تار و پود بننے میں ممتا کا کردار بہت ہی غیر معمولی ہے۔ اس میں ایثار، ہمدردی اور محبت زیادہ تر وہیں سے آگی ہے ورگرنہ وہ بہت سخت گیر ہوتا۔ اپنے آغا جان سے اس نے خودداری پائی ہے۔

یہ اس سوال کا محل نہیں کہ ماں سے کیا کچھ سیکھا لیکن ایک بات یقینی محسوس ہوتی ہے کہ بارگاہ ایزدی میں فرزند کے لیے مادرِ مشفق کی بعض دعائیں یقیناً باریاب ہوئیں۔ ایک یہ کہ وہ پروردگار کی دہلیز تک جائے، دوسری یہ کہ اسے کوئی پاک طینت استاد نصیب ہو اور تیسری شاید یہ کہ وہ غیر معمولی کامیابیوں اور نیک نامیوں سے سرفراز ہو۔ آخری دعا کی حتمی تکمیل باقی ہے۔ آخری سانس تک زندگی امتحان ہے۔

راولپنڈی پریس کلب میں اخبار نویسوں نے جب اسے زچ کر دیا تو اس انداز میں جو اس سے خاص ہے، اپنا بازو پھیلا کر عزم سے گونجتی بلند آواز میں اس نے کہا ”میں ایک طوفان لے کر آؤں گا۔“ یہ 1996ء کا موسم گرما تھا۔ ہم وہاں سے اٹھے تو مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ ہار جائے گا۔ اس نے انشاء اللہ نہ کہا، ابھی اس کا وقت نہ آیا تھا۔ اس دن تو میں خاموش رہا لیکن بعد میں گاہے اسے یاد دلاتا رہا۔ ایسی بات وہ توجہ سے سن لیتا ہے، اور لیڈروں کی طرح برا نہیں مانتا۔ یہی اس کے ساتھ تعلق کی سب سے اہم بنیاد ہے۔ برسوں پہلے ایک بار جب میں نے اسے سخت تنقید کا نشانہ بنایا تو بعد میں پوچھا: کیا میرا کالم تمہیں ناگوار ہوا؟ اس کا جواب یہ تھا: تم مجھے سمجھے ہی نہیں۔

میں فلاں اور فلاں کی طرح نہیں ہوں۔ اس طرح کی تنقید سے برا ماننے کی بجائے سیکھتا ہوں۔ یہی ایک بات اسے یاد رکھنی ہے، پوری طرح اور تمام جہات میں۔ اس کے لیے دعا کرنے والے بہت ہیں مگر خوشامد کرنے والے بھی کم نہیں...... اور خوشامد بھٹکا سکتی ہے، گمراہ کر سکتی ہے، حتیٰ کہ برباد بھی۔ خدا اسے فریبِ نفس اور خوشامدیوں سے محفوظ رکھے۔

وہ ایک حد سے زیادہ پر اعتماد آدمی ہے یہی اس کی قوت ہے اور یہی اس کی کمزوری۔ مایوس ہونا اس نے سیکھا ہی نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اس سے زیادہ تباہی لانے والی چیز کوئی نہیں لیکن وہ کوئی سکالر نہیں۔ اسے تعلیم، رہنمائی اور مشورے کی ضرورت رہتی ہے۔ مجھ سے نہیں، ماہرین سے، اہل فکر و نظر سے۔ سبھی کو ہوتی ہے۔ اللہ کی کتاب یہ کہتی ہے کہ جب الجھ جاؤ یا تنازعے میں جا پڑو تو اہل علم کے پاس جاؤ، اہل ذکر سے رجوع کرو۔

ناکامی کا اندیشہ خارج نہیں داخل سے ہوتا ہے۔ اپنی ذاتی کمیوں اور خامیوں سے، انداز فکر کے نقائص سے، جن کا جائزہ ہمیشہ اور ہر وقت لیتے رہنا چاہیے۔ شاید اس ارشاد کا پس منظر یہی ہے: ”جب اللہ کسی بندے کو ہدایت دینا چاہتا ہے تو اس کی آنکھ اپنے آپ پر کھول دیتا ہے۔“ سب سے بڑا خطرہ کہاں سے ہوتا ہے؟ سبھی کے لیے اس ایک پہلو سے۔ جب آدمی اپنے فرض کی اہمیت کو نسبتاً کم اور اپنی صلاحیت کو زیادہ سمجھنے لگتا ہے۔ اوّلین ملاقاتوں میں ایک بار میں نے اس سے سوال کیا: تمہاری کامیابی کا راز کیا ہے؟ ترت اس نے جواب دیا: میں اپنی حدود سے واقف ہوں۔ کچھ بعد دن اس نے بتایا کہ کرکٹ کے کسی بھی میچ میں خواہ اس نے جیتا یا ہارا، ایک رجسٹر پر اس نے اپنی اس دن کی غلطیاں ضرور لکھ لیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے پروفیسر صاحب نے سیالکوٹ سے ٹیلی فون پر مجھ سے کہا: ”ان سب کو گھیر گھار کر جنہیں آنا ہے اللہ اب اس کے پاس لے آئے گا۔ جب وہ گھیرا ڈالتا ہے تو وہ قطعی اور مکمل ہوتا ہے۔“

ایشیا کے عظیم ترین رہنماؤں میں سے ایک مہاتیر محمد نے گزشتہ دنوں یہ کہا: بالآخر پاکستان کو ایک ایماندار اور بہادر لیڈر مل گیا ہے۔ معلوم نہیں کیسے اور کیوں وہ مدتوں سے اسے جانتے ہیں اور اس کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں۔ شاید تب سے، جب سے وہ سیاست میں آیا ہے۔ اتفاق سے، اس کے دوستوں میں، سب سے پہلے مہاتیر کا یہ تبصرہ مجھ تک پہنچا اور میں نے اسے ملائشیا کے مدبّر سے ملاقات کا مشورہ دیا۔ اتفاق ہی سے ایک عالمی کانفرنس میں ان کا آمنا سامنا ہوا جو دنیا بھر کے ممتاز لیڈروں کو گاہے بہ گاہے یکجا کرنے والی ایک تنظیم نے برپا کی تھی۔ وہ اس کے ساتھ شفقت سے پیش آئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ کوالالمپور کے نواح میں ان کے شاندار مکان میں ان سے جا کر ملا اور اس موضوع پر ظفرمند لیڈر کے ساتھ تفصیل سے تبادلۂ خیال کیا کہ ملک اور اقوام سربلند کیسے اور کیونکر ہوا کرتے ہیں۔ پھر انہیں اسلام آباد مدعو کیا۔ تحریک انصاف کی حالت ان دنوں اچھی نہ تھی۔ یہ اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ اخراجات اتنے زیادہ ہوں گے۔ بزرگ لیڈر خصوصی جہاز میں عملے کے ساتھ آئے گا اور دو دن تک کرائے کا جہاز ہوائی اڈے پر رکا رہے گا۔ 30 لاکھ روپے قرض لیا گیا اور تاخیر سے واپس کیا جا سکا۔ میرے خیال میں یہ تحریک انصاف کی بہترین سرمایہ کاری تھی۔

کانفرنس کے مدعوئین کی فہرست مرتب کی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا: یہ تو سب کے سب اپوزیشن لیڈر رہیں۔ ''کیا آپ لوگوں نے مہاتیر محمد کے اعزاز میں اپوزیشن کی کل جماعتی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟'' اس کے کارکنوں سے میں نے پوچھا اور مشورہ دیا کہ جنرل پرویز مشرف کے سیاسی سپہ سالار چوہدری شجاعت حسین کو مدعو کیا جائے۔ چند روز قبل چوہدری صاحب نے یہ تاثر دیا تھا کہ اس نے نہیں بلکہ پرویز مشرف نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ ان کا لہجہ تلخ تھا اور ناشائستہ بھی۔ اس کے باوجود وہ فوراً ہی مان گیا اور ان کے علاوہ مشاہد حسین کو بھی دعوت دی۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس کے بہترین فیصلوں میں سے ایک تھا۔ چوہدری شجاعت اور مشاہد حسین اس

کے گھر آئے اور خوش دلی سے ضیافت میں شریک ہوئے۔ یہی وہ کانفرنس تھی جس میں میزبانی کے فرائض نامور اخبار نویس طلعت حسین کو سونپے گئے۔ آغاز ہی میں اس بھلے آدمی نے جو گاہے ضرورت سے زیادہ بے باکی پر اتر آتا ہے، یہ کہا: ایک کھلاڑی کی حیثیت سے عمران خان میرے ہیرو ہیں مگر سیاستدان کے طور پر نہیں۔ عمران جب سٹیج پر آیا تو بہت سنجیدگی اور وقار کے ساتھ طلعت حسین سے مخاطب ہو کر اس نے کہا، ''ایک دن آپ مجھے سیاسی لیڈر بھی مان لیں گے۔''

کیا اس نے انشاء اللہ کہا تھا؟ یاد نہیں پڑتا!

یہ اس کی زندگی کے ان شاندار ایام میں سے ایک تھا، جب وہ اپنے طرز عمل، گفتار اور رویے سے آپ کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ جب وہ محسوس کرتا ہے کہ امتحان آ پڑا ہے اور ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہو جاتا ہے۔

ایسے کئی واقعات مجھے یاد آ رہے ہیں۔ چار سال ادھر کی بات ہو گی، لاہور کے ایک ممتاز اخبار نویس نے کہا: عمران خان کی سیاست تو ختم ہو گئی۔ وہ ان دنوں بعض مقتدر ہستیوں کے بہت قریب تھے۔ برہم ہونے والی بات نہ تھی کہ انہی کا نہیں، ان دنوں بہت سے لوگوں کا تاثر یہی تھا مگر معلوم نہیں کیوں مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا: دنیا کی کوئی طاقت اسے پاکستان کے سیاسی منظر پر ابھرنے سے روک نہیں سکتی۔ کل وہ لوگ اس کے پاس آئیں گے اور مدد کے طالب ہوں گے۔ براہ کرم ابھی سے یہ بات انہیں بتا دیجئے۔ چند روز بعد ان صاحب نے عمران سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اسے لاہور آنا تھا۔ (ان میں سے ایک شخص، بہت تگڑی سفارش کے ساتھ گزشتہ دنوں میرے پاس آیا۔ اب اس کی گردن اکڑی ہوئی نہیں تھی۔ بہت شائستگی اور وقار سے اس نے بات کی)۔

حفیظ اللہ خان کو ایسا موقع اللہ دے۔ اس نے کالم نگاروں کے اعزاز میں ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ شام سات بجے، جب میں گھر کے دروازے پر کھڑا ایک مہمان

سے بات کر رہا تھا، حفیظ اللہ نے فون پر فرمائش کی کہ میں لاہور پہنچ جاؤں۔ آٹھ بجے پی آئی اے کی پرواز کو روانہ ہو جانا تھا۔ وہیں سے مہمان کی گاڑی میں، میں چل پڑا۔ کسی سے درخواست کی کہ ٹکٹ خرید رکھے۔

اس شام ایلی جم کراس نے گفتگو کی۔ اس قدر تحمل سے سوالوں کے جوابات دیے کہ بعض دانشور تاب نہ لا سکے۔ ایک نے تو اگلے دن ہی میرے خلاف فردِ جرم جاری کر دی۔ کھانے کی میز پر میانوالی سے لائی گئی، دریائے سندھ کی ایک سالم مچھلی کے علاوہ، اتنا بہت کچھ تھا، اور اس قدر عمدہ کہ مجلس کا لطف دو آتشہ ہو گیا۔ میں نے کہا: اگر کبھی اقتدار ملا حفیظ اللہ خان، تو ایک وزارت لازماً ہمارے حصے میں آئے گی۔ آج کی ضیافت کے نام پر وہ تمہاری ہے۔ حفیظ اللہ کھکھلا کر ہنسا اور بولا: میرے بھائی کو پھر آپ سمجھے نہیں۔ جب یہ کپتان بنا تو سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اپنے ہیرو ماجد خان کو ٹیم سے الگ کر دیا۔ اپنی ساکھ بنانے کے لیے یہ مجھے پھانسی پر چڑھائے گا اور خلق خدا سے داد وصول کرے گا۔ مزاح کا برا پہلو یہی ہے کہ کبھی کبھی کوئی شاندار جملہ ماحول کی ساری متانت تار تار کر کے رکھ دیتا ہے۔ ایسا ہی ہوا۔ اگلی سویر تک ہم یہ لطیفہ لوگوں کو سناتے رہے۔ گفتگو کی دوسری نشست ہماری حماقت کی نذر ہو جاتی مگر عمران نے برا ماننے سے انکار کر دیا، کمال سنجیدگی کے ساتھ وہ سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جن صاحب کے بظاہر ناروا تبصرے پر یہ مجلس برپا ہوئی تھی، انہی نے سب سے زیادہ معقول طرزِ عمل اختیار کیا۔ کبھی اس دن کو یاد کرتا ہوں تو جہاں اس پر فخر کا احساس ہوتا ہے، وہاں اپنے شعار پر شرمندگی بھی۔

قصہ یہ ہے کہ جن دنوں عمران خان کپتان بنے، ماجد خان کی یکسوئی ختم ہو رہی تھی۔ رنز وہ بنا نہ سکتے اور نتیجے میں ٹیم مایوسی کا شکار ہو کر ڈھیر ہو جاتی۔ ایک لیڈر کی حیثیت سے عمران کا یہ پہلا امتحان تھا۔ وہ اس میں ظفر مند رہا؛ اگرچہ بہت بھاری قیمت چکانا پڑی۔ جس طرح اچانک انہیں

رخصت کیا گیا، اس پر وہ بہت بدمزہ ہوئے۔ وہ ایک نہایت معقول اور معتبر شخص ہیں مگر روٹھ گئے۔ تیس برس بعد ان کی مصالحت ہوئی۔ اس اثنا میں جب بھی ان کا ذکر ہوا، عمران خان کے لہجے میں اُداسی ہوتی۔ آخرکار وہ نمل یونیورسٹی کی افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے اور اس کے لیے عطیہ دیا۔ اس روز کالے پہاڑوں کے درمیان، ملک بھر سے جھیل کنارے جمع ہونے والوں کے درمیان کپتان بہت آسودہ رہا۔ بہت مجتمع اور فصیح۔ زندگی کے امتحانوں میں خاندان ہی نہیں، جوانی کے دوستوں کی پشت پناہی اور حمایت بھی بہت قیمتی ہوا کرتی ہے۔

جن دنوں یونیورسٹی کی تعمیر مکمل ہوئی، ایک اُردو اخبار کے آخری صفحے پر تین چار سطروں کی ایک خبر تھی: عمران خان کو برطانیہ کی بریڈفورڈ یونیورسٹی سے چانسلر کے منصب کی پیش کش ہوئی ہے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ فون کیا تو معلوم ہوا کہ خبر درست ہے مگر ساتھ ہی بتایا کہ وہ معذرت کر چکا کہ فرصت نہیں پاتا۔ ''آخر کیوں؟'' میں نے کہا ''نمل یونیورسٹی کے لیے اساتذہ کی تربیت کا بندوبست کیسے ہوگا؟'' دوسروں کا ردِّعمل بھی شاید یہی رہا ہوگا؛ چنانچہ اس نے برطانوی ادارے سے پوچھا کہ انہیں ہر سال کتنا وقت درکار ہوگا۔ انہوں نے کہا: حضور! صرف سالانہ تقریب کے لیے ایک دن۔ اللہ اللہ کر کے وہ راضی ہوا۔ بعد میں اس کے ہاں، یونیورسٹی کے وائس چانسلر، منتظمین اور اساتذہ سے ایک طویل ملاقات ہوئی۔ میں نے مہمانوں کے لیے چنے کی دال پکائی جو انہیں بہت پسند آئی۔ غور کیا تو کھلا کہ بغیر کھاد کی پاکستانی دالیں بہت لذیز ہوتی ہیں (اور اس نعمت کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔) اس دن یہ انکشاف بھی ہوا کہ خان کے گھر پہ پلنے والے دیسی مرغ دو اڑھائی کلو کے ہو جائیں تو ذبح کیے جاتے ہیں۔ میں نے کہا: اللہ کے بندے، سوا کلو سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔ وہ دوسری نسل ہوتی ہے اور دوسری طرح کے باورچی، یہ اس بیچارے کے بس کی بات نہیں بمشکل وہ مانا مگر مان گیا۔

ایک اور موقعہ وہ تھا، جب گزشتہ برس اسلام آباد وارد ہوئے، کیمرون منٹر سمیت آٹھ سفیروں کو اس نے پنج ستارہ ہوٹل میں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ منٹر تو آنہ سکے کہ نائب صدر

جو بائیڈن اچانک پاکستان آ پہنچے تھے لیکن باقی لوگ موجود تھے۔ اس دن پہلی بار میں نے اُسے انگریزی میں طویل گفتگو کرتے سنا۔ خیالات میں ایسا ربط اور الفاظ میں ایسا آہنگ کہ سبحان اللہ۔ اس نے کہا: افغانستان میں کبھی کوئی نہ جیتا، امریکہ بھی ہار جائے گا۔ کیا آپ لوگ جانتے نہیں کہ انسان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک عام قسم کے آدمی اور دوسرے پٹھان۔ آدمی ڈر جاتے ہیں لیکن پشتون پر حملہ کرو تو وہ حساب برابر کر کے رہتا ہے، خواہ زمانے بیت جائیں، وہ میدان میں بروئے کار رہتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ بھارت میں ایسی ہی ایک گفتگو اس نے صدر بش کے بھائی سے بھی کی تھی اور میڈیا سمیت سبھی کو ششدر کر ڈالا تھا۔ بہر حال اس دن اسلام آباد میں اس نے جادو سا کر دیا۔ لگ بھگ نصف گھنٹہ بات کرنے کے بعد اس نے سوالوں کے جوابات دیے۔ تاثر اتنا گہرا تھا کہ ترک سفیر ضبط نہ کر سکا اور اس نے کہا: جہاں تک ہمارا تعلق ہے، سفارتی آداب الگ، ہم تو ہر حال میں پاکستانی قوم کے ساتھ ہوں گے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور یہ کہا: Gentle Men، میں بخار میں مبتلا ہوں اور اب اجازت چاہتا ہوں۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ سفرا کی آمد سے پہلے بھی ہم کچھ دیر گپ شپ کرتے رہے۔ نہ صرف اس نے بتایا نہیں بلکہ ہمیں احساس تک ہونے نہ دیا کہ وہ بیمار ہے۔

ہمیشہ وہ ایسا نہ تھا۔ کبھی چڑ جایا کرتا۔ تین اخبار نویسوں کے بارے میں، میں جانتا ہوں، جن میں سے دو کی کھیل کے زمانے میں اس نے دھنائی کی اور ایک کی بعد میں۔ کچھ اور واقعات بھی میرے علم میں ہیں۔ سوچ سوچ کر میں حیران ہوتا رہا کہ جس کسی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا، بعد میں ان کا طرزِ عمل اچھا رہا۔ بعض سے تو اس کی دوستی بھی ہو گئی لیکن اب وہ ایک مختلف آدمی ہے۔ بہت کچھ زندگی کے طوفانوں اور آندھیوں میں اس نے سیکھا ہے۔ امید ہے کہ اب عیش میں یادِ خدا سے وہ محروم نہ رہے گا اور طیش میں خوفِ خدا سے بے نیاز نہ ہوگا۔ اب گاہے غیر ضروری اور ظالمانہ تنقید بھی وہ برداشت کر لیتا ہے۔ مشورے دینے اور ان کی تکرار کرنے والے زچ کر دیتے

ہیں تو میرے ضبط کا بندھن گاہے ٹوٹ بھی جاتا ہے لیکن وہ اکثر ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ بہر حال وہ ایک بے باک اور سخت گیر منتظم ہے اور ضابطہ توڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔

تیس اکتوبر کے بعد واقعات کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ یوں تو پورے ملک میں، مگر اس کے لیے تو خاص طور پر۔ جب تک یہ کتاب چھپ کر سامنے آئے گی، بہت سی اہم قومی شخصیات تحریک انصاف میں شامل ہو چکی ہوں گی۔ اس کے ساتھ ہی میرا یہ اصرار جاری رہے گا کہ نام بدل کر اسے "پاکستان انصاف پارٹی" کہا جائے۔ پھر خیال یہ آتا ہے کہ ہر مشورہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کبھی تو مان کر بھی مسترد کر دیا جاتا ہے۔ یہی زندگی ہے۔ اللہ نے اسے کشمکش، تنوع اور آزمائش کے لیے تخلیق کیا اور دائم ایسی ہی رہے گی۔ یہ بھی ہے کہ

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد
ہر کہ گیرد مختصر گیرد

برف بلندیوں پر پگھلتی اور میدانوں میں پھول کھلاتی ہے۔ ندیاں شور مچاتی ہیں لیکن دریا میدانوں میں آسودہ ہونے لگتے ہیں، حتیٰ کہ سمندر میں اتر کر سو جاتے ہیں۔ ہم نہیں ہوں گے مگر کہانی شاید باقی رہے۔ وہ ملک کا آخری بڑا لیڈر نہیں جیسا کہ بعض سحر زدہ مداح گمان کرتے ہیں، ایک دن اسے بھی بساط لپیٹنا ہوگی۔ ایک دن دوسرے آئیں گے، جب یہ معاشرہ انشاء اللہ زیادہ بیدار ہوگا۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ ایک دن وقت کی رزم گاہ سے ہر کوئی رخصت ہوتا ہے، کسی دوسرے کھلاڑی کے لیے۔ کھیل کے میدان کو اس نے اپنے عروج پر خیر باد کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا۔ تقدیر نے اسے روک لیا کہ ایک خیرہ کن کامیابی مقدر تھی۔ اقتدار کو الوداع کہنا مگر بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اب کی بار وہ وقت آئے تو اُسے زیادہ تامل سے کام نہ لینا چاہیے۔

کیا یہ مشورہ بہت قبل از وقت ہے؟ شاید نہیں بلکہ یقیناً کہ ابھی تو وہ راہ میں ہے۔ ابھی تو اس کی منزل، مسافرت کے اس گرد و غبار سے، بہت دور ہے، بہت آگے واقع ہے، لیکن میں یاد دلانا چاہتا ہوں اور اس کا ایک سبب ہے۔ لیڈر اور پارٹیاں نہیں، افواج اور گروہ نہیں بلکہ ملک کے محافظ، اس کے

عوام ہوتے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ، مہذّب اور معتدل مزاج قوم، جسے امن حاصل ہو، جس کے مزاج سے ہیجان کم ہوتا جائے۔ جو ایک پختہ ارادے کے ساتھ اپنے کمزور ترین لوگوں کو انصاف عطا کرنے کی راہ پر چل نکلے۔ کوئی آدمی اس دنیا کا ٹھیکیدار نہیں ہوتا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا، پروردگار نے اپنے سب سے محبوب بندے رحمت العالمین ﷺ پر یہ فرمان صاف صاف اتار دیا تھا۔

دیباچہ لکھنے کا ارادہ نہ تھا۔ اس تذکرے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ ترجمہ کس نے کیا لیکن کتاب کی اشاعت کا آغاز ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ بعض پہلو تشنہ ہیں اور بعض نکات کی وضاحت ضروری ہے۔

ٹیکس اور اثاثوں کا کیا ذکر، وکلاء تحریک کے ہنگام، 15 مارچ 2009ء کی شب اس کے زیرِ زمین چلے جانے کے سفید جھوٹ کا کیا ذکر، کردار کشی کی مہم ابھی برپا ہوگی۔ جن کے اربوں ڈالر اور جن کا اقتدار خطرے میں ہے، وہ آسانی سے ہار نہ مانیں گے۔ یہ ایک طویل انگ ہے اور عزم و ہمت کے علاوہ صبر و تحمل کا مطالبہ کرتی ہے۔ غور و فکر اور ریاضت ہی نہیں بلکہ عالی ظرفی اور ہر حال میں اصولوں سے جڑے رہنے کا۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ترجمہ کرنے کے عمل میں، کتاب کا اسلوب کچھ نہ کچھ بدل گیا ہے اور ظاہر ہے کہ میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ بعض مقامات پر میں نے قلم لگایا ہے۔ کچھ نکات کپتان کو بتا دیئے مگر سب نہیں کہ اب اُسے فرصت کہاں اور کتاب کی بروقت تکمیل لازم تھی۔ اگر ضرورت پڑی تو میں ان نکات کی وضاحت کردوں گا۔

یہ مشکل کام کبھی مکمل نہ ہوسکتا کہ اگر بلال الرشید ٹائپ کرنے کی ذمہ داری خوش دلی سے ادا نہ کرتے۔ اگر برادرم غلام محی الدین ہاتھ نہ بٹاتے۔ نصف کے لگ بھگ ترجمہ انہی نے کیا مگر ذمہ دار میں ہوں کہ اسلوب کو یکساں رکھنے کی آرزو میں تقریباً یکسر ہی بدل ڈالا۔ دوسرے اور

دسویں باب کے حوالے سے آخری وقت تک میں تشویش کا شکار رہا۔ سب سے بڑھ کر رانا محبوب اختر نے مدد کی مگر میرے پسندیدہ کالم نگار عامر ہاشم خاکوانی اور میاں محمد خالد حسین نے بھی مسوّدہ پڑھا اور اصلاح کی۔ منفرد شاعر اور زبان و ادب کے ممتاز عالم ڈاکٹر خورشید رضوی نے بہت قیمتی مشورے دیے۔ شدید خواہش تھی کہ پورا متن اُنہیں سناؤں۔ مصروفیت کے باوجود وہ آمادہ بھی ہو گئے، پھر جناب مجیب الرحمٰن شامی نے آگے بڑھ کر میری صلیب خود اٹھالی۔ یہ ایک غیبی امداد تھی۔ ایک لکھنے والا کن غلطیوں کا ارتکاب کرتا ہے، اس کے مدیر سے زیادہ کوئی نہیں جانتا اور شامی صاحب ہی میرے وہ مدیر ہیں۔ میرے عزیز دوست آرٹسٹ آغا نثار نے جو مشکل مرحلوں کے دائمی رفیق ہیں، بہت سا وقت دیا۔ ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے لفظ کم پڑتے ہیں۔ آخری دنوں میں یہ ایک جنگی مہم کی طرح تھا۔ پبلشر فواز نیاز صاحب کو پیشہ ورانہ فرائض سے کہیں زیادہ عرق ریزی کرنا پڑی۔ اس پر وہ داد کے مستحق ہیں۔ ذاتی طور پر میں ان کا ممنون ہوں کہ مسافرت میں میرے آرام کا ہر لحظہ انہوں نے خیال رکھا۔ کچھ نام بھول گیا ہوں گا، ان سب سے معذرت۔ آدمی کو اللہ نے خطا و نسیان سے بنایا ہے۔ وماتوفیقی الاباللہ

ہارون الرشید
۱۸، دسمبر ۲۰۱۱ء
نیشنل ہوٹل، لاہور

فہرست

ابتدا
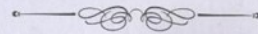
کال کوٹھری

تاثرات سے عاری، بالکل سپاٹ سے چہرے...... تقریباً بیس! انہوں نے مجھے گھیر لیا اور دھکے دینے لگے۔ ''تم لوگ چاہتے کیا ہو؟'' حیرت کے ساتھ میں نے ان سے پوچھا ''کیا تم جانتے ہو کہ تم لوگ کر کیا رہے ہو؟'' ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ صحن کے مقفل دروازوں سے پرے ایک ہجوم تھا اور چیخ رہا تھا۔ چاروں طرف کھڑکیوں سے طلبہ کے جتھے جھانک رہے تھے۔ یہ جاننے کو وہ بے تاب تھے کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں برہم تھا، یہ لوگ تحریک انصاف کے حلیف تھے، جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم، اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن۔ ہم ایک متحدہ محاذ کا حصہ تھے جو صدر جنرل پرویز مشرف سے نجات اور جج بحال کرنے کی تحریک کے لیے قائم تھا۔ اس کے باوجود طلبہ کا یہ گروہ صدر جنرل پرویز مشرف کے لیے کام کر رہا تھا، جس نے میری گرفتاری کا حکم دیا تھا۔ میرے ساتھ ان کا یہ سلوک گلیوں کے بے مہار چھوکروں جیسا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کی جمعیت کے بارے میں، بہت سی کہانیاں میں نے سنی تھیں لیکن پوری طرح اندازہ نہ تھا کہ وہ کیسے لوگ ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں ہر شخص ان سے خوف زدہ

تھا۔ کبھی شاندار تنظیم اور نظریات ان کی پہچان تھے، اب مگر وہ ایک مافیا سے نظر آئے۔ اسلحہ لہراتے اور مار پیٹ کرتے لوگ۔ یونیورسٹی میں آزادیٔ اظہار کا انہوں نے گلا گھونٹ دیا تھا، جہاں سے کبھی نوبل انعام پانے والی ایک ممتاز شخصیت ابھری تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں انگریزوں نے اس جامعہ کی بنیاد رکھی تھی۔ برصغیر کی دوسری اور پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی۔ ہر کوئی ان سے خوف زدہ تھا، حتیٰ کہ ان کی مادر تنظیم جماعتِ اسلامی بھی ان پر قابو نہ پا سکتی تھی، حکومت بھی نہیں۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ چوہدری پرویز الٰہی کی صوبائی حکومت کے ذریعے جنرل پرویز مشرف نے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے ان کے ایک لیڈر کو بھاری رقم ادا کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یونیورسٹی میں پولیس مجھے گرفتار کر کے رہے گی؛ چنانچہ گزشتہ شام ہی خاموشی سے میں کیمپس میں داخل ہو گیا۔ رات ایک پروفیسر کے گھر پہ گزاری۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے اس ٹولے کا خیال تھا کہ اگلے دن میں اپنے حامیوں کے ساتھ یونیورسٹی کے مرکزی دروازے سے آؤں گا۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے ہم سب کی پٹائی کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ تنہا نمودار ہو کر میں نے انہیں حیران کر دیا اور وہ بھی یونیورسٹی کے اندر سے۔ غیر ملکی اخبار نویسوں سمیت، بہت سے صحافی اپنے کیمروں کے ساتھ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ جیسے ہی میں پہنچا، طالبِ علم میرے گرد جمع ہو گئے۔ کندھوں پر انہوں نے مجھے اٹھا لیا، پھر یہ لوگ سامنے آئے، بیس یا شاید تیس۔ میرے ساتھ انہوں نے دھکم پیل شروع کی مگر ان کی سمجھ میں یہ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ میں اکیلا ضرور تھا لیکن سینکڑوں دوسرے بھی موجود تھے۔ مجھے ایک بڑے کمرے میں دھکیل کر دروازوں کو انہوں نے تالے لگا دیے۔ بار بار میں نے اپنا سوال دہرایا ’’تم لوگ چاہتے کیا ہو؟‘‘ اعتراض ان کا یہ تھا کہ میں ان سے پوچھے بغیر یونیورسٹی میں داخل کیوں ہوا۔ میں نے کہا: اس لیے کہ یونیورسٹی تمہاری ملکیت نہیں۔ یہ بھی کہا: کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری جماعت مشرف کی مخالفت کر رہی ہے کہ ملک میں اس نے ایمرجنسی نافذ کر دی ہے۔ ادھر تم ہو کہ

اس کی مدد پر تلے ہو۔۔۔ ’’تمہیں اندازہ ہے کہ تمہاری اس حرکت کا نتیجہ کیا ہوگا؟‘‘ میں نے ان سے پوچھا۔ میرا سوال ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑے فاصلے پر ان کا لیڈر موبائل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ کن اکھیوں سے وہ میری طرف دیکھ رہا تھا، ظاہر ہے کہ میرے بارے میں ہی گفتگو کر رہا ہوگا۔ وہ الجھن کا شکار تھا کہ کیا کرے۔ کچھ پروفیسر آن پہنچے لیکن دھکا کر انہیں چلتا کیا گیا۔ وہ بری طرح خوف زدہ تھے۔

دو ہفتے گزر چکے تھے۔ گرفتاری سے میں بچتا آیا تھا۔ ملک ایک طوفان کی زد میں تھا کہ صدر جنرل پرویز مشرف نے ہنگامی حالت نافذ کر رکھی تھی۔ 3 نومبر 2007ء کو جب یہ افسوسناک واقعہ رونما ہوا، میں لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) میں طلبہ سے مخاطب تھا۔ کسی نے کاغذ کا ایک پرزہ مجھے دیا کہ مجھ سمیت تمام سیاسی لیڈروں کو گھروں میں نظر بند کرنے کا حکم صادر ہوا ہے۔ گزشتہ سال بھی میرے ساتھ یہی ہوا تھا، صدر بش (Bush) جب پاکستان کے دورے پر آئے تھے۔

امریکی صدر کے خلاف میں راولپنڈی میں احتجاج کرنا چاہتا تھا جو پاکستان کے فوجی حکمران کی حمایت کرنے تشریف لائے تھے۔ عراق پر اس بہانے کے ساتھ امریکیوں نے حملہ کیا تھا کہ اس سرزمین کو وہ جمہوریت کا تحفہ عطا کرنے کے آرزومند ہیں۔ نظر بندی کی اطلاع سے میں پریشان نہ تھا۔ گھر میں بند رہ کر بھی سیاسی کام کیا جا سکتا ہے۔

تقریر کے بعد، ضروری مشوروں کے لیے میں دوستوں اور ساتھیوں سے ملا۔ کئی اجلاس کیے اور نصف شب کے بعد زمان پارک میں واقع اپنے آبائی گھر پہنچ گیا جہاں میرے والد اور بہنیں رہائش پذیر تھیں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ معاملہ خراب ہے، جب پولیس گھر میں گھس آئی۔ عام طور پر وہ لوگ میرے ساتھ نرمی سے پیش آتے مگر آج ان کا رویّہ جارحانہ تھا۔ نظر بند نہیں، وہ مجھے گرفتار کرنے آئے تھے۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے گرفتاری کا وارنٹ دکھائیں۔

جب وہ وارنٹ لینے گئے تو ایک اخبار نویس کا فون مجھے موصول ہوا: ”تمام دوسرے لیڈروں کو گھروں میں نظر بند کیا جائے گا لیکن آپ کو جیل میں ڈالا جائے گا۔“ فیصلہ کرنے کے لیے میرے پاس فقط چند منٹ تھے۔ اپنے بھانجے سے میں نے کہا: باہر صحن میں جا کر دیکھو، کیا بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ موجود ہے؟ اس نے بتایا کہ مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے لیکن باغ کے ساتھ دس فٹ کا ایک حصہ ان کے حصار میں نہیں۔ میں پچھلے صحن میں گیا اور دیوار کی طرف لپکا۔ بھانجے کی مدد سے دیوار پھلانگی اور پڑوسیوں کے باغ میں اتر گیا۔

میرا بچپن زمان پارک میں گزرا تھا۔ میرے کئی رشتہ دار اب بھی وہاں رہائش رکھتے ہیں۔ جب پولیس میرے آغا جان (والد محترم) کے بیڈروم سمیت گھر کی تلاشی لے رہی تھی، میں اپنے مرحوم نانا کے مکان میں پہنچ چکا تھا، پھر روزانہ جگہیں بدلتا رہا۔ ہر روز میں کسی اخبار نویس کو انٹرویو دیتا تا کہ میرا پیغام لوگوں، خاص طور پر پارٹی کارکنوں تک پہنچتا رہے۔ وہاں سے پھر میں آگے چل دیتا۔ مجھے گرفتار کرنے کی کوششیں جاری تھیں؛ چنانچہ مخبر سرگرم۔ دو یا تین بار ایسا ہوا کہ صرف دس پندرہ منٹ کے بعد پولیس اس گھر میں داخل ہوئی، جسے میں چھوڑ گیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ملک بھر میں پانچ ہزار افراد گرفتار ہوئے ہیں۔ میں ان اپوزیشن لیڈروں میں سے آخری تھا، جو پولیس کے ہتھے چڑھے۔ براہ راست رابطوں کے ذریعے، مجھے اپنے کارکنوں کو متحرک رکھنا تھا۔ اپنے موبائل فون ہم نے بند کر دیے تھے۔ ہمارے، بہت سے ساتھی زیر زمین تھے۔

طویل جلا وطنی کے بعد بے نظیر بھٹو حال ہی میں واپس آئی تھیں۔ ایک احتجاجی جلوس کے لیے وہ لاہور پہنچیں مگر پولیس نے گھیراؤ کیا تو منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بین الاقوامی میڈیا بے نظیر کے اردگرد موجود تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ غیر ملکی اخبار نویسوں کی موجودگی کا فائدہ اٹھاؤں۔ اس طرح گرفتاری دوں کہ زیادہ سے زیادہ تشہیر ہو سکے۔ اس کام کے لیے پنجاب

یونیورسٹی سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی، جہاں طلبہ کی تعداد ملک کے کسی بھی دوسرے تعلیمی ادارے سے زیادہ ہے۔ یوں ایمرجنسی کے خلاف طلبہ کو متحرک کرنے کا ایک بہترین موقع بھی میسر آتا۔ نوجوانوں میں میری جماعت پہلے ہی مقبول تھی۔ میری تمام امیدیں طلبہ اور نوجوانوں سے وابستہ تھیں۔ وہی نتیجہ خیز ہوتے ہیں، جس طرح 1960ء کے عشرے میں، ویت نام کی جنگ کے ہنگام امریکہ کی نئی نسل۔ 1990ء کی دہائی میں صدر سوہارتو (Suharto) کے خلاف انڈونیشیا کے نوجوانوں کی بغاوت اور بعدازاں 2011ء میں مشرق وسطیٰ کی ”عرب بہار۔“ آرزو میری یہ تھی کہ طالبِ علم اب حرکت میں آئیں۔ آمروں کی تمنا ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ عوام سیاست کے بکھیڑوں سے دور رہیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ عالمی پریس اور طلبہ کی موجودگی میں گرفتاری پیش کی جائے۔ خاموشی سے دھر نہ لیا جاؤں۔

جمعیت کے نام پر ہنگامہ کرنے والوں کو میں نے بتایا کہ میں کس لیے آیا ہوں اور یہ کہ اب مجھے خود کو پولیس کے حوالے کر دینا ہے۔ دھکے دے کر انہوں نے مجھے ایک گاڑی میں گرا دیا اور بڑے دروازے تک لے گئے، جہاں ایک پولیس انسپکٹر میرا منتظر تھا۔ بار بار وہ مجھے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا ”بات کیا ہے؟“ جواب یہ تھا ”آپ کو دیکھ کر میں بہت خوش ہوں۔“ آخر کس لیے؟ اس نے کہا: یہ بات میں آپ کو تھانے پہنچ کر بتاؤں گا۔ ۔ ۔ اور پھر اس نے بتا دیا ”کل رات سے ان کے ساتھ ہمارا رابطہ تھا۔ انہیں اس حال میں آپ کو ہمارے حوالے کرنا تھا کہ میں آپ کو وہاں سے سیدھا ہسپتال لے جاتا۔ انہیں آپ کی کچھ ہڈیاں توڑنی تھیں.....“ یہ تھا منصوبہ! خطرہ مول لے کر اپنے چند ساتھیوں کو، عام لباس میں اس نے یونیورسٹی میں تعینات کیا تھا کہ ان سے مجھے بچانے کی کوشش کرے۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ تب اندازہ ہوا کہ کس تکلیف دہ امتحان سے میں بچ نکلا ہوں۔ پولیس والے نے سچ کہا تھا۔ دو برس بعد انہوں نے یونیورسٹی کے ایک استاد افتخار بلوچ کو مار مار کر ادھ

مواکر دیا۔ ہسپتال جا کر میں اس سے ملا تھا۔ قصور اس کا یہ تھا کہ اس ٹولے سے اختلاف کی اس نے جسارت کی۔

جیل میں گزرا وقت ایک یادگار تجربہ ہے۔ اس تجربے نے میرے یقین کو اور زیادہ پختہ کر دیا کہ قوم کے تمام مسائل کی جڑ قانون کی حکمرانی سے انکار ہے۔ پولیس والوں سے بات چیت کے بعد مجھے ایک اور تھانے پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے وہ مجھے لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں لے گئے۔ ادراک میں کچھ دیر لگی کہ دراصل ہوا کیا ہے۔ یہ اے کلاس تھی اور مجھے ایک الگ کمرہ دیا گیا؛ چنانچہ میں سو گیا۔ اگلی سحر مجھے صحن میں جانے کی اجازت بھی عطا ہوئی۔ جیل کا عملہ محبت سے پیش آیا اور بتاتا رہا کہ باہر کی دنیا میں کیا برپا ہے۔ انہی نے بتایا کہ میری گرفتاری کے اگلے دن پنجاب یونیورسٹی میں جمعیت کے خلاف ایک بے مثال احتجاجی مظاہرہ ہوا۔ تیس سال میں پہلی بار یونیورسٹی میں یہ لوگ پسپا ہوئے؛ اگرچہ بعد ازاں انہوں نے کچھ رسوخ پھر سے بڑھا لیا۔ اخبارات میں، میرے ساتھ کیے جانے والے سلوک پر اکثر کالم نگاروں نے شدید احتجاج کیا اور جمعیت سے ہمدردی رکھنے والوں نے بھی ڈٹ کر ان کی مذمت کی۔ ان تحریروں پر مبنی دو کتابیں بعد ازاں لاہور میں شائع ہوئیں۔ جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد بھی اپنے قلم سے، ان چھوکروں کی مذمت کرنے والوں میں شامل تھے۔ زمان پارک میں ایک چھوٹا سا انقلاب برپا ہو گیا۔ میری اسی برس کی خالہ نے تمام خواتین کو یکجا کیا کہ میری گرفتاری کے خلاف احتجاجی جلوس نکالیں۔ میرے قدامت پسند خاندان میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، پاکستان کی تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ہوں گی۔ پُرامن خواتین پر پولیس والے پل پڑے اور اٹھا اٹھا کر انہیں گاڑیوں میں پھینکا۔ وہ جیل میں ڈال دی گئیں اور نصف شب کے بعد ہی انہیں رہائی مل سکی۔ یہ تھی جنرل پرویز مشرف کی روشن خیال اعتدال پسندی۔

زنداں میں شام ہوتے ہی میرے کمرے کا دروازہ مقفل کر دیا گیا۔ دوسری رات تین بجے، جب میں گہری نیند سو رہا تھا، دروازہ کھٹاک سے کھلا۔ ایک پولیس افسر سامنے کھڑا تھا۔ نہایت بدتمیزی کے ساتھ اس نے کہا: ''اپنا سامان باندھ لو اور جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں مجھے سوار کر دیا گیا۔ تاریک رات کے آخری پہر، نو گھنٹے تک، میں لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھا رہا۔ ایک پتلا سا کمبل اور نومبر کی سحر میں بے چین کرتی یخ بستہ ہوائیں۔ تین پولیس والے سامنے بیٹھے تھے۔ صبح سویرے، چائے پینے کے لیے ہم رکے تو میں نے پوچھا کہ ہماری منزل کہاں ہے؟ ''ڈیرہ غازی خاں۔'' انہوں نے بتایا۔ اس طرح کی دور دراز جیلوں میں ان قیدیوں کو رکھا جاتا ہے، جن کی توہین اور ہمت شکنی مقصود ہو۔ خیال گزرا کہ شاید جاوید ہاشمی اور خواجہ سعد رفیق کی طرح مجھے بھی وہ جسمانی اذیت سے دوچار کریں۔ سب سے بڑھ کر یہ کمینہ پن تھا، جو مجھے اذیت دے رہا تھا۔ جب دوسرے لیڈر گھروں میں نظر بند تھے تو میرے لیے دور دراز کی ایک کال کوٹھری کیوں؟ تیس سال سے میں قوم کے سامنے تھا اور سب جانتے تھے کہ میں کبھی کسی جرم کا مرتکب نہ ہوا لیکن انہوں نے مجھے دہشت گردی کے جرم میں گرفتار کیا۔ سزا؟ عمر قید یا موت۔ یہ توہین سے دوچار کرنے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ کوٹ لکھپت والے تو ہمدرد اور مشفق تھے۔ ظاہر ہے کہ احکام اوپر سے آئے تھے۔

میں نے فقط آٹھ دن ہی زنداں میں گزارے لیکن وہ جو برسوں سے ان دیواروں کے پیچھے پڑے تھے؟ ان کے مقابل تو میں آزاد تھا، ایک شہزادے کی طرح آزاد۔ جیل گندی اور تنگ تھی۔ ایک ایک کمرے میں دس سے پندرہ قیدی ٹھنسے ہوئے۔ میرا کمرہ ہسپتال میں تھا۔ چھوٹا سا بستر اور گندہ غسل خانہ لیکن میرا کمرہ بہرحال الگ تھا۔ دن کے وقت مجھے صحن میں جانے کی اجازت دے دی جاتی؛ اگرچہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی سلاخوں کے پیچھے نظر بند کر دیا جاتا۔ بہت کم کھانا میں کھاتا، اس لیے کہ میں ورزش نہ کر سکتا تھا اور خوراک بہت ہی خراب تھی۔

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

عمر بھر ورزش کی عادت رہی کہ جسم حرکت کی آرزو کرتا ہے۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ کہ وقت کاٹے نہ کٹتا تھا۔ مجھے لگا کہ بوریت مجھے مار ڈالے گی۔ سحر، جب وہ مجھے جگانے آتے اور میں دوسرے کمروں سے قیدیوں کے نکلنے کی آوازیں سنتا۔ بستر سے اٹھنے میں، میں زیادہ سے زیادہ تاخیر کرتا کہ دن مختصر ہو۔ محسوس یہ ہوتا کہ بہت دیر بستر میں گزر گئی لیکن گھڑی پر نگاہ ڈالتا تو ابھی آٹھ ہی بجے ہوتے۔ پھر میں باہر نکلتا اور صحن میں بیٹھا رہتا۔ شام ڈھل رہی ہوتی، جب وہ میرے لیے ایک اخبار لے کر آتے۔ جب میں یہ گمان کر رہا ہوتا کہ بہت سا وقت گزر چکا ہوگا تو گھڑی یہ بتاتی کہ صرف دو گھنٹے ہی بیتے ہیں۔ وقت کی بساط پر سوئیوں کی رفتار ایسی مدہم تو کبھی نہ تھی۔ چار دیواری کا نہیں، میں کھلی ہواؤں کا آدمی ہوں۔ جب میں کمسن تھا، تب بھی۔ گرمیوں کی نامہربان دوپہر میں بھی میری والدہ کے لیے، مجھے گھر میں بند رکھنا مشکل ہوتا۔ 2005ء سے میں اسلام آباد کے باہر ایک پہاڑی پر بنے فارم ہاؤس میں رہتا ہوں۔ اسے میں اپنی جنت کہتا ہوں۔ چاروں طرف پہاڑ، بے پناہ سبزہ، سامنے راول جھیل اور دور کوہ ہمالیہ کی بلند چوٹیاں۔ اپنے گھر میں سبزیاں اور پھل میں خود اُگاتا ہوں۔ مرغیاں، گائے اور بھینس پال رکھی ہیں۔ جانوروں اور جنگلی پرندوں کے درمیان میں حیات کرتا ہوں۔ تیتر اور طوطے، گیدڑ اور مور، فاختائیں اور طرح طرح کی چڑیاں۔۔۔ اور اب میں اس چار دیواری کا قیدی تھا۔ جیل کے چھوٹے سے صحن میں، جہاں میرا دن گزرتا، ایک ذرا سی گھاس تو تھی لیکن شجر ایک بھی نہیں۔ میں سوچتا اور حیران ہوتا کہ کب تک یہاں پڑا رہوں گا، کب تک؟ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میں فارغ رہنا جانتا ہی نہیں۔ ایک بڑا ہسپتال چلاتا ہوں، میانوالی میں ایک یونیورسٹی اور سب سے بڑھ کر ایک سیاسی جماعت۔ میرے لیے تو چوبیس گھنٹے کا دن بھی کافی نہیں ہوتا۔ اور اب ایک لامتناہی فراغت تھی۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔

زنداں میں مگر میں ایک نئے تجربے سے گزرا۔ قیدیوں کی کہانیاں میں نے سنیں۔

خیبر پختونخوا سے تعلق رکھنے والے ایک قیدی کو میرا کمرہ صاف کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ پتہ چلا کہ چھ برس سے جیل میں پڑا ہے۔ سولہ برس کا کمسن تھا، جب گرفتار ہوا اور اب بائیس کا ہو چکا۔ وہ ایک خاندانی جھگڑے میں ملوث تھا، جب اس نے بندوق لہرائی تھی، بس یہی کچھ۔ مقدمہ اگر چلا ہوتا تو اسے سال بھر کی سزا دی جاتی۔ خاندان غریب تھا اور وکیل کی فیس چکا نہ سکتا تھا۔ سماعت کی تاریخ آتی اور گزر جاتی۔ اسے عدالت نہ لے جایا جاتا۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل سلیم اللہ خان کے مطابق، جو مجھے ملنے آئے، یہ کوئی استثنائی مقدمہ نہ تھا۔ انہوں نے کہا: ''پاکستانی جیلوں میں پڑے ساٹھ فیصد قیدی بے قصور ہیں۔ ان کا اصل جرم ان کی غربت ہے۔'' بعدازاں اخبارات میں، میں نے مقدمات کا مطالعہ شروع کیا۔ کراچی میں ایک قیدی کو نو سال بعد رہا کیا گیا جب وہ انتیس برس کا ہو چکا تھا۔ گرفتار ہوا تو گھر میں اس کی بیوی تھی اور ایک سالہ بچہ۔ اس اثنا میں ان پر کیا گزری ہوگی؟ سندھ کی ایک جیل میں تین اسیروں کو بائیس برس بعد معصوم قرار دے کر رہا کیا گیا۔ لاہور کی کوٹ لکھپت جیل میں پندرہ سال ایک قیدی اس لیے پڑا رہا کہ اس کی فائل گم ہو گئی تھی۔ جیل کی زندگی کا یہ پہلو، سب سے بڑھ کر میرے ذہن پہ سوار ہوا۔ بے چارے، خوف زدہ، بے یار و مددگار لوگ۔ ان میں سے بعض کے خلاف دائر مقدمے بالکل جھوٹے اور جعلی تھے۔ ملاقات کے لیے آنے والے رشتہ داروں سے جیل کے حکام رشوت وصول کرتے۔ جس کی جیب خالی ہو، اس سے وہ سلوک کیا جاتا، جو میرا کمرہ صاف کرنے والے قیدی سے۔ عدالت میں پیش ہی نہ کیا جاتا۔ ملک کے سب سے بڑے چور پارلیمنٹ میں براجمان تھے۔ ایسے بھی کہ ان پر حفاظت کرنے والی پولیس مقرر تھی، سرکاری خرچ پر گاڑیوں میں سوار! جیل کی یہ سفاکی میرے قلب و دماغ میں جم گئی۔ ناانصافی اور ظلم، ناگفتہ بہ حالت اور ہر غریب انصاف سے محروم۔

چھٹے دن میں نے بھوک ہڑتال کا فیصلہ کیا کہ مشرف حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ اب

میرا احساس یہ ہے کہ میں نے غلطی کی۔ اگر دوبارہ وہی امتحان درپیش ہوا تو ہرگز میں ایسا نہ کروں گا۔ کم از کم پانی تو پیتا ہی رہوں گا۔ روزے رکھنے کا میں عادی ہوں اور یہ کیسی شاندار عبادت ہے۔ یہی نہیں، صوم کی حالت میں، میں ڈٹ کر ورزش بھی کرتا ہوں لیکن مغربی افق پر سورج پھر ڈھل جاتا ہے اور آپ کھانے کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ میں نے ادراک نہ کیا کہ پانی ترک کر کے کس تیزی سے آدمی کمزور ہوتا ہے۔ دو ہی دن میں کمزوری اتنی ہو گئی کہ میں چل نہ سکتا تھا۔ بھوک ہڑتال کا اعلان کرنے کے بعد، واپسی کا اب کوئی راستہ نہ تھا۔ شام کے آٹھ بجے تھے، جب جیلر نمودار ہوا اور کہا ''آپ آزاد ہیں'' آہنی سلاخوں والے مہیب دروازے سے میں باہر نکل آیا...... قومی تاریخ کے سب سے بڑے طوفان میں داخل ہونے کے لیے!

باب اوّل

کیا مَیں جنّت میں کرکٹ کھیل سکوں گا؟

سمندر پار، میں ایک کرکٹر کی حیثیت سے جانا جاتا ہوں۔ اکیس برس کھیل کے میدانوں میں رہا؛ چنانچہ یہی میری شناخت ہے۔ مگر میں پاکستان میں ایک سیاستدان ہوں، ایک سیاسی جماعت کا سربراہ جو اشرافیہ سے برسرِ جنگ ہے۔ اشرافیہ جو چھ عشروں سے غریب عوام کا خون چوس رہی ہے اور تمام وسائل برباد کیے دیتی ہے، جو اللہ نے عطا کیے۔ کبھی پرویز مشرف ایسے فوجی ڈکٹیٹر پاکستان پر مسلط ہو جاتے ہیں، کبھی بھٹو اور شریف خانوادے۔ نتیجہ یہ کہ رفتہ رفتہ پاکستان اپنی اس منزل اور مقاصد سے دور ہوتا گیا جن پر اس وطن کی بنیاد ہے۔ اسلامی جمہوری ریاست کی بجائے، اب یہ مفاد پرستوں کی چراگاہ ہے۔ کوئی اگر ان کے مقابل اٹھے، کوئی اگر چیلنج کرے، خواہ وہ میری طرح معروف اور مقبول ہو، وہ گرفتارِ بلا ہوگا اسیری یا تشدد کا شکار۔

جب اس ملک کی بنیاد رکھی گئی تو یقین یہ تھا کہ اسلامی اقدار اور اصول معاشرے کے مختلف عناصر کو ہم آہنگ کر دیں گے، آج یہ ایک شکستہ ملک ہے۔ شمال مشرق میں کشمیر جو دو حصوں میں تقسیم ہے، خوں ریز تصادم کی بنیاد ہے۔ پختونخوا اور قبائلی علاقوں میں فوج اور

انتہا پسندوں میں رزم آرائی ایک طاعون بن گئی ہے، معدنی دولت سے مالا مال، بیشتر دشت و بیاباں پر مشتمل، محدود آبادی والے بلوچستان میں علیحدگی پسندوں کی سرگرمیاں، کراچی میں لسانی گروپوں کا تصادم، مہاجروں اور پشتونوں کی محاذ آرائی بڑھ گئی ہے۔ آدھی سے زیادہ آبادی پنجاب میں ہے۔ دوسرے صوبوں کو اس کی خوشحالی سے شکایت رہتی ہے۔ مزید یہ کہ سیاسی قوت بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

ہمارے مصائب کا آغاز 1947ء کے فوراً بعد ہو گیا جب ہم نے اپنے عظیم لیڈر محمد علی جناح کو کھو دیا۔ میں پاکستان بننے کے پانچ برس بعد پیدا ہوا۔ مجھے یاد ہے تب ہم اپنے وطن پہ کتنا فخر کرتے تھے، کیسے پُر امید اور کتنے پُر جوش ہوا کرتے۔ انگریزی استعمار کے ہاتھوں سے آزادی چھین کر مسلمانوں کے لیے ہم نے ایک نیا گھر تخلیق کیا تھا۔ اب مالدار ہندو اکثریت ہمیں لوٹ نہ سکتی تھی۔ استعمار کی مکاری اور توہین سے بھی ہم محفوظ تھے۔ ہم آزاد تھے۔ یہ گمشدہ اسلامی تمدن کی بازیافت کا وقت تھا، جس کی کبھی پورے ہند پر حکمرانی تھی۔ اب ہم اسلامی اصول نافذ کرنے کے لیے آزاد تھے۔ مساوات، سماجی اور اقتصادی انصاف کا خواب، جمہوریت، جیسا کہ قوم کے باپ قائداعظم نے کہا تھا، ملائیت نہیں، جمہوریت۔ ہمارے خواب تھے عالم اسلام کے لیے ہمیں ایک دمکتی ہوئی مثال بننا تھا۔ اس امر کی مثال کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں زندگی کس طرح چمکتی اور فروغ پاتی ہے۔ یہ تھے ہمارے خواب۔ بہت دیر میں ہمیں یہ احساس ہوا کہ خوابوں کی تعبیر کتنی مشکل ہوتی ہے۔ خواہ یہ ہم جیسی نئی قوم ہی کیوں نہ ہو، جس کے کندھے تاریخ کے بوجھ سے آزاد ہوں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ہم اپنے سپنوں سے دور ہوتے گئے۔ ان سپنوں سے، جو تخلیق پاکستان کی بنیاد تھے۔

پاکستان کی جڑیں متحدہ ہندوستان پر برطانوی راج کے آخری دنوں میں پیوست ہیں۔ تب پنجاب اور سرحد کے علاوہ بحیرۂ عرب کے نیلے پانیوں کے کنارے آباد سندھ اور بلوچستان

کو پاکستان نہ کہا جاتا تھا۔ یہ علاقے صدیوں تک کبھی ایک تو کبھی دوسری سلطنت کا حصہ رہے۔ انیسویں صدی کے آغاز سے اوّل ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر برطانوی فوج کے ذریعے اس پر حکومت کی گئی۔ 1880ء کے بعد سیاسی طور پر جنگِ آزادی کی ابتدا ہوئی، جب انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی۔ آغازِ کار مسلمان بھی اس میں شامل تھے۔ انگریز کبھی دستبردار نہ ہوتے اگر دوسری عالمگیر جنگ نے اقتصادی اور سیاسی طور پر انہیں کمزور نہ کر دیا ہوتا۔ یہ سلطنت جس پر کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا، شام کے دھندلکے میں ڈوبنے لگی۔

ہلا دینے والی احتجاجی تحریکوں کے بعد کانگریس نے برطانوی حکومت سے مذاکرات کا آغاز کیا۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ بھارت کو ایک ملک کے طور پر برقرار رکھیں۔ یہیں سے دو قوموں کی تاریخ مختلف اور متصادم ہو جاتی ہے۔ بھارتی قوم پرستی سے خوفزدہ، اس تشدد پہ فکرمند متفکر جس کا سامنا بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں مسلمانوں کو ہوا، آل انڈیا مسلم لیگ نے ایک چونکا دینے والا فیصلہ کیا۔ دو لیڈر اس جماعت میں اصل اہمیت کے حامل تھے، قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبالؔ۔

پاکستان بننے سے نو سال پہلے اقبالؔ وفات پا گئے، مگر اس فلسفی شاعر ہی کو پاکستان کی روحانی اور علمی بنیاد رکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ 1930ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ملک گیر اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا ''میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان باہم مدغم ہو کر ایک ریاست بن جائیں۔ برطانوی سلطنت کے تحت یا اس سے رہائی پا کر۔ بھارت کے شمال مغرب میں ایک نئی مسلم ریاست کی تشکیل مجھے مسلمانوں کی تقدیر لگتی ہے۔'' اقبالؔ کو یقین تھا کہ مسلمان اپنی تہذیب، قدار اور روایات پر مبنی ایک معاشرے کی تشکیل اور آزاد وطن کے حقدار ہیں۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مسلم برصغیر کو اب اپنی اجتماعی خودی بروئے کار لانا چاہیے۔

اقبالؔ نے فقط ایک آزاد وطن کا خواب ہی نہ دیکھا بلکہ ان کی ولولہ خیز شاعری نے ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری کی برقی لہر بھی دوڑادی۔ وہ صرف استعمار سے آزادی نہ چاہتے تھے بلکہ ملوکیت اور آمریت سے بھی۔ انسانی مساوات، حقوق، وقار، انصاف اور آزادی کے اس علمبردار نے افتادگانِ خاک کو پکارا کہ وہ اٹھ کھڑے ہوں اور شرفِ آدمیت کے لیے جدوجہد کریں۔

جوں جوں عمر گزرتی گئی، اقبالؔ میرے رہنما بنتے گئے۔ زیادہ سے زیادہ میں ان سے اکتسابِ فیض کرنے لگا۔ گویا ایک القائی اور الہامی آواز، وہ مغربی جمہوریت کی اندھی تقلید کے قائل نہ تھے۔ فرماتے کہ ہم اسلامی اصولوں کی پاس داری سے فطری انداز میں انصاف، رواداری، امن، مساوات اور یکجہتی کو پالیتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے بارے میں اقبالؔ کی تعبیر درحقیقت اس سے کہیں زیادہ بلند اور وسیع تناظر کی حامل ہے، جیسی کہ عام طور پر پیش کی جاتی ہے۔ اقبالؔ کی نگاہ میں اسلام محض چند عقائد اور عبادتوں کا مجموعہ نہیں۔ مسلم اور غیر مسلم کا فرق محض عقیدے کا نہیں بلکہ بنیادی طور پر زندگی کے بارے میں اندازِ فکر کا بھی ہے۔ خاندان اور نسل پر افتخار کو اقبالؔ مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کی رائے میں مساوات، یک جہتی اور آزادی پر مبنی اسلامی اصولوں کی حدود میں درجہ بندی، ذات پات، ملوکیت اور ایک بالاتر حکمران طبقے کی کوئی گنجائش نہیں۔ انسانوں میں فضیلت کا معیار تقویٰ ہے جیسا کہ اللہ کے آخری رسولؐ نے فرمایا تھا: ''انسانوں میں سے زیادہ باعزت لوگ وہ ہیں جو اللہ سے زیادہ ڈرتے ہیں۔'' جب آپ یہ اندازِ فکر اختیار کر لیتے ہیں تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے سامنے آپ جوابدہ ہیں؛ چنانچہ آپ محتاط اور مہذب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اقبالؔ نے کہا: آج کے مسلمانوں کا کلچر وہ نہیں، جو اسلام کا اصل ہے۔ اس کے عظیم اخلاقی اصول تو قرآن عظیم الشان سے ماخوذ تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ قرآن نے انسانوں کو وہ رہنمائی بخشی ہے کہ اگر وہ اس پر عمل

پیرا ہوں تو ان میں سے ہر ایک کی صلاحیت مکمل طور پر بروئے کار آجائے اور وہ اپنے اعلیٰ ترین امکانات کو چھو لے۔

اپنے خودی کے فلسفے میں تاریخ کے اس نادر فلسفی اور شاعر نے زندگی گزارنے کا وہ قرینہ اور انداز واضح کیا جو علمی اعتبار سے مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ افراد اور معاشرے جن پر عمل پیرا ہو کر روحانی اور علمی بلندیوں تک جا پہنچیں۔ سر سید احمد خاں (1817-98) کی طرح اقبالؔ نے بھی مغربی تعلیم حاصل کرنے پہ اصرار کیا۔ یہ کہا کہ جب تک مسلمان ہندو اکثریت والے بھارت میں اقلیت بن کر جئیں گے، مثالی معاشرہ قائم نہ کر سکیں گے۔

صرف یہ نہیں کہ ذات پات کے اپنے نظام اور سماجی عدم مساوات کی بنا پر بھارت اس نظامِ اخلاق کا حریف تھا جس پر ان کا اعتبار اور یقین تھا۔ یہ بھی کہ اسلام کے اخلاقی اصولوں کے مطابق ایک معاشرے کی تعمیر ممکن نہ ہوگی، اگر زمامِ کار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہو۔ عالمِ اسلام کی اکثریت غلامی میں مبتلا تھی اور اسلام کی روح کو بروئے کار لانے کے لیے ایک آزاد وطن درکار تھا۔ کم از کم ہندوستان کی حدود میں ایک ایسی ریاست، جہاں وہ اپنے خوابوں کی ردا بن سکیں۔

1938ء میں جب اقبالؔ اس دنیا سے اٹھے تو میرے والد ان کے جنازے میں شریک تھے۔ اب صرف محمد علی جناح زندہ تھے، نئے وطن کی تشکیل اور مسلم برصغیر کو رہنمائی فراہم کرنے کی ذمہ داری تنہا اب ان پر آپڑی تھی۔ راس کماری سے پشاور تک مسلم برصغیر میں اس دن کہرام برپا تھا۔ بہت ہی منفرد اور بہت ہی پرجوش شاعر مولانا ظفر علی خاں نے لکھا

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبالؔ کا مرنا
اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گزرنا

ممتاز مفکر سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مضمون میں رقم کیا کہ رہنمائی اب اس کے کلام سے طلب کی جائے گی۔ فلسفے اب اس سے نکالے جائیں گے۔ اقبال خواب دیکھنے والے تھے۔ ایک مثالیت پرست تھے۔ انہوں نے بتایا اور سکھایا کہ قرآن کریم کے مربوط فلسفے کی روشنی میں زندگی کیسے بسر کی جاسکتی ہے۔ جناح بھی مثالیت پرست ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عملی آدمی تھے۔ مجلسی آداب کے سخت پابند، بظاہر بے نیازی، تمکنت اور غرور کے دھوکے میں مبتلا کر دینے والی نازک طبعی مگر باطن میں ایک پرشوق انسان دوستی۔

کانگریس کی صدر بن جانے والی پہلی خاتون سروجنی نائیڈو نے ان کے بارے میں لکھا:

''وہ کسی حد تک روایت پرست ہیں اور ناقدانہ دقّت پسندی سے کام لیتے ہیں، کچھ کچھ تنہائی پسند اور اپنے رکھ رکھاؤ میں تحکمانہ وقار رکھنے والے، ظاہری تمکنت نے ان کے تصنع سے پاک اور انسانیت کی بھلائی کے لیے شدت کے ساتھ امنڈتے ہوئے احساسات پر پردہ ڈال رکھا ہے، ان کی قوت وجدان صریح الحرکت اور لطیف ہے، اپنی حس مزاح اور زندہ دلی سے لمحوں میں فتح کر لینے والی ان کی روشن قوت فکر اور برے، بھلے کے درست ادراک پر مبنی دانائی اپنے اندر ایسی پرشکوہ مثالیت پسندی سموئے ہے جو خودنمائی سے مبرا ہے۔''

جناح اوّل اوّل کانگریس کے ممبر تھے۔ انہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جاتا۔ وہ متحدہ بھارت کے قائل تھے۔ ترکی میں خلافت کا خاتمہ ہونے کے بعد انہوں نے گاندھی سے اختلاف کیا اور اپنا راستہ الگ کرلیا۔ گاندھی پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اٹھنے والی تحریکِ خلافت کے حامی تھے۔ جناح نے اس کی مخالفت کی۔ وہ جواہر لعل نہرو کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ ان کے بارے میں محمد علی کا خیال یہ تھا کہ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ قریبی مراسم کو وہ مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ماؤنٹ بیٹن محمد علی جناح کی تاب نہ لاسکتے خاص کر جب وہ دستوری اور آئینی نزاکتوں کا حوالہ دیتے، مطالبہ کرتے کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ صرف

جداگانہ انتخاب سے ممکن ہے۔ ماؤنٹ بیٹن (Mountbatten) کی اہلیہ ایڈوینا (Edwina) نہرو کے بہت قریب تھیں۔ بعض لوگوں کی رائے میں نہرو سے ان کا معاشقہ رہا اور یہ تعلق ہندوؤں کے حق میں استعمال ہوا۔

محمد علی جناح، جواہر لعل نہرو، موہن داس کرم چند گاندھی اور کانگریس کے مسلمان لیڈر مولانا ابوالکلام آزاد تحریک آزادی کے سرخیل تھے۔ ابوالکلام بعد میں ہندوستان کے وزیر تعلیم بنے۔ آزادی کے بارے میں ان سب لوگوں کے تصورات مختلف تھے، مگر بعض پہلوؤں پر اتفاق رائے تھا۔ انتہا یہ ہے کہ بعض امور پر گاندھی اور قائداعظم کے خیالات بھی ایک جیسے تھے۔ دونوں یہ سمجھتے تھے ان کے ملکوں کو سیکولر نہ ہونا چاہیے۔ مذہب ان میں بہت اہم کردار رکھتا ہے۔ گاندھی نے کہا تھا ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سیاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں وہ مذہب کو سمجھتے ہی نہیں۔'' گاندھی کی رائے میں مذہب کے بغیر سیاست اخلاقی بنیادوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ 1948ء میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا ''معاشی مساوات اور سماجی عدل کے اسلامی تصورات پر مبنی ایک نیا معاشی نظام ہمیں پیش کرنا چاہیے، صرف اسی طرح بطورِ مسلمان ہمارے لیے اپنا مشن پورا کرنا ممکن ہوگا۔'' قائداعظم اور گاندھی دونوں یہ سمجھتے تھے کہ مذہب ایثار اور خیرخواہی کی جو روحانی تعلیم دیتا ہے، مادیت کا سدباب اسی سے ممکن ہے۔

تحریکِ خلافت کے بعد ہندو مسلم اتحاد ختم ہوگیا۔ 1920ء کے عشرے سے کانگریس کے اندر برپا سیاسی جنگیں مسلمان جماعتوں سے ناروا مطالبات پر منتج ہوئیں۔ اس کے لیے ہندو انتہا پسند ذمے دار ٹھہرائے گئے کہ ہندو مسلم مفاہمت کو انہوں نے تباہ کر ڈالا۔ پروفیسر فرانسس رابنسن کے بقول: پھر قائداعظم اس بات کے قائل ہو گئے کہ مسلمان اب متحدہ بھارت میں محفوظ نہ رہیں گے۔''

23 مارچ 1940ء کو مینار پاکستان پر مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں انہوں نے بھارت کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کر دیا، ایک مسلمانوں اور دوسرا ہندوؤں کا ملک۔ اپنے خطاب میں انہوں نے کہا ”ہمارے ہندو دوست یہ بات کیوں نہیں سمجھتے کہ اسلام اور ہندومت کی روح مختلف ہے۔ الفاظ کے لغوی معنی میں ہندومت اور اسلام صرف مذہب نہیں بلکہ دو الگ طرزِ حیات، دو منفرد اور مختلف سماجی نظام ہیں۔ یہ محض ایک خواب ہے کہ مسلمان اور ہندو کبھی ایک قوم بن پائیں گے۔“ انہوں نے مزید کہا ”ہندو اور مسلمان دو مختلف مذہبی فلسفوں، رواجوں اور ادبی ورثوں کے حامل ہیں۔ وہ باہم شادیاں نہیں کرتے، کھانا تک ساتھ نہیں کھاتے۔ ان کا تعلق دو مختلف تہذیبوں کے ساتھ ہے، جو متصادم نظریات اور تصورات پر مبنی ہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کا عقیدہ ہی مختلف ہے۔ مسلمان اور ہندو تاریخ کے دو مختلف دھاروں سے تحریک پاتے ہیں۔ ان کی رزمیہ داستانیں مختلف ہیں، ہیرو مختلف ہیں اور تاریخ کی تفہیم کا زاویہ نظر بھی مختلف۔ ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہے اور ایک کی فتح دوسرے کی شکست۔ دو ایسی قوموں کو، جن میں سے ایک اکثریت اور دوسری اقلیت میں ہے، یکجا کرنے کی کوشش تباہی لائے گی۔ بے چینی ان کے درمیان فروغ پاتی رہے گی اور ایسی ریاست کام ہی کر نہ سکے گی۔“

مارچ 1940ء کے اس فیصلے کو قرارداد پاکستان کہا جاتا ہے، جس میں متحدہ بھارت کا نظریہ کو مسترد کر دیا گیا۔ دونوں قوموں میں کشیدگی بڑھ گئی تھی۔ اسی قرارداد میں یہ مطالبہ سامنے آیا کہ ملک کے شمال مغربی اور ان مشرقی علاقوں پر مشتمل، مسلمانوں کی جن میں اکثریت ہے، مکمل طور پر خود مختار ریاستیں بنا دی جائیں۔ سات برس بعد ”پاکستان“ وجود میں آگیا۔ ہر چند قائداعظم نے شکایت کی کہ یہ کرم خوردہ ملک ہے۔ اس لیے کہ کچھ حصے جو پاکستان میں شامل ہونا چاہئیں تھے، نوچ کر الگ کر دیے گئے۔ نئے وطن کے دو حصے تھے، مغربی اور مشرقی پاکستان۔ بیچ میں ایک ہزار کلومیٹر پر پھیلا ہوا بھارت۔ پنجاب اور بنگال کے وسیع و عریض

صوبے تقسیم کر دیے گئے۔ کم از کم دس لاکھ مسلمان، ہندو اور سکھ قتل ہوئے۔ مسلمانوں نے پاکستان کی طرف ہجرت کی جبکہ سکھ اور ہندو بھارت چلے گئے۔ پاکستانی فوج میں شامل میرے ایک چچا پنجاب کی سرحد پر تعینات تھے۔ ہمیشہ وہ کہا کرتے: چھ ہفتوں میں ایسی خونریزی میں نے دیکھی جو دوسری عالمگیر جنگ میں جاپانیوں کے ساتھ جنگ سے بدتر تھی۔ اس خوں آشامی کے ذکر سے انہیں کراہت ہوتی جس میں عورتوں اور بچوں کو بھی معاف نہ کیا گیا۔ ایک کروڑ بیس لاکھ افراد بے گھر ہوئے۔ انہیں طویل فاصلوں تک پیدل چل کر جانا پڑا۔ مہاجر کیمپوں اور دور دراز کی سرزمینوں میں وہ بکھر گئے خاندان اور بستیاں اجڑ گئیں۔ یتیموں اور بیواؤں کی بہت بڑی تعداد جو قتلِ عام سے بچ رہی بچا کھچا سامان اٹھائے مسافتوں میں مصروف رہی جو ان کے لیے اجنبی تھیں جہاں بعض اوقات وہ نامطلوب تھے۔ امریکی فوٹوگرافر مارگریٹ بروک وائٹ (Margaret Bourke-White) نے جو پہلی جنگی خاتون وقائع نگار بھی تھیں، اس تقسیم کو ”انسانی تباہی کا عظیم ترین انسانی المیہ“ لکھا۔

جو قصے اور داستانیں میں نے سنیں، وہ دل ہلا دینے والی ہیں۔ ایک سولہ سالہ پاکستانی لڑکا فوج میں بھرتی ہو کر سرحد پر متعین ہوا۔ وہ کہتا ہے ”سبھی نے ظلم کیا۔ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں نے۔ میں نے لاشوں سے لدی گاڑیاں دیکھیں۔ عورتیں جن کی عصمت دری کی گئی اور بچے جو سکتے میں تھے۔ مجھے یاد ہے اس وقت میں یہ سوچتا تھا: کیا یہ ہے وہ آزادی جس کا خواب ہم نے دیکھا تھا۔ شملہ میں میرے تین چچا تھے۔ اس طوفانِ بلاخیز میں ان کے ساتھ رابطہ نہ ہو سکا۔ بعد میں ان کا کچھ پتہ نہ چلا۔“ خون خرابے میں ایسے بہت سے واقعات بھی ہوئے جب ہندوؤں نے اپنے حملہ آور بھائیوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کے لیے انہیں چھپا دیا۔ ایسے بہت سے مسلمان بھی تھے مثلاً جھنگ میں ایک قریشی صاحب ہوتے تھے جنہوں نے کئی ہندو خاندانوں کی جان بچائی اور سرحد پار پہنچنے میں ان کی مدد کی۔ کچھ مسلمانوں نے ”کافر“ قرار دے کر انہیں مار ڈالا۔

اس پاگل پن کو کیا کہیے، پاگل پن کے سوا اور کیا؟ کسی کو اندازہ نہ تھا، کسی کے وہم وگمان تک میں نہ تھا کہ ایسا بھی ہوگا۔ یہ تو کوئی سوچ ہی نہ سکتا تھا کہ تشدد ایسی انتہائیں بھی دیکھے گا۔ کیا یہ برطانوی راج کے خاتمے کا نتیجہ تھا یا صدیوں سے جاری توہین کی گھٹن بے قابو ہو کر جنون بن گئی؟ انگریزوں کو یہی سازگار تھا کہ ہندو اور مسلمان باہم متصادم رہیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیشہ انہوں نے بھرپور کوشش کی۔ 1861ء میں ہندوستان میں تعینات برطانوی وائسرائے ارل آف ایلگن (Earl of Elgin) کو مقامی انگریز حکام نے بتایا تھا: ''ہندوستان میں اپنا اقتدار ہم نے ایک قوم کو دوسری سے بھڑا کر برقرار رکھا ہے۔ یہی طرزِ عمل ہم لوگوں کو جاری رکھنا چاہیے۔'' جس غیر ضروری اور نازیبا عجلت کے ساتھ تقسیم کا منصوبہ نافذ ہوا، اشتعال پیدا کرنے میں اس کا عمل دخل تھا اور اسی سے طوفان اٹھا۔ ظاہر ہے کہ نظام الاوقات انگریزوں نے طے کیا تھا۔

قائداعظم نے تخلیقِ پاکستان کا یہ کارنامہ کس طرح انجام دیا؟ حالانکہ غیر معمولی غلبے کی حامل آل انڈیا کانگریس جہاں تک ممکن تھا ڈٹ کر مخالفت کرتی رہی۔ ناممکن کو انہوں نے ممکن کیسے کر دیا؟ اگرچہ آغاز میں دشواریاں بے حد تھیں مگر وہ انقلابی جذبہ، جس سے پاکستان نے جنم لیا، ہمیں آگے بڑھاتا رہا۔

پاکستان میں جمہوریت پروان نہ چڑھ سکی کہ قائداعظم 1948ء میں انتقال کر گئے۔ ملک اپنے محور سے محروم ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا دو عالمی طاقتوں امریکہ اور سوویت یونین کے حلقہ ہائے اثر میں بٹی ہوئی تھی۔ پاکستان امریکہ کے ساتھ جا کھڑا ہوا مگر اس سے مشکلات پیدا ہوئیں۔ ہمارے پہلے وزیراعظم 1951ء میں شہید کر دیے گئے۔ اسی لیاقت باغ میں جہاں 56 برس بعد بے نظیر بھٹو کو قتل کیا گیا۔ لیاقت علی خان کو ایک افغان نے قتل کیا جو کشمیر میں جنگ بندی کے خلاف تھا۔ قاتل کا خیال تھا کہ پاکستان کو جنگ جاری رکھنی چاہیے۔ بہت سے لوگوں کی رائے میں اس اقدام کے پیچھے سازشیں کارفرما تھیں۔ مثلاً یہ امریکی مطالبہ کہ پاکستان

امریکہ کو سوویت یونین کی فضائی حدود تک رسائی دے۔ اس دن سے لے کر آج تک پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کبھی موزوں خطوط پر استوار نہ ہوئے۔ نائن الیون اور نومبر 2011ء میں پاکستان کی ایک سرحدی چوکی پر حملے کے بعد ان مراسم نے اور بھی تباہ کن شکل اختیار کر لی لیکن اس موضوع پر میں بعد میں بات کروں گا۔

بھارت کے اولین ماہ و سال استحکام کے تھے۔ 1947ء سے 1964ء تک نہرو 17 برس تک وزیراعظم رہے۔ ہمارے ہاں کبھی سیاستدانوں کی حکومت رہی تو کبھی فوج کی؛ چنانچہ سیاسی ادارے بلوغت نہ پا سکے۔ دوسرے سنگین مسائل اس کے سوا تھے۔ عوام اور اشرافیہ میں گہری خلیج حائل تھی۔ پاکستان کا نظریہ ظاہر ہے کہ غیر منقسم بھارت میں پیدا ہوا اور نظریاتی طور پر اس نے اتر پردیش میں پرورش پائی۔ وہ پاکستان کا حصہ نہ بن سکتا تھا حالانکہ تحریکِ پاکستان کا مرکز وہی تھا۔ بعد میں لسانی اور علاقائی تحریکیں اٹھیں۔ مشرقی پاکستان سے بنگالیوں، ایران سے جا ملنے والے صحرا سے ادھر آباد بلوچوں اور افغانستان کے پڑوسی پشتونوں کو مرکز سے جائز شکایات رہیں۔ شاید اس لیے بھی کہ فوج میں پنجابیوں کی اکثریت تھی۔ مذکورہ لسانی گروہ یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کے اقتصادی اور جمہوری حقوق مجروح ہوئے ہیں۔ مختلف مواقع پر بعض نے ہتھیار بھی اٹھائے۔

مسئلہ یہ بھی تھا کہ ایک ملک کی حیثیت سے ہماری زندگیوں کی ابتدا جنگ سے ہوئی۔ 1947ء میں ہی کشمیر کے تنازع پر بھارت سے لڑائی کا آغاز ہوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فوج کو اس کے تناسب اور حق سے زیادہ اختیار مل گیا؛ چنانچہ پنجاب کو بھی۔ مگر ایک پہلو اور بھی ہے۔ ابتدائی برسوں کی امید اور جوش و خروش سے کام لے کر ہم ان مشکلات پر قابو پا سکتے تھے۔ اسلام کے مساوات جمہوریت جیسے اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر جو پاکستان کی وجہِ تخلیق تھے، ہم ایک جمہوری فلاحی ریاست تشکیل دے سکتے تھے۔

کم از کم پاکستان کی حد تک انگریز کی تربیت یافتہ افسر شاہی کو جمہوریت گوارا نہ تھی۔ اپنی قوم کو وہ اس کا مستحق نہ سمجھتے تھے۔ ایسے ماحول میں وہ پروان چڑھے تھے کہ عام آدمی کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اپنے پرانے آقاؤں کی وہ تقلید کرتے۔ وراثت میں یہ رجحان انہوں نے پایا تھا کہ عام آدمی پر بھروسا نہ کیا جائے۔ علامہ اقبالؔ کے وژن اور قائداعظم کے تدبر سے محروم ہو کر ہم غلامی سے ملتے جلتے ماحول میں واپس چلے گئے۔ قائداعظم تو کیا، یہاں کوئی نہرو بھی نہ تھا کہ استحکام کے دو عشرے مل پاتے۔ پہلا موقع پاتے ہی سول ملٹری افسر شاہی نے جمہوریت کو ٹھوکر ماردی۔ 1956ء تک دستور نہ بن سکا۔ اس لیے کہ مغربی پاکستان کی طاقتور اشرافیہ، اقتدار میں بنگالیوں کو برابر کا حصہ دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ بنگال کی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ تھی، لہٰذا ون یونٹ کا تصور تراشا گیا۔ پورے مغربی پاکستان کو ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں اسی سے مایوسی بڑھی اور آخرکار ملک ٹوٹنے کا المیہ رونما ہوا۔

1958ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے 1956ء کا دستور منسوخ کر کے اقتدار پر قبضہ کیا اور صدارتی نظام نافذ کر دیا۔ دس سال وہ اقتدار میں رہے۔ بالآخر ایک بھرپور عوامی تحریک نے انہیں چلتا کیا، جس کے آخر آخر گلیوں اور بازاروں میں "ایوب کتا، ہائے ہائے" کے نعرے گونجتے تھے۔ افسوس کہ اس کی جگہ یحییٰ خاں نام کے ایک اور جنرل نے لے لی۔ ایوب خانی عہد میں اقتصادی طور پر پاکستان نے ترقی کے مراحل طے کئے اور بدلتا گیا۔ عائلی زندگی سے متعلق بعض قوانین میں انہوں نے ترامیم کیں اور معاشرے کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی کچھ نہ کچھ کوشش۔ مگر زراعت اور صنعت میں ان کے عہد کی ترقی سے تھوڑے ہی لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ اکثریت محروم رہی۔ مزید براں جمہوریت میں وہ یقین نہ رکھتے تھے؛ چنانچہ سیاسی اعتبار سے ملک جمود کا شکار ہو گیا۔ مشرقی پاکستان میں بے چینی بڑھتی گئی اس لیے کہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے بنگالی محروم رکھے گئے۔ حکمران اشرافیہ میں ان کی نمائندگی کم تھی۔ 1971ء

کا المیہ طویل فوجی اقتدار کا ثمر تھا۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان کے حکمران طبقات کی طرف سے بنگالیوں کو کمتر سمجھا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ معاشی اعتبار سے یہ پاکستان کی تاریخ کا سنہری دور تھا۔ اس دور میں ہماری شرح ترقی سب سے زیادہ رہی اگرچہ اکثریت خوشحالی سے محروم ہی رہی۔ نظم ونسق کا حال بہتر تھا۔ انگریز اپنے پیچھے باصلاحیت افسر شاہی چھوڑ گئے تھے۔ میں نے اپنے بچپن میں دیکھا اور والدین سے بعدازاں سنتا رہا کہ تخلیق پاکستان میں جو جذبہ بروئے کار آیا تھا، کسی نہ کسی حد تک ان برسوں میں برقرار رہا۔ فوجی اقتدار کے ابتدائی برسوں میں بھی۔ شاید ہمارے اس احساس کا سبب یہ بھی ہو کہ ہم پنجاب کے قلب میں تھے۔ ملک کے دوسرے اور دور دراز علاقوں کے اندر، دلوں اور دماغوں میں جو لہریں اٹھ رہی تھیں، شاید ہم ان سے بے خبر تھے۔

جب میں پیدا ہوا، پاکستان پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ لاہور میں اپنے خوشحال خاندان کے ساتھ آسودہ زندگی جیتے ہوئے ملک کا مستقبل مجھے روشن لگتا۔ یہ ایک خوابناک بچپن تھا۔ کھیل کود کی آزادی اور وہ تحفظ جو ایک پھیلے ہوئے تگڑے خاندان میں ہوتا ہے۔ زمان پارک کے اردگرد جہاں میں پلا بڑھا، ہرے بھرے کھیت تھے اور آبِ رواں۔ ہریالی، تازہ ہوا اور کھلے میدان۔ چند ایک ہی مکان تھے اور سب ایک خاندان کی طرح، لہٰذا یہ ایک فارم ہاؤس میں رہنے کے مترادف تھا۔ زمان پارک میں سب سے پہلا مکان میرے نانا کے بھائی نے بنایا تھا جن کا نام احمد زمان تھا۔ 1947ء میں ہجرت کے بعد میرے نانا کا خاندان بھی یہیں آن بسا۔ میں گرما کی تپتی دوپہروں اور شاموں میں چھرے والی بندوق لے کر کبوتروں کے شکار پر جاتا یا نہر میں نہایا کرتا۔ شام کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا۔ میں تاریکی پھیلنے تک گھر سے باہر گھومتا رہتا۔ تاہم میری والدہ کو کبھی پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ انہیں معلوم تھا کہ رشتے کے بھائی میرے ساتھ ہیں۔ دودھ کے لیے ہر گھر میں ایک گائے یا بھینس پالی جاتی۔

آج زمان پارک لاہور کے وسط میں واقع ہے۔ شہر چاروں طرف پھیل گیا ہے۔ ہرے بھرے شاداب کھیتوں میں سے جہاں گیہوں اور دھان کی بالیوں پر ہوائیں کبھی سہانے گیت گایا کرتیں، صرف ایک چھوٹا سا پارک بچ رہا ہے۔ تب آسمان پر چمکتے ستارے بہت ہی قریب نظر آتے تھے۔ اب صحن میں کھڑے ہو کر بات کریں تو آواز بلند کرنا پڑتی ہے۔ گھر اتنے بہت سے ہو گئے کہ لوگ ایک دوسرے کو پہچانتے ہی نہیں۔ اب بھی لڑکے بالے نہر میں نہاتے ہیں مگر اس کا پانی آلودہ بلکہ گندہ ہے۔ برسات کی بارش کے بعد مٹی اب بھی مہک اٹھتی ہے، لیکن پھر ہوا میں ڈیزل اور پٹرول کا دھواں گھل جاتا ہے اور ہم رنج کے ساتھ ان زمانوں کو یاد کرتے ہیں جب فضا کی پاکیزگی بجائے خود ایک داستان تھی۔ تب لاہور کا پانی کتنا میٹھا تھا، اب پینے سے پہلے ابالنا پڑتا ہے۔ میں لاہور سے دس میل دور ایک دوست کے کھیتوں پر سیر کرنے جایا کرتا۔ وہاں میں نے چودہ سال کی عمر میں پہلی بار چودہ تیتر شکار کیے۔ میں نے کیسی بھرپور زندگی بسر کی ہے، لیکن ویسا سنسنی خیز اور شاندار لمحہ پھر کبھی نہ آیا۔ وہ کھیت معدوم ہو گئے اور اب یہ علاقہ سیمنٹ اور سریے کا جنگل ہے۔ اب ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں ایک فائر سے چودہ تیتر زمین پر گریں۔ جنگل کٹے، پرندے ہجرت کر گئے، ہوائیں زہر آلود ہوئیں اور پانی بھی۔ زندگی گزارنے کا یہ کون سا طریقہ ہے جو ترقی اپنے ساتھ لائی ہے......؟

میری والدہ ہر شام ہم بچوں کو میری نانی اماں کے پاس بھیجا کرتیں۔ یہ سب سے زیادہ سہانا وقت ہوتا۔ ہماری زندگیوں میں رونما ہونے والی ہر چیز کا انہیں علم ہوتا۔ ہم بچوں کے ہر معاملے میں وہ شریک تھیں اور ہم ہر وہ بات بھی ان سے کہہ دیتے جس کا اظہار اپنے والدین کے سامنے کر نہ سکتے تھے۔ سو سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ تب بھی وہ ذہنی طور پر پوری طرح بیدار اور متحرک تھیں۔ ان کی زندگی میں وہ ساری رونق شاید اس بے پناہ محبت اور بے حد وحساب انس والفت کی وجہ سے تھی جو ان کے بچوں، نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں سے انہیں حاصل

ہوتی۔ شفقت کا ایک دریا جو ہمہ وقت بہا کرتا۔ شاید وہ اور جی لیتیں لیکن 1985ء میں میری والدہ کا انتقال ہوا تو صدمے کی شدت نے انہیں آلیا، وہ ان کی سب سے چھوٹی اور پیاری بیٹی تھیں۔ ہمیں ایسا لگا کہ اب انہوں نے اس دنیا کو تج دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ اپنے بستر پر لیٹی رہتیں اور اٹھنے سے انکار کر دیتیں۔ تین ماہ گزرے تھے کہ وہ بھی اپنی لاڈلی بیٹی اور میری محبوب ماں کے پاس چلی گئیں۔

ہمارے وطن میں خاندان معاشرے کی کلید ہے۔ اسلام خاندانی نظام کو بے حد اہمیت دیتا ہے۔ ماں کے کردار کو ایک تقدیس بخش کر اللہ نے خاندان کو بڑی قوت عطا کر دی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں ''جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔'' یہ بھی ارشاد کیا تھا کہ اولاد کے حق میں باپ کی دعا سب سے زیادہ قبول کی جاتی ہے۔ یہ بھی کہ جو بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کا لحاظ نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ میری زندگی پر سب سے زیادہ اثر میری ماں کا ہے۔ ہم پانچ بہن بھائی تھے اور میں ان کا اکلوتا فرزند۔ وہ ایک مکمل ماں تھیں، ہر چیز اپنے خاندان پر قربان کر دینے والی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں اپنے زخم ان سے چھپایا کرتا تا کہ انہیں صدمہ نہ پہنچے۔ میں آٹھ برس کا تھا، میں اور میرے رشتے کے بھائی ایک شہتوت کے باغ میں تھے۔ باغبان اچانک آ پہنچا۔ درخت سے چھلانگ لگانے کی کوشش میں، میں ایک سے دوسری شاخ پہ جا گرا۔ تیز دھار ٹہنی سے میری ران کافی گہرائی تک کٹ گئی، خون کی بڑی شریان بمشکل کٹنے سے محفوظ رہی تھی۔

گھر پہنچا تو یہ گھاؤ میں نے ماں سے چھپا لیا۔ میں چاہتا تھا کہ انہیں دکھ نہ پہنچے۔ ایسی الفت تھی ہم ماں بیٹے کے درمیان۔ میں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہتا جس سے وہ ناراض ہوں۔ محبت اس طرح زندگی کو نظم میں ڈھالتی ہے۔ وہ اس تاک میں رہتیں کہ کسی نہ کسی طرح میں سکول کا کام دن کے وقت ہی نمٹا دوں۔ مگر مجھے کھیل کا ایسا چسکا تھا کہ پڑھائی میں جی ذرا نہ

لگتا۔ اگر پڑھ پایا تو ان کی مہربانی اور نگرانی سے۔ ایک بات اور بھی ہے کہ پڑھائی کے سوا کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر میری ماں مجھے مجبور کرتی ہوں۔ اگر میں کسی چیز سے گریز کرتا تو وہ کبھی سختی سے کام نہ لیتیں۔

جیسا کہ زمان پارک کے نام ہی سے ظاہر ہے، اس آبادی کے وسط میں ایک چمن ہے۔ ہم سب لوگ وہاں کرکٹ اور ہاکی کھیلا کرتے۔ چھوٹے بچوں سے لے کر بیس پچیس سال کی عمر کے سب رشتہ دار اور دوست ایک ساتھ۔ ایسے جارحانہ جوش و جذبے کے ساتھ کہ ایک بار تو ایک مہمان ٹیم نے میچ سے انکار ہی کر دیا۔ کرکٹ اور تیتر کے شکار سے میری محبت، رشتے کے بھائیوں اور چچاؤں کی وجہ سے پروان چڑھی۔ میری ماں کے خاندان والے کرکٹ کے جنونی تھے۔ 9 سال کی عمر میں، میں نے ٹیسٹ کرکٹر بننے کا ارادہ کر لیا۔ یہ اس دن ہوا جب میں نے اپنے خالہ زاد جاوید برکی کو اس میدان میں انگلینڈ کے خلاف سنچری بناتے دیکھا جو اب قذافی سٹیڈیم کہلاتا ہے۔

اپنی خالاؤں اور ماموؤں کے گھروں کو میں اپنا ہی گھر سمجھتا۔ سب خاندانوں کا مرکز میرے نانا کا مکان تھا۔ رات کے کھانے پر گاہے سب کے سب اکٹھے ہوتے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں سے لے کر بزرگوں تک۔ آداب طے شدہ تھے۔ بزرگی کا احترام بہر کیف ملحوظ خاطر رکھا جاتا۔ کوئی بڑا بات کر رہا ہوتا تو کمسن اسے پوری توجہ سے سنا کرتے۔ اس کا صلہ یہ کہ عمر میں کوئی جتنا بڑا تھا، بچوں کی اتنی ہی زیادہ ذمہ داری قبول کرتا، پوری طرح ان کا خیال رکھتا۔ اس طرح فقط والدین ہی نہیں بلکہ درجہ بدرجہ خاندان کے سب بالغ افراد ڈسپلن قائم کرنے میں شریک تھے۔ ناتراشیدگی، تکبر کا اظہار، خاص طور پر جب کوئی ذمہ دار اس کا مرتکب ہو، ناپسندیدگی کا باعث بنتا۔ بدقسمتی سے مغرب زدہ گھرانوں میں بزرگوں کا احترام مٹتا جا رہا ہے۔ ان میں سے جو لوگ مغرب کی تقلید میں بالکل ہی اندھے ہیں، وہ بڑوں کی توہین یا انہیں نظر انداز کرنے کو

ترقی اور جدت کی علامت سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب لندن میں ایک استاد نے مجھ سے فرمائش کی کہ گفتگو کے ہنگام میں ان کا نام لیا کروں تو میں نے کتنا عجیب محسوس کیا۔ اس وقت اور بھی برا لگتا جب دوستوں کے والدین یہ بات کہتے کہ میں انہیں ان کے پہلے نام سے پکاروں۔

ہماری اخلاقی اقدار بھی اپنے خاندان کے بزرگوں کی تقلید میں پروان چڑھیں۔ بچے اس بات کا خیال رکھتے کہ کون سا رویہ انہیں پسند ہے اور کون سا طرز عمل ناپسند۔ سزا کا خوف نہیں بلکہ ناپسندیدگی کا اندیشہ ہمیں روکتا۔ اخلاق کا معیار اس لیے بلند تھا کہ اگر کوئی ایسا کرے گا تو شاید اسے ادنیٰ اور حقیر سمجھا جائے۔ سب سے بڑا اندیشہ، خاندان کی بدنامی کا۔ شادی سے لے کر مجلسی زندگی میں قبولیت تک، ہر چیز کا انحصار اسی پر تھا۔ کسی بھی جاننے والے کی طرف سے، کسی نوجوان کی حرکت پر کسی سنجیدہ اعتراض کا مطلب یہ تھا کہ پورے کا پورا خاندان ''ملزم'' کو مسترد کر سکتا ہے۔ کامیاب کھلاڑی بننے کے بعد بھی، اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے میں بہت ہی محتاط انداز اختیار کیے رکھتا۔ یہ فکر دامن گیر رہتی کہ خاندان والے کیا سوچیں گے۔

اکثر مسلمان بچوں کی طرح مذہب میری زندگی کا کبھی نہ جدا ہونے والا حصہ تھا۔ رات کو میری والدہ ہر روز کوئی کہانی سنایا کرتیں، ہر کہانی میں ایک اخلاقی سبق۔ حضرت موسیٰؑ اور فرعون، سیدنا یوسفؑ اور برادرانِ یوسف کی فریب کاری......اور ظاہر ہے کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ بھی اللہ کے نبی تھے مگر یہ سرورِ عالمؐ تھے، دین ابراہیمی کی جنہوں نے تکمیل کر دی۔ وہ خاتم النبیین تھے، اللہ کے آخری پیغمبر ﷺ۔ تورات اور انجیل بھی اللہ کی نازل کردہ کتب ہیں لیکن پھر وہ لوگ راہِ راست سے بھٹکے اور الہام میں تحریف کی۔ ہم ان پر اترنے والی الہامی کتابوں کے سبب ہی انہیں اہل کتاب کہتے ہیں۔

ہر شب والدہ ہمیں دعا مانگنے کی یاد دہانی کراتیں۔ وہ ایک واقعہ کثرت کے ساتھ اور بہت ذوق وشوق سے سنایا کرتیں۔ مکہ میں ایک بوڑھا آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہا: اب میں قبیلے کا آخری آدمی رہ گیا جس نے اسلام قبول نہیں کیا۔ ایمان لانا چاہتا ہوں مگر اس بڑھاپے میں کیونکر اپنی عادات بدل پاؤں گا۔ کوئی ایک بات بتا دیجئے، کہ جس پر عمل سے نجات ہو جائے۔ فرمایا: سچ بولا کرو، ہمیشہ سچ۔ تمہارے مسلمان رہنے کو اتنی سی بات کافی ہو گی۔ ایک بچے کی حیثیت سے عبادات کے ساتھ کوئی شغف میرے اندر نہ تھا مگر یہ نصیحت مجھے بہت ہی اچھی لگی، دل کو بھا گئی۔ ماں سے تو میں یوں بھی جھوٹ نہ بولا کرتا۔ اگر کبھی کوشش کی تو فوراً ہی انہیں پتہ چل جاتا۔ میرے چہرے کو غور سے دیکھتیں اور میں سچ اُگل دیتا۔

یہ بھی بتایا کرتیں کہ ان کے والد احمد حسن خان کس طرح خود کو سنت کے مطابق ڈھالنے کی سعی کرتے۔ وہ جب بھی کوئی کام کرتے تو بتاتے کہ اللہ کے آخری رسول ﷺ کو یہ محبوب تھا۔ وہ ایسا ہی کرتے، حتیٰ کہ کھجور اور شہد سے عالی مرتبتؐ کی رغبت کو ملحوظ رکھنا۔ یاد دلاتا کہ آپ کو یہ چیزیں خوش آتیں۔ میں بہت چھوٹا سا لڑکا تھا جب جنّت اور جہنم کا تصور ہمارے ذہنوں میں راسخ کر دیا گیا۔ بس یہ کہ جنّت کا تصور میرے ادراک میں پوری طرح کبھی نہ آتا۔ میری اماں بیچاری، کیسے کیسے سوالوں سے میں انہیں پریشان کیا کرتا۔ کیا میں جنّت میں کرکٹ کھیل سکوں گا؟ وہاں مجھے شکار کھیلنے کی اجازت ہو گی نا؟

جب میں سات سال کا ہوا تو مجھے اور میری بہنوں کو قرآن پاک پڑھانے کے لیے ایک عالم دین ہمارے ہاں آنے لگے۔ سکول میں مذہبی تعلیم کا ایک پیریڈ تھا اور دن کا آغاز تلاوت سے ہوا کرتا۔ جمعہ کے دن آغا جان کے ساتھ میں مسجد جایا کرتا۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ پر خاندان کے سب لوگ سولہویں صدی کے عظیم صوفی سکالر حضرت میاں میرؒ کے مزار پہ جاتے۔ سکھ مذہب کے ماننے والے بھی ان کی بہت تکریم کرتے اور حاضری دینے آیا کرتے ہیں۔ ہمارا

خاندانی قبرستان اس مزار سے ملحق ہے؛ چنانچہ عید کی نماز کے بعد ہم ان کی قبروں پہ فاتحہ پڑھتے۔ وہ جو کبھی اس دنیا میں بروئے کار تھے اور اب ان کے لیے ہمیں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگنا تھیں۔ اولیاء کے ایسے کتنے ہی مزار برصغیر کی وسعتوں میں پھیلے ہیں۔ نویں صدی سے اس خطۂ ارض میں جنھوں نے اسلام کو فروغ دیا۔ ان کا وہ پیغامِ الفت وانس، صدیوں تک مصیبت کے ماروں پر رحمت کا ابر بن کر برسا، ان کے زخموں کا مرہم۔ دوسرے مذاہب کے لیے صوفیوں کی وہ رواداری اور خیر خواہی، مساوات اور مقامی ثقافت کا وہ لحاظ۔ اللہ کا دین ان کے ذریعے پھیلتا چلا گیا۔ قافلوں کے قافلے وہاں جاتے، اللہ سے دعائیں مانگتے اور نذرانے پیش کرتے ہیں۔ بھوکوں کے لیے کھانا، اللہ کے حضور مناجات۔ طالبان کا طرزِ عمل دوسرا ہے۔ ان میں سخت گیری ہے۔

میرے والدین، آغا جان اور میری والدہ مذہب کے باب میں نرم خو تھے، کشادہ مزاج۔ ہم سے وہ کہا کرتے: اللہ بڑا ہی رحمٰن اور بے حد رحیم ہے۔ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کے لیے ہم پر سختی کبھی نہ کی جاتی۔ رمضان المبارک میں ہم بچوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ روزے رکھنے کا مقابلہ ہوا کرتا۔ نو برس کی عمر میں، میں نے پہلا روزہ رکھا۔ اس شام میری ماں اور آغا جان، دونوں نے مجھے کچھ تحائف دیے۔ اگر کوئی اسلام کے خلاف ذرا سی بات بھی کرتا تو وہ دونوں بہت جوش وجذبے کے ساتھ اللہ کے دین کا دفاع کرتے۔

میری والدہ کے برکی خاندان کا تعلق کانی گرام سے تھا، جو وزیرستان کا سب سے بڑا قصبہ ہے۔ وہ افغان سرحد کے قریب ایک زرخیز وادی میں واقع ہے۔ بہت فخر کے ساتھ وہ کہا کرتیں کہ ہمارے اجداد نے، ہمارے پشتون قبائل نے انگریزوں کی غلامی کبھی قبول نہ کی۔ دائم ان کا مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر یہ خاندان بارہ قلعوں پر مشتمل اس گاؤں میں نظر آتا ہے جس کو بستی پٹھاناں کہا جاتا، شہر جالندھر کے قریب، امرتسر کے جنوب مغرب میں، لاہور سے چالیس

میل کے فاصلے پر۔ پاکستان بنا تو پورے کے پورے خاندان نے ہجرت کی اور لاہور چلے آئے۔ ان میں سے کوئی شہید نہ کیا گیا۔ جب وہ اپنے گاؤں سے نکلے تو سکھوں کا گمان یہ تھا کہ وہ پوری طرح مسلّح ہیں؛ لہٰذا وہ ٹل گئے۔ ان کا اندازہ غلط تھا۔

میرے والد کا نیازی قبیلہ پندرھویں صدی میں افغان فاتحین کے ساتھ اس سرزمین میں وارد ہوا۔ نیازیوں کی اکثریت اب بھی میانوالی میں آباد ہے۔ دریائے سندھ جس کے حاشیے پر جھاگ اڑاتا ہوا گزرتا ہے۔ میری والدہ کے برکی خاندان میں، اب قریبی رشتہ دار ہی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ نیازیوں کی بات دوسری ہے۔ دور دراز کے رشتہ دار بھی ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہی ہوتے ہیں۔ سب ایک دوسرے کو خوب جانتے اور ربطِ باہم برقرار رکھتے ہیں۔ میں کتنے ہی اجنبی نیازیوں سے ملتا ہوں۔ انگلیوں پر حساب لگا کر وہ مجھے بتا دیتے ہیں کہ تمہارے دادا کے پردادا سے ہمارے خاندان کا تعلق کس طرح بنتا ہے۔ دیہاتوں میں خاندانی رشتے شہروں سے زیادہ مضبوط ہیں۔

میانوالی میں خاندان اس طرح نہیں ہوتے جیسے کراچی اور لاہور ایسے شہروں میں۔ بلکہ سوڈیڑھ سو افراد پر مشتمل ایک کنبہ۔ ایک دادا یا پردادا کی ساری اولاد، ایک ہی گھرانہ تسلیم کی جاتی ہے۔ سب کچھ سانجھا، سب کچھ مشترک۔ آمدن، ذمہ داریاں، دوستیاں اور دشمنیاں، مشکلات اور کامیابیاں۔ وہ جب گاؤں سے نوکری کی تلاش میں نکلتے ہیں تو شہر میں اپنے رشتہ داروں کے پاس ہی آیا کرتے ہیں۔ رشتہ دار نہ ہو تو قبیلے یا اپنے دیہہ کا آدمی۔ حالیہ برسوں میں سیلابوں اور جنگوں کے باعث لاکھوں افراد کو سرحدی علاقوں سے ہجرت کرنا پڑی۔ ان میں سے کوئی کم ہی بھوکا سویا ہوگا۔ کم ہی کسی کے ہاتھ پھیلانے کی نوبت آئی ہوگی۔ رشتہ داروں اور قبیلے کے لوگوں نے ان کی مدد کی۔ غریبوں اور مفلسوں تک نے، جن کے اپنے دامن خالی تھے، انہیں کھلایا، پلایا اور پہنایا۔ دنیا کا کوئی دوسرا ملک ہوتا تو گلیاں اور بازار بھکاریوں سے بھر جاتے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ معاشرے کی یہ فراخ دلی، حکمرانوں کو ان کی ذمہ داری سے آزاد کر دیتی ہے۔ بے رحم اشرافیہ بے گھر، بے در لوگوں کے حوالے سے واجب الادا فرض تو کیا خاک پورا کرتی، یہ ظالم لوگ ٹیکس تک دیتے نہیں۔ افتادگانِ خاک کا حال تک نہیں پوچھتے۔ یہ عجیب سرزمین ہے۔ یہاں غریب لوگ امیروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

ہوش کی آنکھ کھولنے پر، میں دو قسم کے شدید احساسات میں مبتلا ہوا، سب سے زیادہ استعمار کے خلاف۔ بچپن ہی سے مجھے سکھایا گیا کہ غلامی وہ بدترین چیز ہے، بنی نوع انسان جس کا شکار ہو سکتا ہے۔ آدمی کی اس سے زیادہ توہین ممکن نہیں۔ اماں جان مجھے شیر میسور ٹیپو سلطان کی داستان سنایا کرتیں۔ 1799ء میں، جس پر تین افواج نے حملہ کیا، انگریز، نظام حیدرآباد اور مرہٹوں نے۔ پھر وہ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی کہانی سناتیں، جو 1862ء میں بے بسی کی موت مارا گیا۔ آخر میں وہ ٹیپو سلطان کا قول دہراتیں: شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ انگریز کی حکمرانی سے برصغیر کو جو سب سے بڑا نقصان پہنچا، وہ معاشی تھا۔ بے شک ایسا ہی ہوا۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل تک اس خطے کی معیشت ساری دنیا کا چوتھا حصہ تھی۔ انگریزی دور کا اختتام ہوا تو دو فیصد رہ گئی۔ 1879ء میں انگریز قانون دان کارنیلیس والفورڈ (Cornelis Walford) نے اندازہ لگایا کہ ایک صدی کے برطانوی راج میں 34 قحط پڑے۔ حالانکہ اس سے قبل دو ہزار برس میں صرف سترہ بار اس طرح کی تباہی آئی تھی۔ ایم جے اکبر لکھتے ہیں: مغلوں نے قحط سالی کا علاج، کم تولنے پر سخت سزا اور اچھی حکمرانی سے کیا۔ سٹے اور بیرون ملک غلہ بھیجنے پر پابندی، ٹیکسوں میں نرمی اور لنگر۔

ان المیوں میں کروڑوں افراد جان ہار گئے۔ مادہ پرست یہ فرماتے ہیں کہ انگریزوں نے برصغیر کو ایک مضبوط انتظامی ڈھانچہ فراہم کیا۔ ایک حد تک یہ بات درست بھی ہے۔

اس معاملے کو مگر میں ایک دوسرے زاویے سے دیکھتا ہوں۔ غلامی کے ماہ و سال نے برصغیر میں آباد نسلوں کو غلامی کی ذلت میں مبتلا کیا اور عزت نفس سے محروم کر دیا۔ غلام سرزمینوں میں جو مخلوق آباد ہوتی ہے، اس کے دماغوں اور دلوں میں، احساس کمتری کی فصل اگتی ہے۔ وہ اپنے آقاؤں کی بعض بدترین عادات کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنی بعض بہترین روایات کو حقیر جان کر خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ قوتِ تخلیق فنا ہوتی اور پیروی باقی رہ جاتی ہے۔ اشرافیہ میں قیادت کا داعیہ تمام ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی کچھ ہمارے طبقے میں رونما ہو رہا ہے۔ مہنگی ترین تعلیم پانے کے باوجود رہنمائی کے کام میں کورے۔ اقبالؔ کی عظمت کا میں اس لیے بھی قائل ہوں کہ غلامی میں پیدا ہوئے، پروان چڑھے، کمال مگر یہ ہے کہ ان کی روح آزاد تھی، حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت اور آزادیٔ فکر کے وہ حامل تھے۔ ان کا یہ شعر، دل کی گہرائیوں میں برقی رو دوڑا دیتا ہے:

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

پاکستان اور بھارت کی دشمنی بھی استعمار کا ورثہ ہے۔ ہمارے دکھ میں یہ احساس کارفرما ہے کہ آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہمیں دھوکا دیا۔ کشمیر کو بھارت کے حوالے کر دیا۔ پنجاب میں خاص طور پر، ہندوستان کے خلاف ایک کھولتی ہوئی نفرت ہے۔ اس لیے کہ ہجرت کرنے والوں کی اکثریت یہیں آباد ہے۔ ان میں سے اکثر خاندانوں نے اپنے پیاروں کو 1947ء کے فساد میں کھو دیا۔ بار بار مجھے بھارت جانے کا موقع ملا اور بتدریج میں نے محسوس کیا کہ دونوں اقوام میں کچھ چیزیں مشترک بھی پائی جاتی ہیں۔

ہمیں یہ سکھایا گیا کہ اسلام رواداری کا مذہب ہے۔ اسلحے سے نہیں وہ علم کے بل پر پھیلا ہے، عظیم صوفی اساتذہ کے ذریعے۔ ان میں سے ایک خواجہ معین الدین چشتیؒ ہیں، جنہیں خواجہ

غریب نواز اولیاؒ کہا جاتا ہے۔ بارھویں صدی کے آخر اور تیرھویں صدی کے اوائل میں جو مفلسوں اور محتاجوں کا سائبان تھے۔ ان درویشوں کا رسوخ اور احترام کس قدر تھا؟ کہا جاتا ہے کہ، 1303ء میں جب منگولوں نے دہلی کا رخ کیا تو سلطان علاؤالدین خلجی نے نظام الدین اولیاؒ سے مدد کی التجا کی۔ آزادی سے قبل طالب علمی کے زمانے میں میرے والد کے بہت سے ہندو اور سکھ دوست تھے۔ میری والدہ کی سہیلیاں بھی؛ چنانچہ ہمیں ان سے نفرت کا درس نہ ملا۔ ہمارے بچپن کا دور مذہبی جنونیوں سے پاک تھا اور جو چند ایک تھے، انہیں زیادہ اہمیت نہ دی جاتی۔ یہ البتہ خوب اچھی طرح ہمارے ذہنوں میں راسخ کر دیا گیا کہ اسلام ہی اللہ کا سچا دین ہے۔ قرآنِ کریم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب پر نازل ہوا اور خود پروردگار نے انہیں ازبر کرا دیا۔ باقی الہامی کتابیں فانی آدمیوں نے مرتب کیں اور وہ حشو دوزوائد سے پاک نہیں۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ اُمّی تھے؛ چنانچہ قرآن کریم کی مبارک آیات صحابہ کرامؓ سے لکھوایا کرتے۔ دانش و دانائی کا بے مثال خزانہ ہی نہیں، قرآن عظیم الشان ادب کا ایک بے نظیر نمونہ بھی ہے۔ فاروق اعظمؓ کا اسلام قبول کرنا اسی کا اعجاز ہے اور آنے والی صدیوں میں اَن گنت دوسروں کا بھی۔ وہ تو اللہ کے رسولؐ کی جان لینے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے تھے۔ جب انہوں نے اپنی بہن کو تلاوت کرتے سنا، تو ان کا دل پگھل گیا۔ وہ رو دیے اور ایمان والوں کے قافلے میں شامل ہو گئے۔ پھر وہ ان کے قریب ترین ساتھیوں میں سے ایک ہو گئے اور انسانی تاریخ میں دائم جگمگاتی قیادت کے عظیم منصب پر فائز ہوئے۔

ایک تجربہ مجھ پر بیتا ہے، جس نے مجھے ادراک بخشا کہ اس عظیم ہستی پر قرآن کریم سنتے ہوئے کیا گزری ہو گی۔ نماز جمعہ کے لیے اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر میں اسلام آباد کی دلآویز فیصل مسجد میں گیا۔ ایک مصری امام خطبہ پڑھ رہے تھے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ مسجد میں بیٹھے بیٹھے آپ اپنے خیالات میں کھو جاتے ہیں۔ مگر اس دن یہ ہوا کہ حسین لحن میں امام نے جب

تلاوت شروع کی تو شائستہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وسیع وعریض مسجد میں قرآن کریم کا جادو جاگ اٹھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہر چیز اس کے سحر میں ڈوب گئی ہے۔ ادھر ادھر میں نے دیکھا اور پایا کہ سبھی، سب کے سب اس کا شکار ہیں۔ یہ نور و آہنگ کا ایک جہان تھا ایسی واردات پھر کبھی نہ بیتی، حتیٰ کہ مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ میں بھی نہیں۔ بس کوئی لمحہ ہوا کرتا ہے، جو قلوب پر بے پناہی کے ساتھ اترتا اور ہر چیز کو اتھل پتھل کر دیتا ہے، یا جیسے ایک کلاسیکی نغمہ مبہوت کر دیتا ہے۔

اسلام فقط ذاتی زندگی میں اجالا کرنے والا مذہب نہیں، ایک طرزِ حیات ہے۔ واضح ہدایات قرآن کریم دیتا ہے کہ معاشرے کو کیسے منظم کیا جائے اور لوگ باہم کیا رویہ اختیار کریں۔ مجھے سکھایا گیا کہ یہ رحم و کرم کا دین ہے۔ فراخ دلی اور انصاف کا بہترین قرینہ۔

1965ء میں میری عمر تیرہ سال تھی جب اچانک پاک بھارت جنگ چھڑی۔ آزادی کے بعد دو قوموں کے درمیان یہ دوسرا معرکہ تھا اور کشمیر اس کا سبب۔ ان ایام کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ایک شام بمباری کی خوفناک صدا آئی اور کھڑکیوں کے شیشے بجنے لگے۔ چھتوں پر چڑھ کر ہم نے سرحد پر چاروں طرف دھماکوں سے پھیلتی پھل جھڑیاں دیکھیں۔ شب بھر آگ برستی رہی اور میں اپنے والدین کے متجسس چہرے دیکھتا رہا۔ بھارتی فوج لاہور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ افواہ یہ تھی کہ بھارتی چھاپہ مار جہازوں سے شہر میں اتریں گے۔ حب وطن کی لہر نے دلوں اور ذہنوں کو گرما دیا تھا۔ زمان پارک میں خاندان کے بزرگ میرے ماموں کے گھر جمع ہوئے۔ فیصلہ ہوا کہ نوجوانوں پر مشتمل ایک جتھہ تشکیل دیا جائے جو زمان پارک کی حفاظت کرے گا۔ میں اس گروپ میں شامل ہونے کے لیے بے تاب تھا، اس عشاریہ 22 رائفل کے ساتھ جو میری سالگرہ پر آغا جان نے مجھے تحفے میں دی تھی۔ بڑی شان سے رائفل اٹھائے میں محافظوں میں شامل ہونے کے لیے گیا مگر یہ کہہ کر واپس کر دیا گیا کہ ابھی تم بچے ہو۔ بہت غصہ مجھے آیا، صدمہ ہوا کہ کیوں میری عمر کم ہے۔ پھر میری بہنوں کے ساتھ مجھے شہر سے دور بھیج دیا

گیا۔ ہم راولپنڈی پہنچے تو نواحِ شہر میں، میں نے قبائلی رضا کاروں کے گروہ دیکھے جو فوج کی مدد کرنے آئے تھے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میرے رشتے کے بھائیوں نے گھات لگا کر دو معصوم شہریوں کو قتل کرنے کی کوشش کی، وہ سمجھے کہ یہ بھارتی چھاپہ مار ہیں۔ دشمن کو شکست دینے کے لیے پورا ملک متحد تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پھر کبھی ایسا اتحاد قائم نہ ہوا؛ البتہ 1992ء میں کرکٹ کا عالمی کپ جیتنے پر ساری قوم نے جشن ضرور منایا۔

جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا، نہ صرف اپنے وطن سے میری محبت بڑھتی گئی بلکہ شہروں کے باہر پھیلی ہوئی کشادہ فضاؤں سے بھی۔ لاہور کی جھلسا دینے والی گرمی سے نجات کی تمنا میں، گرما کے ہر موسم میں، اپنے والدین کے ساتھ میں پہاڑ پر جایا کرتا۔ وہ سنسنی خیز مسرت جب بلند پہاڑوں کے قریب ہم جا پہنچتے اور ہوا خنک ہونے لگتی۔ پنجاب کی اذیت ناک گرمی سے گزرنے والے ہی اس لطف کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس دور میں گھر ایئر کنڈیشنڈ نہ ہوتے تھے۔ پہاڑ پر ہم پکنک مناتے، جنگلوں میں گھوما کرتے۔ بندروں، گیدڑوں اور خار پشت کو دیکھتے اور ہاں! انواع و اقسام کے ان گنت پرندوں کو۔ ایک بار اور تب میری عمر پانچ برس تھی، ایک چونکا دینے والی بات ہوئی۔ نواح مری کی ڈونگا گلی میں نصف شب کو برفانی تیندوے (Snow Leopard) نے ایک گدھے کو مار ڈالا۔ اس ریسٹ ہاؤس کے قریب ہمارا خاندان جہاں مقیم تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس منظر نے کس قدر سنسنی میرے ذہن میں پیدا کی۔ موسم سرما میں اپنے بھائیوں اور چچاؤں کے ساتھ میں کلر کہار کے نواح میں تیتروں کا شکار کھیلنے جاتا۔ میرے بچپن کی بعض مسرت آگہی یادوں کا تعلق اس علاقے سے وابستہ ہے۔ نواح میں جنگلی جانوروں کی کثرت تھی۔ بھیڑیئے، تیندوے، چرخ، گیدڑ، لومڑیاں، ہرن اور جنگلی بھیڑیں۔ سالٹ رینج میں اب جنگلی حیات برائے نام ہے لیکن پھر بھی اپنے حسن اور تنوع کے سبب شکار کے لیے یہ میری پسندیدہ ترین جگہوں میں سے ایک ہے۔ میری والدہ بھی جنگلی حیات اور پہاڑوں سے گہری

وابستگی رکھتی تھیں۔ کہانیاں سنا کر وہ میرا شوق جگا دیا کرتیں۔ ان داستانوں کا تعلق شملہ اور ڈلہوزی سے تھا، جہاں اپنے والدین کے ساتھ وہ چھٹیاں بتانے جایا کرتیں۔ اب یہ شہر بھارت کا حصہ ہیں۔ سب بچوں کی طرح مجھے بھی ان کہانیوں سے دلچسپی ہوا کرتی۔ وہ کہانی مجھے بہت ہی اچھی لگتی، جس میں ایک چیتا، ان کے کتے کو اٹھا لے گیا تھا۔ رگ و پے میں بجلی دوڑانے والی ایک اور داستان کا تعلق میرے والد کے چچا سے تھا۔ ایک شیر سے ان کا مقابلہ، جس نے دیہاتیوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ دوبدو لڑائی میں بالآخر وہ ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ گولیاں ختم ہو جانے کے بعد بندوق کے دستے سے انہوں نے اسے قتل کر ڈالا۔ پھر گہرے زخموں نے چھ ماہ تک انہیں ہسپتال کے بستر سے باندھے رکھا۔ وہ پولیس کے اعلیٰ ترین ایوارڈ کے مستحق ٹھہرے تھے۔

1965ء کی جنگ سترہ دن کے بعد تمام ہوگئی۔ فوجی حکمران ایوب خان مگر اس کے نتیجے میں کمزور ہو گئے۔ معاملات پر ان کی گرفت کم ہوتی گئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی ابھر کر سامنے آئی۔ کیلی فورنیا اور اوکسفرڈ میں تعلیم پانے والے بھٹو 34 سال کی عمر میں وزیر خارجہ بنے۔ اقوام متحدہ میں وہ پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ ایوب خان سے ان کی علیحدگی 1965ء کی جنگ کے عواقب و نتائج میں سے ایک ہے۔ اوّل اوّل انہیں ایک نجات دہندہ کے طور پر دیکھا گیا۔ بعدازاں مگر وہ برعکس ثابت ہوئے۔

یہ وہ آدمی تھا، جسے قدرت نے کرشماتی شخصیت عطا کی تھی۔ تاریخی شعور سے وہ بہرہ ور تھا، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور غیر معمولی ذہانت کا امین۔ اگر وہ چاہتا تو پاکستان کو بدل کر رکھ دیتا۔ وہ ایک قوم پرست تھا اور اس نے ملک کی پہلی عوامی جماعت تشکیل دی۔ اس کے کردار میں مگر ایک مہلک سقم ایسا تھا کہ ہر امکان کو جس نے برباد کر دیا۔ اس کا جاگیردارانہ ذہن اختلاف کی تاب نہ لا سکتا۔ جلد ہی انتقامی انداز ان کی حکومت کا امتیازی نشان بن گیا۔ ایک بات البتہ ہے، 1967ء میں لکھی جانے والی Myth of Independence (آزادی کا افسانہ) ان کی بڑی

ہی وقیع کتاب ہے، اب بھی اتنی ہی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ خود اپنے نظریات پر عمل پیرا نہ ہو سکے۔ قدیم مصر سے برطانیہ اور فرانس تک کی سلطنتوں کا انہوں نے جائزہ لیا۔ تسلط قائم کرنے کی ہوس اور برتری کے لیے جدوجہد سے تصادم کی کہانی اس کتاب میں خوب بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے نتیجہ یہ اخذ کیا ہے "Survival of the Fittest" ''موزوں ترین ہی بچ پاتا ہے'' کے اصول کے تحت تسلط قائم کرنا جائز ہے: مستقبل کا بالکل درست ادراک کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ''آزادی کے ان 20 برسوں میں پاکستان اور بھارت کے عوام آزادی اور مطلق برابری کے درمیان پائے جانے والے فرق سے آشنا ہیں۔ یہ نوآبادیاتی نظام کی ایک نئی صورت کا ظہور ہے۔ جس کے تحت چھوٹے ممالک کے معاملات کو کنٹرول کرنے کے لیے علاقائی تسلط کی ضرورت نہ رہے گی۔ براہ راست قبضے کی جگہ نئے استعماری ہتھکنڈوں نے لے لی کہ زیراثر ممالک کو مفلس اور محتاج بنا کر رکھا جائے۔''

انیسویں صدی میں برطانیہ نے بھارت کے ان علاقوں میں ایک مختلف انداز کا استعماری نظام متعارف کرایا، جنہیں راجواڑے کہا جاتا تھا۔ 500 سے زیادہ نام نہاد راجے اور مہاراجے۔ براہ راست حکومت کی بجائے، انگریز ان کٹھ پتلیوں کے ذریعے ان سرزمینوں کے عوام پر حکم چلاتے۔ ہمارے پاکستانی حکمران بھی انہی جیسے ہیں۔ اپنے قومی مفادات کے برعکس وہ امریکی احکامات کے مطابق فیصلے صادر کرتے ہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کی وجہ سے پاکستان میں انتہاپسندی پنپ رہی ہے۔

جب میں جواں سال تھا تو شاہراہ قراقرم کا رخ کیا کرتا جو بھارت، پاکستان اور چین کی سرحدوں پر واقع ہے۔ اپنی بہترین چھٹیاں میں نے ان پہاڑی سلسلوں میں بسر کیں۔ کوہ نوردی کے لیے یہ دنیا کے بہترین مقامات میں سے ایک ہے۔ یہاں دنیا کی بلند چوٹیاں ہیں۔ 24,000 فٹ سے بھی زیادہ اونچی۔ ان میں دنیا کا دوسرا سب سے بلند پہاڑ کے ٹو بھی شامل

ہے۔ یہی دنیا کی چھت ہے، 9000 فٹ کی بلندی پر ڈوبل وادی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی
خوبصورت جگہ میں نے نہیں دیکھی۔ جہاں فوج والے سرما میں سکینگ (SKIING)، کے برف
پر پھسلنے کے مقابلے منعقد کراتے ہیں۔ ان بستیوں کے مکین بہت ہی گرم جوش ہیں اور بے حد
محبت کرنے والے ہیں۔ اب کا حال معلوم نہیں لیکن تب سیاح وہاں نہ جاتے تھے۔ شہروں کے
شور وشغب سے دور، ایک دودھیا پانی والی ندی کے دونوں طرف پھیلی وسعتوں کو سرخ اور سفید
پھولوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہر صبح جاگ کر میں نظارہ کیا کرتا اور اپنے آپ سے کہتا: یہی تو
جنت ہے۔ خود کو مجھے یقین دلانا پڑتا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا۔ اس علاقہ کے لوگ پرتپاک اور
دوستانہ مزاج رکھتے ہیں۔ جدید سیاحت زدہ علاقوں کے تصنع سے پاک۔

ایک سفر کے دوران دو جیپوں میں سے ایک خراب ہوگئی۔ ایک نوجوان نے پیشکش کی کہ
شب بسری کے لیے ہم اس کے گاؤں چلیں۔ چالیس منٹ کے بعد ہم ایک زمردیں جھیل کے
کنارے صنوبر کے درختوں سے گھرے، ایک گاؤں میں پہنچے۔ بہت ہی لذیذ کھانا انہوں نے
ہمیں کھلایا، جس میں کھمبیاں (Mushrooms) شامل تھیں۔ آج تک پھر ایسا دسترخوان نہ
دیکھا۔ چودھویں کے چاند نے جادو سا کر رکھا تھا۔ صنوبر کے درختوں میں ہوا بہتی رہی۔ جھیل
کنارے رات بھر ہم جاگتے رہے، اس بے کراں جمال پہ حیران۔ پاکستان کا شمالی علاقہ
سوئٹزرلینڈ سے دوگنا بڑا ہے۔ کون جانے، وہاں اس طرح کے کتنے ہی جھیل اور دلکش علاقے
اور ہیں۔ میں ہنزہ کی وادیوں میں بھی ایسے ہی تجربات سے گزرا۔

1967ء میں پہلی بار جب میں اس علاقے میں گیا تو گرم جوش دیہاتی ہمیں آڑو اور
خوبانی پیش کرتے۔ اپنے گھروں میں مہمان بنانے کے لیے بے تاب سے ہو جاتے۔ انہی
برف زاروں میں وہ نادر و نایاب برفانی تیندوا (Snow Leopard) پایا جاتا ہے جس کی
آنکھوں میں سبز رنگ کی جھلک ہوتی ہے۔ ایک چرواہا اس تیندوے کے دو بچے اٹھائے سابق

ریاست نگر کے میر کو پیش کرنے آیا۔ 1974ء تک گلگت کے جنوب میں واقع وہ اس مختصری
ریاست کا حکمران رہا تھا۔ یہ گلگت بلتستان کے شمال میں واقع ہے۔ تب ہنزہ دور دراز کا
ایک مقام تھا۔ پہاڑوں پر پتلی پرانی سڑکیں، زاویہ در زاویہ، ہزاروں فٹ کی بلندی سے
خوف زدہ کر دینے والے مناظر۔ دوسری عالمی جنگ کے زمانے کی جیپوں میں بہت مشکل سے
یہاں پہنچا جا سکتا۔ کبھی نیچے نگاہ پڑتی تو برباد ہو جانے والی جیپوں کے ڈھانچے نظر آتے۔ پھر
قراقرم تعمیر ہوئی، جسے شاہراہِ ریشم بھی کہا جاتا ہے۔ ہزاروں برس اس راہ سے تجارت ہوتی رہی
لیکن خطرہ مول لینے والے ہی اس پر سفر کر سکتے تھے۔ اب یہ باقاعدہ سڑک ہے۔ دنیا کا نواں
عجوبہ، اس لیے کہ یہ دنیا کی بلند ترین شاہراہ ہے۔ کرۂ ارض پر کسی بھی سڑک کی تعمیر اتنی دشوار نہ
رہی ہوگی۔ پاکستان اور چین کو اس کام میں بیس برس لگے اور نوسو زندگیاں اس کی نذر ہوئیں۔
یہ دنیا کے حسین ترین پہاڑ ہیں۔ لوگوں کا رویہ اب بھی دوستانہ ہے؛ اگرچہ ترقی کے عمل نے اپنی
قیمت وصول کی ہے۔ آبادی میں ہولناک اضافے کے علاوہ ٹمبر مافیا نے بے دردی سے درخت
کاٹ کر جنگل ویران کر دیے ہیں۔ افسوس کہ نئے زمانے، پاکستان کے بہت سے علاقوں میں
تباہی لے کر آئے۔ جو بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ 1947ء میں جو
آبادی چار کروڑ سے کم تھی، ساڑھے چار گنا بڑھ کر اب 18 کروڑ ہو چکی۔

ہمارے ملک کا فطری حسن اور جنگلات تیزی سے غائب ہو رہے ہیں، 60-1950ء
کی دہائی میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ پاکستان کو تباہی سے دوچار کرنے والے مسائل میں یہ
ایک مسئلہ بھی شامل ہے۔ اصل مسئلہ تو خود ریاست کے تانے بانے میں خرابی ہے۔ جس نے
انگریزوں کی روایات اور اداروں کے ساتھ ہماری غلامانہ وابستگی سے جنم لیا ہے، بجائے اس
کے کہ ہماری اشرافیہ نوآبادیاتی غلامی کا طوق اُتار پھینکتی، اُلٹا انہوں نے اُسے اور مضبوطی سے
اپنے ساتھ چمٹا لیا کہ جس قدر کوئی پاکستانی انگریزوں کی نقالی کرے گا، اُسی قدر اس کی سماجی

حیثیت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

پاکستانیوں نے انگریز بننے کی روش اختیار کی۔ ہوٹلوں کے بیروں سمیت ہر کوئی انگریزی بولنے لگا۔ انگریزی سوٹ وہ پہننے لگے۔ ہم بچے انگریزی فلمیں دیکھا کرتے۔ اختتام ہفتہ پر زیادہ ''مہذب'' لوگ انگریزی دھنوں پر رقص فرماتے۔ ان میں سے بعض تو اردو بھی انگریزی لہجے میں بولتے۔ ایسے بھی ہیں جو چپاتی اور گاڑھے شوربے والا سالن چھری کانٹے کے ساتھ تناول کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے۔ ان کے بنائے ہوئے کلبوں کی رکنیت حاصل کرنے کے لیے ایک پاکستانی کو انتظار اور کوشش سے گزرنا ہوگا۔ بالکل برعکس ایک گورا جب چاہے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جائے۔ ویٹر اس سے پوچھنے کی جرأت نہ کرے گا کہ وہ ممبر بھی ہے یا نہیں۔ کراچی کے سندھ کلب میں جو اپنے آپ سے متنفر کالے صاحبوں کی پسندیدہ آماجگاہ ہے، پاکستانی ثقافت سے وابستہ کسی چیز کو گوارا نہیں کیا جاتا۔ 1871ء میں یہ کلب انگریزوں نے تعمیر کیا تھا۔ 1974ء تک اس میں شلوار قمیص پہن کر داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

فوجی اور سول افسروں کی اکثریت پر مشتمل مختصری اشرافیہ نے مقامی باشندوں سے کراہت ورثے میں پائی۔ اقبال ایسے مفکرین سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے، استعماری انداز میں وہ لوگوں پر حکم چلانے کی کوشش کرتے رہے۔ استعماری عہد کے تمام ادارے جوں کے توں رہے۔ عام پاکستانی کے لیے فرق صرف یہ واقع ہوا کہ انگریز کی جگہ کالے صاحب نے لے لی۔ بعض اوقات ان کا رویہ غیر ملکیوں سے بھی بدتر ہوتا۔ جب غلام آقا ہو جائے تو وہ اپنے ہم نفسوں کے ساتھ اور بھی برا سلوک کرتا ہے۔ بہت سے افسر انگلش میڈیم سکولوں سے آتے ہیں جو برطانیہ نے بنائے تھے۔ انگلینڈ کے پبلک سکولوں کی طرز پر۔

1948ء میں میرے والد امپیریل کالج لندن سے اعلیٰ تعلیم کے بعد واپس آئے۔ اپنے

علاقے میں وہ دوسرے شخص تھے جنہیں ''لندن ریٹرن'' کا مقام حاصل تھا۔ ریلوے سٹیشن پر پورے کا پورا قصبہ ان کا استقبال کرنے امنڈ آیا۔ ایسے لوگوں کا سماجی مرتبہ دفعتاً بلند ہو جاتا ہے۔ ان کی شادیاں زیادہ بارسوخ گھرانوں میں ممکن ہو جاتیں۔ پاکستان اور اس سے زیادہ بھارت میں، اب بھی شادی کے لیے گورے رنگ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بھارت میں تو شادی کے لیے دیے جانے والے اشتہارات میں گاہے اس امر کا اعلان بھی کیا جاتا ہے۔ کتنے زمانے اس طرح گزرے کہ بھارت بیرون ملک سے در آنے والوں کی شکارگاہ رہا۔ شمال مغرب سے آنے والے فاتحین اکثر سرخ و سفید ہوتے؛ لہٰذا برصغیر کی ذہنیت میں، جسمانی رنگ کی فوقیت کا احساس بہت گہرا ہے۔ زمان پارک میں ''لندن ریٹرن'' فوراً ہی وی آئی پی بن جاتا۔ جب بھی میرا کوئی کزن برطانیہ سے حصول تعلیم کے بعد وطن واپس آتا، ہم سوالات کے انبار لے کر اس کے پاس جا پہنچتے کہ وہاں زندگی کیسے بسر ہوتی ہے؟ مغرب سے محض ان کی شناسائی ہی ان کا سماجی مرتبہ بلند کرنے کے لیے کافی تھی۔

برصغیر پہ اپنی حکمرانی کے ایام میں انگریزوں نے بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ مقامیوں کے ذہنوں میں احساسِ کمتری کاشت کیا۔ بیروں اور خانساموں کو مغل فوج کے جنرلوں اور شہزادوں کے سے ملبوسات پہنائے جاتے۔ فوج اور پولیس کے افسر برطانیہ میں رائج لباس زیب تن کرتے۔ سولہویں صدی کے وسط سے ابتدا کرنے والے مغل اقتدار کا زوال سترہویں صدی سے شروع ہوا۔ سولہویں صدی میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے بروئے کار آنے کا زمانہ ہے، مغل سلطنت پورے جاہ و جلال کے ساتھ کارفرما تھی، ہندوستان کے بیشتر علاقوں پر انہیں حق حکمرانی تو حاصل تھا ہی، مغل بادشاہ کو دنیاوی نہیں بلکہ کسی حد تک روحانی طور پر بھی برتر مانا جاتا۔ ان درباروں کے شان و شوکہ کی کہانیاں کہی جاتیں۔ اول نصف صدی تک انگریز بھی ان کی پیروی کرتے رہے۔ وہ فارسی بولتے، مغل اشرافیہ جیسا لباس پہنا کرتے، سؤر اور گائے

کے گوشت سے بچا کرتے اور مقامی عورتوں سے شادی کرنے کی کوشش کرتے۔ بعض اوقات تو ایک سے زیادہ۔ برطانوی مؤرخ ولیم ڈال ریمپل (William Dalrymple) نے اس عہد میں انگریزوں کے تغیر پذیر رجحانات کو قلمبند کیا ہے۔ سترہویں صدی کے درمیان سے اٹھارویں صدی کے وسط تک انگریزوں نے تقریباً تمام افواج کو شکست سے دوچار کر دیا۔ اہل فرانس کے علاوہ سکھ اور مرہٹوں کو۔ اس سے پہلے سراج الدولہ اور شیر میسور ٹیپو سلطان، ایک ایک کر کے سب چلے گئے، سب رخصت ہوئے۔ اب انگریزوں میں اعتماد بہت ہو گیا اور استعماری گھمنڈ کے نمو پانے کی ابتداء ہوئی۔ انجیلی عیسائیت سے تعلق رکھنے والا احساس برتری بھی اثر انداز ہوا۔ مسلمان مغل بادشاہوں کی تحقیر کا جذبہ جاگ اٹھا۔ اس عظیم سلطنت کی رسوائی کا جو کبھی اپنی مثال آپ تھی۔ ''آخری مغل'' (The Last Mughal) میں ڈال ریمپل نے لکھا: فاتحین کی نگاہ میں اب ہندوستان کے لوگ اس عظیم تہذیب اور دانش کے امین نہ رہے، اٹھارہویں صدی کے زعما سر ولیم جونز (William Jones) اور وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) جس کا اعتراف کرتے تھے۔

انگریزوں کی حکمرانی سے قبل، ہندوستان کا نظام تعلیم ایک مرکز اور محور پر نہ گھوما کرتا۔ ہر گاؤں کا اپنا مدرسہ تھا، اہل خیر جسے چلایا کرتے۔ زیادہ بڑے ادارے اوقاف کے تحت ہوتے۔ وسیع زرعی اراضی کی آمدن ان کے لیے مختص ہوتی۔ 1757ء میں جب بنگال پر انگریزوں نے قبضہ کیا تو معلوم ہوا کہ 34 فیصد زرعی زمین ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ وہ مختلف قسم کے ''وقف'' تھے جو مفت تعلیم اور علاج کا بندوبست کرتے۔ 1850ء میں جی ڈبلیو لیٹنر (G.W. Leitner) کی طرف سے کیے جانے والے ایک سروے کے مطابق اوقاف کے تحت چلنے والے بعض مدارس کا معیار نہایت بلند تھا۔ اس کے مطابق اوکسفرڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں جیسا۔ اعلیٰ درجے کے اساتذہ ان اداروں میں بخوشی کام کرتے کہ ہر ٹرسٹ کی معقول آمدن کے سبب، ان کے معاوضے بہت موزوں ہوتے۔ لیٹنر

نے مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کا سروے بھی کیا۔ اس کے مطابق اس علاقے میں خواندگی کی شرح 84 فیصد تھی۔ 1947ء میں انگریز گئے تو یہ شرح 9 فیصد رہ گئی تھی۔ انگریزوں نے زمینوں پر قبضہ کر لیا، اوقاف ختم کر دیے۔ آمدن کے ذرائع ختم ہوئے تو مدارس بند ہو گئے۔ اب انہوں نے انگریزی پڑھانے والے سکول بنائے اور تعلیم مرکز سے کنٹرول کی جانے لگی۔ یہ ایک نیا طبقہ تخلیق کرنے کا منصوبہ تھا۔ لارڈ تھامس میکالے (Lord Thomas Macaulay) کے بقول جو رنگ و روپ میں ہندوستانی مگر اندازِ فکر و نظر میں برطانوی ہو، اپنی آرا میں، کردار اور ذہنی اپج کے لحاظ سے پسند اور ناپسند بھی میں۔

انہیں برطانوی معیار کی اسناد دی جاتیں اور ان کی پیٹھ پیچھے ان کی تذلیل کا سامان یوں ہوتا کہ انگریز انہیں براؤن صاحب (کالے انگریز) اور بیبون (Baboon) کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے۔ بیبون افریقہ میں پایا جانے والا ایک بندر ہے۔ بعد میں یہی ''بابو'' میں بدل گیا، ہندی میں یہ لفظ باپ کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن انگریزوں کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔

برطانوی نظام تعلیم کے اثرات صرف انگریزی زبان اور کرکٹ تک محدود نہ رہے۔ استعمار نے ایک صدی تک اسے مقامی ثقافت کو تباہ کرنے اور اپنی پسند کی اشرافیہ تخلیق کرنے کے لیے استعمال کیا۔ انگریز تعداد میں بہت کم تھے۔ براہ راست وہ اس وسیع و عریض ملک پر حکومت نہ کر سکتے تھے؛ چنانچہ تہہ در تہہ ایسے گروہوں کی انہیں ضرورت تھی جو ان کے لیے کام کریں۔ غلامی سے پیدا ہونے والا یہ غلیظ ترین پہلو تھا۔ میں نے لاہور کے ایچی سن کالج میں تعلیم پائی جو برطانوی راج میں بنائے گئے اہم ترین اداروں میں سے ایک ہے۔ اپنے ہم جماعتوں کی طرح، اس دور میں، میں بھی یہ سمجھتا تھا کہ ہم اردو میں تعلیم دینے والے سرکاری سکولوں کے طلبہ سے افضل ہیں۔ ان اداروں میں مضامین کی تدریس انگریزی میں ہوتی۔ طلبہ کو حکم دیا جاتا کہ وہ باہم اسی زبان میں بات کریں۔ سکول کے اوقات میں اگر کوئی بچہ اردو بولتا ہوا

پایا جاتا تو اس پر جرمانہ عائد ہوتا۔ آئین میں ہر چند یہ لکھا تھا: پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔

مسلمانوں نے خاندان کا ادارہ بچا لیا اور عبادات کی رسوم۔ خود کو وہ قدیم عہد کے پسماندہ لوگ سمجھنے لگے۔ ہماری تعلیم ہمیں یہ بتاتی کہ اگر ترقی کرنی ہے تو برتر استعماریوں کی تقلید کرنا ہوگی۔ ہم برطانیہ کے پبلک سکولوں کے ادنیٰ سے نقال تھے۔ ہمارے رول ماڈل، خواہ وہ کھلاڑی ہوں، فلمی ستارے یا عوامی گلوکار سب کے سب مغرب سے تعلق رکھتے تھے، اس کے اداکار، کھلاڑی اور گائیک۔ مزید برآں پرانی نسل مغرب سے مرعوب تھی اور ان کی ثقافت سے بھی، خواہ ان میں سے بیشتر دل میں اسے ناپسند ہی کرتے ہوں۔ بہت بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ ہماری تعلیم ہمیں خود اپنے آپ سے کتنا دور لے جاتی ہے۔ میرے ذہن پر بس ایک ہی خیال مسلّط رہتا کہ ایچی سن کے خوبصورت میدانوں میں کرکٹ کھیلا کروں۔ اب ان سکولوں میں دیسی امریکن پیدا ہوتے ہیں، انداز اور اظہار میں وہ سات سمندر پار والوں کی نقل اتارتے ہیں۔ ہالی وڈ کی فلمیں دیکھ کر وہ بیس بال کے کھلاڑیوں ایسی ٹوپی پہنا کرتے ہیں۔ پرانی نسل انگریزوں کی دلدادہ تھی، نئی امریکیوں کی۔

پاکستان بننے کے بعد انگریزی طرز کے سکولوں سے ہمیں فوراً ہی نجات پا لینی چاہیے تھی۔ سنگا پور، ملائشیا اور بھارت میں آزاد حکومتوں نے تمام تعلیمی اداروں کے لیے یکساں نصاب نافذ کیا۔ پاکستان میں انہیں قائم رہنے دیا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب تک ان طلبہ کے لیے کتب کا انتخاب مغرب میں ہوتا ہے۔ ان سکولوں سے نکلنے والے نوجوانوں کو دوسروں کے مقابلے میں بہتر مواقع ملتے ہیں۔ سول سروس میں خاص طور پر کہ وہ اچھی انگریزی بولتے ہیں، مقامی نہیں غیر ملکی لہجے میں۔ اپنی ثقافت کو وہ ناپسند کرتے ہیں۔ ان میں ایک خاص طرح کی خود ترحمی جنم لیتی ہے اور المناک احساس کمتری۔ دو اجنبی جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان میں سے ایک فوراً ہی انگریزی کے کچھ الفاظ لڑھکا دیتا ہے تا کہ اسے معقول، مہذب اور تعلیم

یافتہ مان لیا جائے۔ ہم انگریزی تاریخ، انگریزی فلموں، کھیلوں، ناولوں اور لباس سے متاثر تھے۔ ہم اس کا مذاق اڑاتے جو ڈھنگ سے انگریزی نہ بول سکتا۔ غلط اردو بولنا فیشن تھا۔ عید اور جمعہ ایسے تہواروں کے سوا ہم شلوار قمیص سے گریز ہی کرتے۔

سولہ سال کی عمر میں جب میں لاہور کرکٹ ٹیم کا ممبر بنا تو دوسرے کھلاڑیوں کے ساتھ بات کرنے میں مجھے دشواری کا سامنا ہوتا۔ وہ اردو میں تعلیم دینے والے سکولوں سے آئے تھے۔ وہ یکجا ہو کر ہمارا مذاق اڑاتے۔ تب میں خود کو اجنبی محسوس کرتا۔ ہمارے اور ان کے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔ اس سے کہیں زیادہ جو برطانیہ کے امرا اور عام لوگوں میں ہوتی ہے۔ ان کے لطیفے، مزاحیہ جملے، پسندیدہ فلمیں اور دنیا کے بارے میں ان کا نقطہ نظر، سب کچھ ہم سے مختلف تھا۔ تب مجھے احساس ہونے لگا کہ یہ تو دو الگ طبقات ہیں اور باہم ان کی ناپسندیدگی کیسے خطرناک نتائج کو جنم دے سکتی ہے۔ یہ انکشاف بھی ہوا کہ ایچی سن میں کھیل کی بہترین سہولتوں کے باوجود، ہم ان عام سے بچوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں۔ وہ بہت ہی سخت جان تھے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ان میں کہیں زیادہ تھا۔ ہاکی اور سکواش کے سب عظیم ستارے بھی اردو سکولوں سے ابھرے، عالمی افق پر ابھرے اور جگمگاتے رہے۔

پھر مجھے اندازہ ہوا، انہیں بہت جلد احساس ہو جاتا ہے کہ اگر سماجی مرتبہ بڑھانا ہے تو مغربی رکھ رکھاؤ کے انداز سیکھنا ہی پڑیں گے؛ لہٰذا کرکٹ کے کھلاڑیوں کی اکثریت مغربی ملبوسات کی خریداری میں بہت گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرنے لگتی۔ انہیں انگریزی سیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اور وہ بھی ایسی کہ لہجہ بھی انگریزوں جیسا ہو، کچھ ایسے کرکٹر بھی تھے جنہوں نے محض اس لیے شراب پینا شروع کر دی کہ اہل مغرب کو مرغوب ہے اور اشرافیہ کے معمولات میں شامل (حالانکہ 1977ء میں شراب پر پابندی عائد تھی)۔

قومی لباس بھی ایک ثقافتی پہچان ہوتا ہے جسے نوآبادیاتی دور نے برباد کر کے رکھ دیا۔

اپنے لڑکپن میں، مجھے یاد ہے کہ میرے چچا نے میرے ایک کزن کو شلوار قمیص پہنے ہوئے دیکھا تو یہ کہا تھا ''اوئے، تم نے یہ کیا نوکروں والے کپڑے پہن رکھے ہیں۔'' ایک مرتبہ اپنی والدہ کی ایک سہیلی کو میں نے کہتے سنا کہ لگتا ہے فلاں کے پاس اچانک بہت دولت آ گئی ہے کیونکہ اس نے مغربی لباس پہننا شروع کر دیا ہے۔ دس برس گزرنے کے بعد 1988ء میں جب قراقرم میں چند مغربی دوستوں کے ساتھ کوہ نوردی میں مشغول تھا تو مجھے خیال آیا کہ میں بھی اپنے لباس سے غیر ملکی نظر آتا ہوں۔ مقامی لوگ پاکستانی لباس پہنے تھے۔ اچانک یہ خیال بجلی کی طرح ذہن میں لپکا۔ ایک میں ہوں، قومی ہیرو مانا جاتا ہوں، مجھے رول ماڈل سمجھا جاتا ہے، جہاں چلا جاؤں ہزاروں جمع ہو جائیں، پھر بھی لباس میرا غیر ملکیوں جیسا ہے۔ کئی برس بعد جب میں پہلی مرتبہ وزیرستان گیا تو اس وقت بھی مجھے شرمندگی اٹھانا پڑی، قبائلی یہ جانتے ہوئے بھی کہ پشتو مجھے آتی نہیں، پشتو ہی میں بات کرنے پر مصر رہے۔ صرف قبائلی علاقوں کا ہی یہ خاصا ہے کہ وہاں کے لوگ اپنی ثقافت کے اظہار پر اصرار کریں۔ وہ اس فخر سے سرشار رہنے والے لوگ ہیں کہ وہ ناقابل شکست ہیں، کوئی انہیں فتح نہ کر سکا۔ انہیں کسی کی ثقافت سے کچھ بھی مستعار لینے کی ضرورت نہیں۔ استعمار تب فتح یاب ہوتا ہے جب غالب آنے والے احساسِ برتری اور مغلوب احساسِ کمتری کا شکار ہو جائیں۔

سبکدوش سول اور فوجی افسروں میں استعماری روایات کا اب بھی غلبہ ہے۔ اجنبی سرزمینوں کے فرزند، ان اداروں کے معمار تھے۔ پاک فوج کے ایک لیفٹیننٹ جنرل نے مجھ سے کہا: ''عمران، تم شلوار قمیص پہننے پر اس قدر مصر کیوں ہو جب کہ سوٹ میں تم جچتے بہت ہو۔'' ان میں سے بہت سے لوگ شلوار قمیص ہی پسند کریں گے، خاص طور پر موسم گرما کی حدت میں مگر وہ اعتماد سے محروم لوگ ہیں۔ 1990ء کے عشرے میں شوکت خانم ہسپتال میں میرا ایک دفتر تھا، جہاں میں، مارکیٹنگ ٹیم کی کارکردگی کا جائزہ لیا کرتا۔ میں نے دیکھا کہ عطیات دینے

والے اکثر تاجر ہوتے اور شلوار قمیص میں ملبوس۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہماری مارکیٹنگ ٹیم والے بھی ان کی پیروی کریں۔ ٹیم کے ایک ممبر نے کچھ عرصے بعد تقاضا کیا کہ اسے پرانے انداز کی طرف لوٹ جانے کی اجازت دی جائے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اب تاجر اور دوسرے لوگ اس کا ویسا احترام نہیں کرتے۔ یہ بھی کہ جب وہ بڑے دفتروں میں جاتا ہے تو اس قدر اعتماد محسوس نہیں کرتا۔ مشرف کے دور میں یہ رجحان اور بھی بڑھ گیا کہ اس نے مغرب نوازی کو بہت فروغ دیا۔ اب سندھ اور پنجاب کے سیاستدان بھی اس کی تقلید کرنے پر مجبور نظر آئے۔ بہت سے امیدوار پوسٹروں پر چھپنے والی اپنی تصویر کوٹ اور نکٹائی کے ساتھ بنواتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اس طرح ووٹر انہیں کچھ زیادہ اہمیت دیں گے۔

تاریخ کے کسی بھی طالب علم کے لیے، غالب تہذیب کی پیروی کے مناظر اجنبی اور تعجب خیز نہیں۔ اٹلی کے علاقے سسلی نے گیارہویں صدی میں عرب فاتحین سے آزادی چھین لی تھی مگر آئندہ پچاس برس تک اس جزیرے میں عدالتوں کی زبان عربی رہی۔

پاکستان میں انگریزی بولنے والی اشرافیہ ہمیں ہمارے مذہب اور تہذیب سے دور لے گئی۔ ہر چند کسی نے عیسائیت قبول کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی، مگر مغرب سے مسحور ہونے کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ اسلام کو ایک قدامت پسندانہ مذہب خیال کیا جانے لگا، اپنے تمدن ہی کی طرح۔ آخر، وہ جو اکثریت میں تھے، وہ مذہبی تھے تو مفلس بھی۔ کالج اور یونیورسٹی میں اگر کوئی طالب علم نماز پڑھتا نظر آتا یا داڑھی رکھ لیتا تو اسے مولوی کہا جاتا۔ مغربی تعلیم میں سائنس پڑھانے پر زور بہت تھا۔ کہا جاتا کہ ہر وہ چیز اور عقیدہ جو دکھا کر ثابت نہیں کیا جا سکتا، درحقیقت وجود ہی نہیں رکھتا۔ یہ نظریہ مذہب سے متصادم ہے جو غیب پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ مزید برآں 1960ء کے عشرے میں نئی نسل نے پرانی کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور اس کے نتیجے میں وہ مذہب سے بھی دور ہوتی گئی۔ ہم بھی اسی نسل کا حصہ تھے۔ سکول کی تعلیم مکمل کر لینے

کے بعد بھی، جمعہ اور عید کی نمازیں پڑھنے میں اپنے والد کے ساتھ جایا کرتا۔ میرا اور میرے دوستوں کا حال مگر یہ تھا کہ اللہ کا وجود ہمارے لیے مسجد کی چار دیواری تک محدود تھا۔ ہم انگریزی فلمیں دیکھنے والے اس بات پر ایمان لا چکے تھے کہ مغرب بہرحال بالاتر ہے اور اصل اہمیت ٹیکنالوجی کو حاصل ہے۔ اگر اپنے مذہب اور تمدن کا ہمیں بہتر علم ہوتا تو شاید ہم اس طرح للچا کر مغرب کی طرف نہ دیکھا کرتے۔ اس طرح جھک کر اس کی طرف مائل نہ ہو گئے ہوتے۔ مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہمارے علماء مغربی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے۔ مغربی تہذیب سے وہ ناآشنا تھے اور ہماری زبان میں ہم سے بات نہ کر سکتے تھے، ہمیں سمجھا نہ سکتے تھے۔ ثقافتی خلیج نے جو ہمارے اور ان کے درمیان دکھائی نہ دینے والی دیوار کی مانند مگر مضبوط تھی، ہمیں اس اندازِ فکر کی طرف راغب کیا کہ اسلام عہد قدیم کا قرینہ ہے۔ مجھے وہ طالب علم اب بھی یاد ہیں جو ان مولوی صاحبان کا مذاق اڑایا کرتے، جن کی انگریزی ناقص تھی۔

اب بھی، بنیاد پرستی اختیار کرنے والے نوجوانوں سے نالاں اشرافیہ ادراک نہیں کر رہی کہ دو مختلف تعلیمی نصابوں اور نظاموں نے ہمارے لئے کتنی مشکلات کو جنم دیا ہے۔ وہ بجا طور پر مدارس میں اصلاح کی بات تو کرتے ہیں لیکن عام آدمی کے نقطۂ نظر سے صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس پہلو پر وہ غور نہیں کرتے کہ یہ مدارس بے شمار غریب خاندانوں کے لئے جو تعلیم کا واحد ذریعہ ہیں۔ عوام کا احساس یہ ہے کہ وہ ایک اجنبی ثقافت کی نمائندگی کرنے اور استعمار کے وارثوں کو قبول نہیں کر سکتے۔ وہ انہیں مغرب کا ایجنٹ سمجھتے ہیں جو ان کی قومی روایات کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ عالمی اشرافیہ کی تخلیق کا تصور، مختلف ممالک میں مسلسل اور دائمی مداخلت کے مترادف ہے۔ زمینی استعماری قبضے کی جگہ اب ثقافتی استعمار نے لے لی ہے۔ مصنف ٹائٹس برک ہارٹ (Titus Burkhardt) اپنی کتاب فیض، شہر اسلام (Fez, City of Islam) میں اس مسئلے کی نشان دہی باندازِ دگر کرتا ہے۔ مراکش کے اس

تاریخی دیار میں 30 کے عشرے میں وہ مقیم رہا۔ ربع صدی کے بعد جب وہاں سے گزر ہوا تو اس نے لکھا: ”اس وقت مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ جن مردوں کی جوانی تبدیلی کی دست برد سے محفوظ روایتی ماحول میں گزر رہی تھی آج وہ اپنے خاندانوں کے سربراہ تھے۔ ان میں سے بہت سے یہ خیال کرتے ہیں کہ جس تخلیقی وفور نے مسجد قرطبہ اور الحمرا کو جنم دیا تھا وہ یورپی اقتدار کے ذریعے متعارف ہونے والی تمام اہم تبدیلیوں سے کہیں بڑھ کر زندہ اور اصلی محسوس ہوتا ہے۔ اس وقت سے لے کر اب تک، بہرحال، ایک ایسی نسل بھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی ہے جسے بچپن ہی سے یورپ کی بے پناہ خیرہ کن قوت نے اندھا کر دیا ہے، جسے حکمت عملی کے تحت یورپی سکولوں میں تعلیم دلوائی گئی، جس کے باوصف ان کے انداز میں ناقابل عبور احساس برتری نے پنجے گاڑ لیے۔ اب وراثت میں منتقل ہونے والی روایتی زندگی پر جو اپنی تمام تر تنگ دامانی کے باوجود اپنے اندر دائمی اطمینان کا خزانہ سموئے تھی جدید یورپی طرزِ حیات جو واضح طور پر غالب ہے، جس کا مطمحِ نظر فقط مادی برتری کا حصول ہے۔ ہر اس چیز کی تذلیل جس کے ساتھ تقدیس وابستہ ہو، پھر ان دونوں میں ہم آہنگی کیسے ممکن ہے؟ یہ شاندار لوگ جن کا میں ذکر کر رہا ہوں اور جو اب موت کی جانب رواں ہیں، انہیں باہر سے مغلوب کر لیا گیا، مگر اندر سے وہ آزاد ہی رہے۔ دوسری طرف، نوجوان نسل ہے، جس نے مراکش کی آزادی جیت کر چند برس پہلے خارجی طور پر ایک فتح تو حاصل کر لی، لیکن اب اندرونی طور پر تباہی کے خطرے سے دوچار ہے۔“

جھٹکا 1971ء میں لگا۔ 1970ء کے الیکشن میں مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ نے اکثریت حاصل کر لی جو خودمختاری کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اس کے باوجود مغربی پاکستان میں دوسروں سے زیادہ سیٹیں حاصل کرنے والے ذوالفقار علی بھٹو نے اس جماعت کی حکومت کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں، فوجی حکمران یحییٰ خان کی مدد سے۔ مشرقی پاکستان میں

بغاوت کی لہر اٹھی کہ مغربی پاکستان ان کا حق تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ یحییٰ خان نے اختلاف کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے مشرقی پاکستان میں فوج اتار دی۔ وہی فوج، جس کی نگرانی میں بالغ رائے دہی پر مبنی منصفانہ الیکشن ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع ہوئی تو بھٹو کراچی کے ہوائی اڈے پر اترے اور کہا: خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا۔ نتائج تباہ کن تھے۔ ہزاروں افراد قتل کر دیے گئے اور لاکھوں نے بھارت کی طرف ہجرت کی۔ میں پاکستان کی انڈر 19 کرکٹ ٹیم کے ساتھ، ڈھاکہ سے آنے والی آخری پرواز میں واپس آیا۔ جب وہاں ہم کھیل رہے تھے تو نہ صرف تماشائیوں بلکہ مقابل کھلاڑیوں میں بھی مخاصمت کے جذبات آشکار تھے۔ مشرقی پاکستان کی ٹیم کے کپتان اشرف الحق نے، جو بعد میں میرا دوست بن گیا، ایک دن رات کے کھانے پر مجھے ان تلخ احساسات کے بارے میں بتایا جواب چاروں طرف جھلک رہے تھے۔ اس نے کہا: مجھ ایسے لوگ پاکستان سے وابستہ رہنے کے خواہش مند ہیں؛ بشرطیکہ ہمارے حقوق ہمیں دیے جائیں وگرنہ آزادی کی فعال تحریک اٹھ کھڑی ہوگی۔ یہ بات سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ اس لیے کہ ہمیں تو حالات کا اندازہ ہی نہ تھا۔ یہ مغربی پاکستان کے پریس پر سنسر کا نتیجہ تھا۔ اس کے باوجود مجھے اور میرے دوستوں کو یہ خیال نہ آیا کہ ملک ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ پے در پے مغربی پاکستان میں تباہ کن غلطیوں کا ارتکاب ہوا، بھارت کو جن سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ نہرو کی بیٹی اندرا گاندھی نے جواب ہندوستان کی وزیراعظم تھی، فیصلہ کیا کہ باغیوں کی مدد کی جائے۔ 1965ء کی جنگ کے برعکس، اب کی بار آسانی سے ہم ہار گئے۔ ڈھاکہ میں، ہماری فوج نے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کیے اور 90 ہزار افراد کو جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ ہمارا وطن دو حصوں میں بٹا اور بنگلہ دیش کے نام سے ایک نیا ملک وجود میں آ گیا۔ نہرو، قائداعظم کے تصور پاکستان کو تباہ کرنے کے لئے سرگرم رہے مگر ان کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے۔ ان کی بیٹی نے باپ سے کہیں بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ پاکستان اس تصور کی بنیاد

پر وجود میں آیا تھا کہ برصغیر کے تمام مسلمانوں کا گھر ہے۔ 1971ء کی تباہ کن شکست اور توہین کے بعد، ہماری فوج کے دلوں میں جس کی تلخ یادیں زندہ ہیں، اب یہ محض مغربی پاکستانیوں کا وطن ہے۔

تین برس بعد 1974ء میں اشرف الحق سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ 1971ء کے ہنگاموں میں مرنے والوں کی جو تعداد اس نے بتائی، اس پر مجھے دھچکا لگا۔ دونوں طرف سے بتائے گئے اعداد و شمار مختلف ہیں۔ تصدیق کرنا ممکن نہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ لاکھوں مرے اور ان سے زیادہ ہجرت پر مجبور ہوئے۔ اب تک برطانیہ اور بھارت کے لوگوں سے میں بحث کرتا آیا تھا کہ یہ سب پروپیگنڈا ہے، پاکستان اور اس کی فوج کے خلاف۔ اشرف الحق کی باتیں سننے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ سرکاری پروپیگنڈے پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہئے اور اپنے ہی لوگوں کے خلاف فوجی کارروائی کی حمایت سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔

کرکٹ کی زندگی کا آغاز تھا۔ 1971ء کے موسم گرما میں انگلینڈ کے خلاف پاکستان کی طرف سے میں نے پہلا میچ کھیلا۔ سنسر زدہ اخبارات اور سرکاری ٹی وی سے دور، پہلی بار عالمی پریس تک رسائی ہوئی۔ ایک طرف پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کا منظر، دوسری طرف ہم سے منسوب قتل عام۔ بے پناہ صدمہ تھا۔ افواج اور حکومت ہمیں بتاتے رہے کہ آخری سانس تک وہ لڑیں گے۔ شکست سے 24 گھنٹے قبل میرے قبیلے کے جنرل نیازی نے بی بی سی کو انٹرویو دیا کہ آخری آدمی تک وہ مقابلہ کریں گے۔ پھر ہتھیار ڈالنے کا منظر، اذیت سے دوچار کرنے والی پست ہمتی اور قلق لے کر آیا۔ ملک کے مستقبل پر اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ دوسروں کی طرح، میں نے بھی سرکاری پروپیگنڈے پر یقین کر لیا تھا کہ مقابل جنگجو، دہشت گرد، اور بھارت کی پشت پناہی سے بروئے کار آنے والے باغی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم انہیں بھارت کا ایجنٹ ہی سمجھتے تھے۔ یہی اصطلاحات اب قبائلی علاقوں اور بلوچستان کے بارے میں برتی جاتی ہیں۔

تب بھی مسئلے کی جڑ سے نمٹنے کی بجائے ہم مرض کی علامتوں سے برسرِ جنگ رہے۔ ہم پاکستانی عوام کی امنگوں کا ادراک کر سکے اور نہ ان کا احترام۔ اس دکھ سے کئی سال مجھے گزرنا پڑا کہ غیر ملکی میرے وطن کے بارے میں کس طرح سوچتے اور کیا رائے وہ رکھتے ہیں۔ گھر سے بہت دور، میں ایک ڈراؤنے خواب سے جاگ اٹھا تھا، اکیلا، یکسر تنہا اور غیر محفوظ۔ زندگی میں پہلی بار لوگوں کا سامنا کرنے میں دشواری تھی۔

میچ ختم ہونے کے بعد میں وہیں رکا رہا کہ گرائمر سکول میں اپنی تعلیم مکمل کروں۔ مقامی لوگوں میں کوئی دوست بنانا مشکل نظر آیا، تقریباً ناممکن ہی؛ البتہ رشتے کے بھائیوں اور سکول کے بعض ساتھیوں سے تعلق گہرا تھا۔ کسی بھی وقت ایک دوسرے کے گھروں میں ہم جا پہنچتے۔ تعلقات گہرے اور سچے تھے؛ چنانچہ ہر طرح کے حسد اور تلخی سے محفوظ۔ مشکل مگر یہ تھی کہ زیادہ وقت اجنبیوں میں گزرتا۔ ان کے انداز مختلف، جینے کا ڈھنگ اور۔ میں ایک مربوط خاندان میں پلا تھا، جس میں سب ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے۔ انگلینڈ میں ایسی کوئی پائیدار دوستی تب قائم نہ ہو سکی، جیسی کہ پاکستان میں تھیں۔ ماہ و سال گزرنے کے بعد اگرچہ معاملہ کافی بدل گیا۔

1972ء میں اے لیول کی تکمیل کے بعد میں اوکسفرڈ یونیورسٹی میں جا داخل ہوا۔ یہ ایک نئی دنیا تھی، ایک دھماکا خیز مرحلہ۔ جس انگریز کلچر سے ہم واقف تھے۔ اپنے بزرگوں کی سنائی ہوئی داستانوں، انگریزی پڑھانے والے اساتذہ، دوستوں کے مشاہدات، کتابوں اور کہانیوں کے ذریعے وہ اب تحلیل ہونے لگا۔ ایک ہمہ گیر بغاوت نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ جنس زدگی، منشیات اور راک اینڈ رول۔ ملکہ وکٹوریہ (Queen Victoria) کے عہد سے برطانوی معاشرے میں جس اخلاقیات کا چرچا اور لگن تھی، ہماری پہلی نسل میں جس کا ذکر رہا کرتا، نہایت تیزی کے ساتھ وہ مٹتی جا رہی تھیں اور اب انہیں منافقت قرار دیا جاتا۔

معاشرے پر بری طرح اثر انداز ہونے والی فلمیں اور مقبولِ عام گلوکار جنسی آزادروی، منشیات اور اخلاقی بندھن توڑ دینے کی تعلیم دے رہے تھے۔ قسم کھانا فیشن بن گیا اور پارسائی اور شرم و حیا کو دقیانوسی خیال کیا جانے لگا۔ سب سے بڑا حملہ وجودِ باری تعالیٰ اور مذہب پر تھا۔ پاکستان کا انگریزی خواں طبقہ مذہب کو قدامت پسندی قرار دیتا۔ برسرِ عام مگر اس طرح کے حملے کی جرأت اس میں کبھی نہ ہو سکی۔ ان میں سے اکثر مذہبی رسوم بجا لاتے اور خود کو مذہبی ہی سمجھتے۔ برطانیہ میں مذہب مگر مذاق اور تمسخر کا نشانہ ہو گیا۔ اس دور میں بننے والی کئی فلموں مثلاً ''مانٹی پیتھنز فلائنگ سرکس'' (Monty Python's Flying Circus) اور ''دی لائف آف برین'' (The Life of Brian) میں پادریوں اور راہباؤں کو جنسی مریض دکھایا گیا۔ مک جیگر (Mick Jagger) اور ڈیوڈ بوئی (David Bowie) ایسے کردار مثالی ہو گئے۔ مارکسزم کے ماننے والوں کی طرح مذہب کو مسترد کیا جانے لگا۔ ڈارون (Darwin) کے نظریہ ارتقاء سے لے کر نطشے (Neitzsche) کے نعرے تک کہ نعوذ باللہ خدا کا وجود ختم ہو چکا، کیسا کیسا مسخرہ پن۔ نئی نسل اس انداز میں سوچنے لگی کہ مذہب قدیم آدمی کا ورثہ ہے، ابتدائے آدمیت کا۔ انسان اب اس سے آگے بڑھ آیا ہے۔ فرائڈ کی تعلیم یہ تھی کہ خدا آدمی کی نفسیاتی ضرورت ہے؛ لہٰذا اس نے خود اس کا وجود تخلیق کیا ہے جبکہ جنگ (Jung) کہتا تھا ''مذہب خبط کا نعم البدل ہے۔'' یونیورسٹی میں ''روحانیت'' کا اگر وجود تھا تو ہپی لوگوں کی صورت میں لیکن ان کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ نشے میں دھت رہتے اور ان کی زندگی آزادانہ جنسی اختلاط سے عبارت تھی۔

اللہ تعالیٰ پر میرا جو کچھ تھوڑا سا اعتقاد بچ رہا تھا، اس ماحول میں وہ کمزور تر ہونے لگا۔ جو کچھ میں بچا سکا وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے میری بنیادی شناخت تھی؛ اگرچہ اس کا تعلق اسلام کی تعلیمات سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ شراب کو میں نے کبھی ہاتھ نہ لگایا مگر مذہبی احساس کے

سبب نہیں بلکہ اس لیے کہ میرا خالہ زاد بھائی ماجد خان میرا ہیرو تھا۔ وہ ان چیزوں سے یکسر گریز کیا کرتا اور میں اس جیسا بن جانے کا آرزومند تھا۔ اس دور میں میرا عقیدہ کیا تھا؟ کس طرح میں اسے بیان کروں؟ بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نہ تو کسی چیز کو قبول کرتا اور نہ کسی کو مسترد۔ میرا اسلام اتنا ہی تھا کہ کبھی کبھار مسجد چلا جایا کرتا اور وہ بھی لاہور میں۔ روزے بھی میں لاہور ہی میں رکھا کرتا۔ مسجد کے باہر میری زندگی سے باری تعالیٰ کا کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ میری ماں بہت پریشان ہوئیں۔ روحانیت ان کے شب و روز اور رگ رگ میں تھی۔ وہ مجھے قرآن کریم پڑھنے کی تلقین کرتیں کہ اسے سمجھ پاؤں اور رہنمائی حاصل کروں۔ ان سے میری محبت مجھے آمادہ کرتی۔ کوشش میں کرتا لیکن پھر کنارہ کش ہو جاتا۔ بہت بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ میرے اس طرزِ عمل کا سبب کیا تھا۔

اوکسفرڈ میں سرما کا پہلا موسم عذاب بن کر اترا، سیاہ، سرد اور نم۔ ویران موسم میرے دل میں لاہور کی یادوں کا ہجوم لے کر آتا۔ ساری دنیا میں لاہور کے گلابی جاڑوں سے زیادہ مہربان موسم کوئی نہیں۔ سورج کی سنہری کرنوں سے دمکتے دن اور سرد راتیں، جب آپ آتش دان کے سامنے آسودہ ہو جاتے ہیں۔ اپنی ماں کو میں کبھی نہ بتاتا کہ میں ناخوش و بیزار ہوں۔ ایک لفظ بھی اس بارے میں لکھا نہ تھا ایک خط کو پڑھتے ہوئے اس کے دل نے مگر نہ جانے کیسے جان لیا۔ ممتا کی اس ماری نے مجھے لکھا: فوراً گھر لوٹ آؤ۔ ان کے پیار کی شدت نے یہ کہنے پر انہیں مجبور کر دیا: لوٹ آؤ، اپنی تعلیم بعد میں مکمل کر لینا اور اگر نہ چاہو تو مت پڑھنا۔ ایسا بھی یہ ضروری نہیں۔ اس محبت نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے حوصلہ عطا کیا اور وہ احساس تحفظ دیا کہ میں ایک بھرپور زندگی جی سکا۔ ان کی الفت نے، اپنے فرزند پر ان کے کامل بھروسے نے مجھے عزتِ نفس کا شعور بخشا، جو کامیاب زندگی کا لازمہ ہے۔ ان انگریز طلبا کے مقابلے میں، کس قدر میں خوش قسمت تھا، جو دباؤ کا شکار رہتے کہ جلد از جلد تعلیم مکمل کرنے کے بعد فوراً ہی ملازمت تلاش

کریں۔ ان میں سے اکثر پہلے ہی والدین کے گھر چھوڑ آئے تھے۔ ہم پاکستانیوں کے لیے تو یہ تصور ہی اذیت ناک ہوتا۔ ہمارے رشتے اور طرح کے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کو گھر سے کیسے نکال سکتا ہے۔ کوئی بیٹا اپنے والدین سے جدا کیسے ہو۔ بڑھاپے میں اسے ان کی نگہداشت کرنا ہے۔ یہ ایک روحانی عمل ہے، محض اخلاقی فریضہ نہیں۔ شاید یہ کوئی اتفاق نہیں کہ اوکسفرڈ میں میرا بہترین دوست ایک ہندوستانی تھا، وکرم مہتا۔ میری طرح وہ بھی ایک قدامت پسند خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ میری طرح اس نے ایک انگریزی سکول میں تعلیم پائی تھی۔ ہم تین آدمی قریب آ گئے۔ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی بے نظیر بھٹو، میں اور وکرم۔ صرف اس لیے نہیں کہ ہمارا ایک ہی پس منظر تھا بلکہ اس لیے بھی کہ ہمارے مضامین بھی ایک تھے۔ ہم سب اقتصادیات اور پولیٹیکل سائنس کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ ہر اتوار کو لیڈی مارگریٹ (Lady Margaret) ہال میں، ہم بے نظیر سے ملنے جایا کرتے۔ سہ پہر کو دوسرے لوگ بھی اس سے ملنے آتے اور ضیافت اڑایا کرتے۔ وہ انہیں پنیر اور سینڈوچ پیش کرتی۔ بے نظیر تب بھی ویسے ہی خواب دیکھا کرتی۔ جیسے کہ بعد کے ادوار میں۔ وہ یونیورسٹی یونین کی صدارت حاصل کرنے کے عزم سے سرشار تھی۔ ہم دونوں، مجھے اور وکرم کو اس الیکشن سے کوئی دلچسپی ہرگز نہ تھی مگر ہم بے نظیر کی تائید ہی کرتے۔ میرے ساتھ اوکسفرڈ کی کرکٹ ٹیم میں شامل ایک دوست ڈیوڈ فرن، ٹونی بلیئر کے ساتھ ایک ہی فلیٹ میں رہا کرتا، جو بعد میں برطانیہ کے وزیراعظم بنے۔ مدتوں بعد اسلام آباد کی ایک سفارتی تقریب میں ٹونی بلیئر نے مجھ سے کہا: "جناب، تب آپ کو ہماری کوئی پرواہ ہی نہ تھی۔"

یونیورسٹی میں تعلیم کی تکمیل کے بعد سرما کا موسم لاہور اور گرما کے دن میں برطانیہ میں گزارا کرتا، جہاں میں سارا وقت کرکٹ کھیلنے میں صرف کرتا۔ پاکستان میں خوش قسمتی سے اب ایسے لوگوں سے میری ملاقاتیں ہوئیں جو اللہ پر پختہ ایمان رکھنے والے تھے۔ عام آدمی کی زندگی

میں تو اللہ کا وجود جاری وساری تھا ہی۔ ہمیشہ اگرچہ وہ اسلامی احکام کی پابندی نہ کرتے مگر وہ ان کا رب تھا اور وہ اس کو مانتے تھے۔ خطائیں ان سے سرزد ہوتیں مگر وہ شرمسار ہو کر اس کے سامنے جھک جاتے اور توبہ کرتے۔ مصائب آتے تو اللہ کی رضا مان کر صبر کرنے کی کوشش کرتے۔ کبھی کبھار میں سوچتا: ایک اعتبار سے مارکسزم کے ماننے والے درست ہی کہتے ہیں، بعض لوگوں کے لیے مذہب افیون بن جاتا ہے، عمل نہیں، فرار کا راستہ۔ پاکستان میں نظر دوڑائیں تو مذہب اور روحانیت ہر جگہ کار فرما ہے، لیکن انگلینڈ میں روحانیت سے لگاؤ رکھنے والے چند ہی لوگ مجھے یاد ہیں۔ ان میں سے ایک تو انڈریو وینگ فیلڈ ڈگبی (Andrew Wingfield-Digby) جو اوکسفرڈ کی ٹیم میں میرے ساتھ تھا اور بعد میں پادری بن گیا تھا، اور برطانوی کرکٹ ٹیم کا وکٹ کیپر ایلن ناٹ (Alan Knott)۔

ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ ہمیشہ مجھے یاد رہے گا۔ 1978ء میں ایلن ناٹ بھی کیری پیکر (Kerry Packer) کی اس عالمی الیون کا حصہ تھا، میں بھی جس میں شامل رہا۔ ایک میچ کے بعد ہم اس سوال پر بحث کرتے رہے کہ انعامی رقم کس طرح بانٹی جائے۔ کھیلنے والے بارہ کھلاڑیوں میں برابر برابر؟ یا ان چھ عدد ساتھیوں کو بھی شریک کر لیا جائے، جو اس روز شامل نہ ہوئے کہ کہیں اور کھیل رہے تھے؛ اگرچہ ٹیم کا حصہ تو تھے۔ کچھ دیر کی بحث کے بعد ہم نے طے کر لیا کہ یہ صرف ان کا حق ہے جو سخت مقابلے میں شامل تھے۔ ناٹ کو اس پر بہت صدمہ ہوا۔ اس نے کہا: یہ تو لالچ ہے، نرا لالچ۔ آخر وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ ہم ان کے ساتھ صریح ناانصافی کے مرتکب ہیں۔ اس کا رویہ ایسا مضبوط تھا۔ اتنی اس کی عزت تھی کہ ہم سب شرمندہ ہوئے اور انعام کی رقم میں اپنے ان ساتھیوں کو شریک کر لیا، جنہیں ابھی کچھ دیر پہلے ہم بھلا دینے پر تلے تھے۔

برطانیہ میں جب میں اپنی زندگی سنوارنے اور ترتیب دینے کی کوشش میں لگا تھا تو میرا وطن بھی تبدیلی کے عمل سے دوچار تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو اگرچہ خود بھی مشرقی پاکستان کی علیحدگی

کے لیے ایک حد تک قصوروار تھے لیکن اب وہ اقتدار میں تھے۔ حکومت سنبھالنے کے بعد انہوں نے اپنی کرشماتی شخصیت کا سارا زور ملک کا وقار بحال کرنے پر صرف کر دیا۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار، ایک حاکم نے عام آدمی سے کہا کہ اس کی بھی کوئی حیثیت ہے۔ فوجی اور سول اشرافیہ کے برعکس جو اجنبیوں جیسی سرد مہری کے ساتھ عام آدمی کے ساتھ پیش آتی، بھٹو کا رویہ گرمجوشی پر مبنی تھا۔ 1965ء میں بھٹو نے کشمیر کے موضوع پر سلامتی کونسل سے خطاب کیا تو مجھے ان پر فخر کا احساس ہوا تھا۔ جب انہوں نے کہا تھا: اگر ضرورت پڑی تو بھارت سے ایک ہزار سال تک لڑیں گے۔ اب..... وہ ایک آزاد آدمی کی طرح مغرب سے بات کرتے نظر آئے اور یہ اچھا محسوس ہوتا۔ اس کے باوجود بھٹو کی غیر معمولی ذہانت اور کرشماتی شخصیت بھی پاکستان کو دلدل سے نکال نہ سکی۔ ان کی بے ربط اور بے مہار قوم پرستی نے معیشت کو تباہ کر دیا۔ ان کی جاگیردارانہ ذہنیت نے، جو اختلاف رائے برداشت ہی نہ کر سکتی، جمہوریت کو مزید نقصان پہنچایا۔ ان کے دور کا ایک بے حد تباہ کن فیصلہ مگر 1972ء میں تمام نجی سکولوں کو سرکاری تحویل میں لینا تھا۔

آخر کار تو یہ آشکار ہو گیا کہ جناب بھٹو، اس ملک گیر جماعت، پاکستان پیپلز پارٹی کو محض اپنی ذات کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ عوام کو اختیار سونپ دینے کا وعدہ وہ بھول چکے تھے۔ اپوزیشن ان کے خلاف متحد ہو گئی۔ 1977ء کا الیکشن ہوا تو ان پر بڑے پیمانے کی دھاندلی کا الزام لگا۔ احتجاجی مظاہرے برپا ہوئے تو سنگ دلی سے کچل دیے گئے۔ مذہبی جماعتوں کے دباؤ سے نجات پانے کے لیے بھٹو نے آخری حربہ یہ اختیار کیا کہ الکحل، قمار بازی اور شبینہ کلبوں پر پابندی لگا دی۔

اس کے باوجود احتجاجی مظاہرے بڑھے اور فساد میں بدل گئے۔ اب ان پر قابو پانے کے لیے فوج بلائی گئی۔ بالآخر مارشل لاء نافذ ہوا اور گیارہ سال کے لیے ایک جنرل حکمران بن

گیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے بے پناہ مقبول لیڈر کو ایک شب اقتدار سے بندوق کے زور پر الگ کر دیا۔ اگلے برس 1978ء میں وہ پاکستان کے صدر بن بیٹھے اور 1979ء میں سابق وزیر اعظم کو پھانسی دے دی۔ یہ سانحہ ہوا تو میں سری لنکا میں کرکٹ کھیل رہا تھا۔ صدمہ ہوا، بے حد شدید صدمہ۔ غلطیاں انہوں نے بہت کی تھیں مگر پھانسی؟ ناقابل قبول! مزید بحران ابھی باقی تھے۔ 1979ء کا سال بعض اعتبار سے تاریخ ساز تھا۔ مغرب زدہ رضا شاہ پہلوی کو خمینی کے اسلامی انقلاب نے چلتا کیا۔ اس برس کے آخری دن تھے کہ روسی افواج افغانستان میں داخل ہوئیں۔ اب ایک طویل مدت کے لئے پاکستان بھی مغرب کا حلیف تھا۔ خاص طور پر امریکہ بہادر کا، جس کے سائے میں کبھی کوئی ملک خودمختار نہ رہ سکا۔

باب دوم

اللہ جانے اب کیا ہو گا؟

سچی بات یہ ہے کہ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں سیاست سے قطعاً مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ 1975ء میں اوکسفرڈ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد مدتوں کرکٹ اس طرح میرے ذہن پہ سوار تھی کہ میں کسی دوسری چیز کے بارے میں سوچتا ہی نہ تھا۔ بین الاقوامی مقابلوں کے میدان میں اترنے والا ہر پیشہ ور کھلاڑی جانتا ہے کہ کھیل کس طرح پوری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے۔ آدمی اسی میں جیتا ہے۔ مقابلہ بہت سخت ہوتا ہے؛ چنانچہ کھیل تمام تر غور و فکر، توجہ اور جدوجہد کا مرکز و محور ہو جاتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے نے مجھے یہ بتایا کہ جسے جینئس یا نابغۂ روزگار کہا جاتا ہے، وہ ایسا آدمی ہوتا ہے جو دیوانگی کی حد تک اپنے کام سے عشق کرے۔ ان حالات میں، میرا دھیان کبھی اس طرف نہ گیا کہ ملک پر جنرل محمد ضیاء الحق کی فوجی حکومت کے اثرات کیا ہیں، بتدریج صنعتوں کی نجکاری کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے اور ہمسایہ ممالک ایران اور افغانستان میں کیسے کیسے ہنگامے برپا ہیں؟ عام آدمی کے لیے زندگی معمول کی تھی۔ صرف جنرل ضیاء الحق کے حریف ہی ان کے اقتدار کا مزہ چکھ رہے تھے۔ کرکٹ ٹیم کے کپتان کی حیثیت

سے، جنرل کے ساتھ میرے مراسم بہت اچھے تھے۔ جب کوئی میچ جیت جاتے تو جنرل فون پر مجھ سے بات کرتا۔ 1987ء میں اس نے مجھ سے ٹیلی ویژن پر اپیل کی کہ قوم کی خاطر میں ریٹائرمنٹ کا فیصلہ واپس لوں۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ جنرل کا اقتدار ختم ہو جانے کے بعد ہی مجھے اس دور کے تباہ کن اثرات کا اندازہ ہوا۔ دوسروں کی طرح اس کی سب سے بڑی ترجیح بھی اپنا اقتدار بچائے رکھنا تھی۔ تباہ کن پالیسیوں کے عواقب ونتائج کی پروا اسے نہیں تھی۔

اس وقت جب ملک کا سیاسی اور سماجی پیرہن ادھڑ رہا تھا، پاکستانی عوام کرکٹ میں قومی کامیابیوں سے آسودہ ہوتے۔ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں پاکستان کی قومی کرکٹ ٹیم بتدریج طاقتور ہوتی گئی۔ ہم اپنے سابق استعماری آقاؤں کے مقابل پورے قد سے کھڑے ہو سکتے تھے۔ پاکستان، بھارت اور ویسٹ انڈیز ایسے ممالک جب برطانیہ کے مقابل میدان میں اترتے تو یہ غلامی کا قرض چکانے کا ایک موقع بھی ہوتا۔ کرکٹ کی دنیا میں میرے دو عزیز دوست، ویسٹ انڈیز کے سر ویون رچرڈز (Sir Vivian Richards) اور بھارت کے سنیل گواسکر (Sunil Gavaskar) اسی انداز میں سوچتے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ 1970ء اور 1980ء کی دہائیوں میں انگریز کا مقابلہ کرنے کی تمنا، ویسٹ انڈیز کی ٹیم میں سب سے بڑی قوتِ متحرکہ تھی۔ ویون رچرڈز کے انداز میں خاص طور پر عزتِ نفس اور قومی وقار کی بحالی کا جذبہ بروئے کار تھا۔ وہ چیزیں جو استعمار اپنے غلاموں سے چھین لیتا ہے۔

فقط کھیل ہی آزادیٔ اظہار کا واحد ذریعہ نہ تھا۔ مجھے احساس تھا کہ انقلابِ ایران نے مسلم دنیا کا اندازِ فکر بدل ڈالا ہے۔ محکوم دنیا میں ذہنی انقلاب کا فیصلہ کن مرحلہ وہ تھا جب 27 دسمبر 1979ء کو سویت افواج افغانستان میں داخل ہوئیں اور پاکستان سرخ افواج کے مقابل فرنٹ لائن سٹیٹ بن گیا۔ ہم میں سے چند ہی لوگ اندازہ کر سکے کہ یہ واقعہ عالمِ اسلام اور دنیا کو کتنا بدل دے گا۔ 1974ء میں مجھے ایران جانے کا موقع ملا تھا، جب میں نے گرامر سکول

کی تعلیم کے دوران بننے والے ایک دوست کے ساتھ چند دن وہاں گزارے۔ امیر اور غریب کے غیر معمولی فرق اور منی اسکرٹ پہن کر بازاروں میں گھومنے والی ایرانی خواتین نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ آج کا کراچی اور لاہور بھی اسی طرح کے ہوتے جا رہے ہیں۔ مہنگے اور زرق برق ملبوسات پہنے امیر طبقے کی خواتین ان مردوں کے ساتھ ہنگامہ خیز تقریبات کا رُخ کرتی ہیں، جن کے انداز ہمارے معاشرے سے یکسر مختلف ہیں۔ ایران کے اس سفر سے پہلے میں نے کسی مسلم ملک میں لوگوں کو اس قدر مغرب زدہ اور اپنی تہذیبی اقدار سے اس قدر بے نیاز نہ پایا تھا۔ مجھے صدمہ ہوا۔ خوانچوں اور ریڑھیوں پر کھڑے عام ایرانیوں کے وہ تاثرات مجھے یاد آتے ہیں، جوان خواتین کو دیکھ کر بے ساختہ ان کے چہروں پر امنڈ آتے۔ چند برس بعد ایرانی تاجروں کو خمینی کے اسلامی انقلاب میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔ وہ روایتی انداز کے مسلمان تھے اور شاہِ ایران سے نفرت کرتے تھے۔ مغرب کا یہ کارندہ اپنے ملک کو اس کے تہذیبی رنگ میں ڈھال دینے پر تلا ہوا تھا۔ بالکل برعکس پاکستان میں مجھ ایسے مغرب زدہ لوگوں کا طریق مختلف تھا۔ ہم جب دیہی علاقوں حتیٰ کہ پرانے لاہور کا رخ بھی کرتے تو مقامی رسم و رواج کا احترام ملحوظ رکھتے۔ ہماری خواتین چادر اوڑھ لیتیں اور بعض تو برقعہ بھی۔ میری والدہ سر ڈھانپے بغیر کبھی بازار نہ جاتیں۔ پاکستانی خواتین اب بھی شلوار قمیص پہنتی اور دوپٹہ اوڑھتی ہیں۔ حال ہی میں کچھ مغرب زدہ عورتوں نے جینز پہننا شروع کی ہے۔

انقلابِ ایران ایک اعتبار سے رضا شاہ کبیر کی مغربیت اور سیکولرازم کا ردِعمل بھی تھا۔ 1925ء سے اس وقت تک وہ ایران پر مسلّط رہا، جب بالآخر اسے فرار ہونا پڑا۔ پھر اس کے فرزند رضا شاہ پہلوی نے اقتدار سنبھالا، ایک ظالم اور سخت گیر آمر۔ 1953ء میں وزیراعظم محمد مصدق کی بغاوت کے بعد امریکہ نے جسے بچایا اور اس کے بعد وہ انکل سام کا دست نگر بن کر رہا۔ رضا شاہ کے سماجی اور معاشی اقدامات نے غریب لوگوں، مذہبی طبقے اور عام تاجروں کو

ناراض کر دیا۔ تیل کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافے نے ایک بہت طاقتور امیر طبقے کو جنم دیا۔ عام لوگ اس کے اطوار سے نالاں تھے۔ دیہات سے بے شمار مفلس لوگ شہروں کی طرف لپکے کہ پٹرول سے حاصل ہونے والی دولت میں سے اپنا حصّہ وصول کرنے کی کوشش کریں، مگر وہ نامُراد رہے۔ بے روزگاری ان کی منتظر تھی اور کچی آبادیوں میں مقیم، وہ اس چکا چوند کا بے بسی سے نظارہ کرتے رہے، جو فراواں دولت اپنے ساتھ لائی تھی۔ خمینی کے انقلاب نے عام آدمی سے وعدہ کیا کہ وہ اسے شریکِ اقتدار کرے گا اور ملک میں مذہبی آزادی بحال کر دی جائے گی۔ 1979ء میں تہران کے واقعات نے دنیا پر اسلام کے انقلابی اثرات کو آشکار کر دیا، یہ بھی کہ وہ تہ و بالا کرنے کی کیسی صلاحیت رکھتا ہے۔ عالمِ اسلام کے تمام ممالک میں عام لوگوں نے اس انقلاب کا خیر مقدم کیا، جن پر ان کی تہذیبی روایات سے بے نیاز، ظالم اور مغرب نواز حکمران مسلّط تھے۔ 2011ء کے مشرقِ وسطیٰ میں اٹھنے والی عوامی لہر ایک اعتبار سے اسی اندازِ فکر کا تسلسل ہے۔

پاکستان میں جوش و خروش بہت تھا، گرما کی چھٹیوں میں، جب میں وطن لوٹتا تو دیکھ سکتا۔ آزادی کے بعد سے ہم چار عدد نظام بھگت چکے تھے۔ پارلیمانی نظام، ایوب خان کی بنیادی جمہوریت، مارشل لا اور لبرل اقتصادی نظام۔ اب خمینی ہمارے سامنے تھا، اسلام کا نام لیوا اور مغرب کا مدِ مقابل۔ ایران کے اسلامی انقلاب نے مشرقِ وسطیٰ کی بادشاہتوں سے پیدا ہونے والے چیلنج کا ایک جواب فراہم کیا۔ سوشلزم ناکام ہو چکا تھا اور کمیونزم ان معاشروں کو ہرگز گوارا نہ تھا جن کی بنیاد میں مذہبی عقائد رچے بسے تھے۔ ایرانیوں کا نعرہ یہ تھا "مشرق نہ مغرب"، ایک نئی راہ خمینی نے نکالی تھی۔ اسے مغرب کے سیکولرازم سے واسطہ تھا اور نہ سوویت یونین کے کمیونزم سے۔ اس نے ایک ایسا نظریہ پیش کیا، جسے عالمِ اسلام قبول کر سکتا تھا۔

مغرب خوف زدہ تھا کہ عالمِ اسلام ایک نئی راہ پہ گامزن ہو سکتا ہے۔ عرب ممالک میں

مغرب نواز حکومتیں اب خطرے سے دوچار تھیں، جن کے شاہی خاندانوں پر خمینی نے برملا تنقید کی۔ مغرب نے عالمِ اسلام کے آمروں کی طرف سے صرفِ نظر کرنے کا فیصلہ کیا جو آزاد دنیا کو بچانے کے نام پر کمیونزم کی مخالفت کرتے تھے۔ مخالف سیاسی تحریکوں پر یہ آمر اس جواز کے ساتھ ظلم ڈھاتے کہ وہ بنیاد پرستی کا مقابلہ فرما رہے ہیں۔ نائن الیون کے حملوں نے آمروں کی سرپرستی کے مغربی اندازِ فکر کو اور بھی قوت بخشی۔ اسی مرحلے پر مغرب نے این جی اوز کے ذریعے عالمِ اسلام پر یلغار شروع کی کہ خواتین کے حقوق اور بنیادی انسانی آزادیوں کے نام پر سیکولرازم کو فروغ دے۔ جب بھی کسی مسلمان ملک میں احتجاج کی لہر اٹھتی ہے، مغرب میں ایرانی اور اسلامی انقلاب کا خوف جاگ اٹھتا ہے۔ حال ہی میں مصر، تیونس اور لیبیا کے عوام نے جب اپنے آمروں کو مار بھگایا تو یہی ہوا۔ یمن اور بحرین کے حکمرانوں کی مغرب نے اس لیے مدد کی کہ وہ ان کے حامی ہیں۔

جنرل ضیاء الحق نے، جو اپنی حکومت کو جواز فراہم کرنے کے لیے بے تاب تھے، ایرانی انقلاب کے اثرات کا اندازہ لگایا اور اس سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے پیش رو، برکلے اور اوکسفرڈ کے تعلیم یافتہ ذوالفقار علی بھٹو نے بھی مذہب کا نام اپنے سیکولر تاثر کو متوازن بنانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس لیے بھی کہ وہ مطعون کرنے والی مذہبی جماعتوں کا مقابلہ کر سکیں۔ 1973ء کے آئین نے اسلامی جمہوریہ کی حیثیت سے پاکستان کی شناخت تسلیم کرا لی۔ تعلیمی اداروں میں اسلامی تعلیم کی اہمیت کو مان لیا گیا اور مذہب کے مطابق قانون سازی کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی۔ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ انہوں نے تسلیم کر لیا، مگر اس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ نکلا کہ اسلامی قوانین کے لیے حریف مذہبی جماعتوں کے تقاضے بڑھ گئے۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے بھٹو کی مخالف مذہبی جماعتوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو سیکولرازم کو لادینیت قرار دیتی تھیں۔ وہ بھٹو سے بہت آگے جانے کو تیار تھا۔ اس نے

اوپر بائیں جانب: میرے خاندان کے لیے ایک باعثِ فخر لمحہ: جب میرے نانا، احمد حسن خان (دائیں سے دوسرے) نے 1946ء میں جالندھر، (انڈیا) میں قائداعظم کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔
نیچے بائیں جانب: لاہور میں 1982ء میں اپنی دادی اماں کے ساتھ۔ وہ سو برس تک زندہ رہیں۔
نیچے دائیں جانب: لاہور میں اپنے والد اور والدہ کے ساتھ۔

اوپر بائیں جانب: اپنی ڈیڑھ سالہ بہن روبینہ کے ساتھ (لاہور 1958ء)۔
اوپر دائیں جانب: اپنی بہنوں نورین اور روبینہ کے ساتھ لاہور میں۔
دائیں طرف: زمان پارک، لاہور میں میرا آبائی گھر۔

اعلان کیا کہ اگر وہ ریفرنڈم جیت لے تو پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنا دے گا۔ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں اس کا تصور یہ تھا کہ انگریزوں کے نافذ کردہ ضابطہ فوجداری میں بعض ترامیم کردی جائیں۔

ایران کے اسلامی انقلاب سے متاثر، معیشت اور تعلیم کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے 1979ء میں اس نے کچھ اصلاحات متعارف کرائیں۔ جنرل نے سود سے پاک بینکاری اور بینکوں میں جمع رقم پر زکوٰۃ وصول کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ حدود آرڈی نینس کے تحت جرائم کی سخت اسلامی سزائیں رائج کردی گئیں جن میں بدکاری کا جرم بھی شامل تھا۔ پولیس اور نچلی عدالتوں نے اس قانون کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے کتنی ہی غریب خواتین کی زندگیاں برباد کردیں۔ قوانین ضیاء الحق نے بہت بنائے، مگر سماجی انصاف کے اسلامی تصور کو اس نے فروغ نہ دیا۔ بدعنوانی اور عدم مساوات فروغ پاتی رہی۔ اسلامی قوانین کی یہ مہم درحقیقت قوم کے جذبات اور حالات سے فائدہ اٹھانے کی ایک کوشش تھی۔

جنرل ضیاء الحق نے اسلامی عبادات کو بھی فروغ دیا، شلوار قمیص کی حوصلہ افزائی کی۔ برسوں بعد جنرل پرویز مشرف نے انگریزی اور مغربی لباس کو رواج دے کر ملک کو "جدید تر" بنانے کی کوشش کی۔ جنرل ضیاء الحق کی مذہبیت اور پرویز مشرف کا سیکولرازم دونوں ناکام رہے۔ لوگ نئے رواج اختیار کر لیتے ہیں مگر باطن میں وہی کچھ رہتے ہیں۔ دونوں آمر یہ بات سمجھ نہ سکے کہ محض ظاہری عبادات سے لوگ روحانیت حاصل نہ کریں گے، نکٹائی باندھ لینے سے اکیسویں صدی میں وہ داخل نہ ہوجائیں گے۔

افغانستان میں سوویت یونین کی فوجی مداخلت سے جنرل محمد ضیاء الحق کا اسلامائزیشن پروگرام دوسرے مرحلے میں داخل ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مغرب کا نیا اتحادی بھی تھا۔ انہی دنوں یہ کہا جانے لگا کہ پاکستان پر حکومت کرنے کے لیے تین اے (A) کی تائید ضروری ہے۔

بائیں جانب:
لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہے۔

نیچے: نہرو (بائیں) اور جناح (دائیں) لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ان کے کونسلر لارڈ اسمے کے ساتھ انڈیا سے برطانیہ کے انخلا اور برصغیر کی دو الگ الگ اقوام میں تقسیم پر بات چیت کرتے ہوئے۔

سب سے نیچے: تقسیمِ ہند انسانی صعوبتوں کی ایک عظیم مثال تھی جس کے نتیجے میں سرحد کے دونوں طرف ہزاروں انسانوں کا قتلِ عام ہوا۔ اس تصویر میں مسلمانوں کو لے جانے والی کھچا کھچ بھری ٹرینیں پاکستان کی طرف گامزن ہیں۔

بائیں جانب:
ہوئی گرماگرمی جو جنگ میں بدل گئی۔ یہ بھارتی جیپ لاہور کے مضافات میں لڑائی کے دوران ہمارے فوجیوں کے قبضے میں آئی تھی۔ میں اُن دنوں لاہور میں تھا۔ تب میری عمر صرف 13 برس تھی لیکن میں اُس زمانے میں بھی اپنے وطن کی خاطر لڑنے کیلئے تیار رہتا تھا۔

نیچے، بائیں جانب اوپر سے ترتیب وار:
پاکستانی رہنما: صدر ایوب خان 69-1958، صدر یحییٰ خان 71-1969، صدر ضیاء 88-1978، جنھوں نے ذوالفقار علی بھٹو 73-1971، کی عوامی حکومت کا تختہ الٹا۔

اوپر: پاکستان کی شمالی سرحد پر واقع قبائلی علاقہ جات وہ جگہیں ہیں جہاں مجھے ہمیشہ خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ یہاں ہر شخص مسلح تھا حتی کہ نوعمر لڑکے بھی۔

اوپر: افغان پناہ گزین اپنے ملک پر 1979ء میں سوویت افواج کے قبضے کے دوران ہونے والی لڑائی سے جان بچاکر بھاگ رہے ہیں۔ پاکستان نے انھیں پناہ دی۔

مرکزی تصویر: ہنزہ وادی، ملک کے دور دراز شمالی علاقہ جات کا ایک مسحور کن مقام۔ مجھے ہمیشہ سے کوہساروں میں سکون محسوس ہوا۔

نیچے: سر جمی گولڈ سمتھ اور اپنے میزبان دوست سابق سینیٹر فریداللہ خان کے ساتھ جو جنوبی وزیرستان میں اپنے وزیری قبیلے کے سربراہ تھے۔ جنھیں 2005ء میں طالبان نے قتل کردیا۔

اوپر: آنجسٹن (برطانیہ)، 1982ء میں پاکستان کی طرف سے برطانیہ کے خلاف باؤلنگ کرتے ہوئے۔

اوپر دائیں جانب: لارڈز (Lord's)، 1987ء برطانیہ کے خلاف ''ریسٹ آف دی ورلڈ XI'' میں کھیلتے ہوئے۔

دائیں جانب اور نیچے: کچھ سخت میچز کے بعد، جن میں پاکستانیوں کو بھی ہماری جیت کا یقین نہ تھا، پاکستان نے 1992ء کے ورلڈ کپ (آسٹریلیا) میں فتح حاصل کی۔ میں نے سارا ٹورنامنٹ اپنے کندھے کے پھٹے ہوئے مسل (Muscle) کے ساتھ کھیلا۔
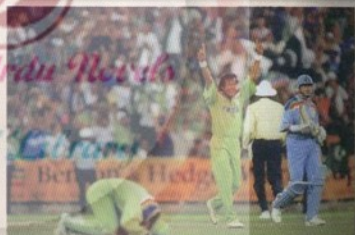
اوپر: 1964ء میں ایچیسن کالج کی کرکٹ ٹیم (بائیں سے دوسری نشست پر)۔

بائیں جانب: 1971ء لارڈز کے میدان میں پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے ساتھ جہاں میرا تعارف ملکہ برطانیہ سے کرایا گیا۔

نیچے: 1974ء میں اوکسفرڈ ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے۔

اللہ، آرمی اور امریکہ۔ یہ بھی واضح ہوا کہ جمہوریت اور بنیادی حقوق کے لیکچر دینے والے امریکی اپنے مفادات کے لیے فوجی حکمرانوں کے ساتھ خوش دلی سے سمجھوتا کر لیتے ہیں۔ امریکی اس خوف میں مبتلا تھے کہ افغانستان میں قدم جمانے کے بعد سوویت یونین بحیرہ عرب کے گرم ساحلوں تک جا پہنچے گا۔ اس طرح وہ تیل فراہم کرنے کے راستوں کی نگرانی کے قابل ہو جائے گا۔ امریکہ، سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں نے آئی ایس آئی کو رقوم کی فراہمی شروع کی، جس نے ہزاروں عربوں اور افغانوں کو جدید ترین اسلحہ استعمال کرنے کی تربیت دی۔ ان میں بہت سے افغان جہاد ختم ہونے کے بعد بھی پاکستان میں مقیم رہے کہ اپنی حکومتیں انہیں قبول کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔

بعد میں انہی لوگوں نے القاعدہ بنائی اور حوصلہ افزائی کرنے والے امریکیوں کو اب ان کا سامنا تھا۔ پاکستانی عوام کا احساس یہ تھا کہ سوویت یونین کے خلاف لڑی جانے والی جنگ جائز ہے اور لوگوں نے بے بہا قربانیاں دیں۔ اپنے اخبار نویس دوست ہارون الرشید کے ساتھ میں پشاور میں چند نوجوانوں سے ملا جو افغان جہاد میں شریک رہے تھے۔ اب انہیں دہشت گرد کہا جاتا ہے لیکن تب وہ ہیرو تھے۔ دنیا بھر سے وہ ظلم کے خلاف لڑنے آئے تھے، بالکل اسی طرح جیسے 1930ء کے عشرے میں سپین کی خانہ جنگی میں بیرون ملک سے ہزاروں پر جوش رضا کار شریک ہوئے تھے۔ جہاد کے خاتمے پر یہ لوگ الگ تھلگ ہو کر رہ گئے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پرویز مشرف کے برعکس، جنرل محمد ضیاء الحق نے سی آئی اے کو پاکستان میں پاؤں پھیلانے کی زیادہ اجازت نہ دی۔ مجاہدین کی تربیت آئی ایس آئی نے کی اور سرمایہ بیشتر عرب ملکوں سے آیا۔

اسلامی معاشرے میں جہاد کا تصور بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ظلم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ معاشرے کو متحرک اور بیدار رکھنے والی ایک قوت۔ جہاد کی تین اقسام ہیں: تزکیہء نفس یعنی
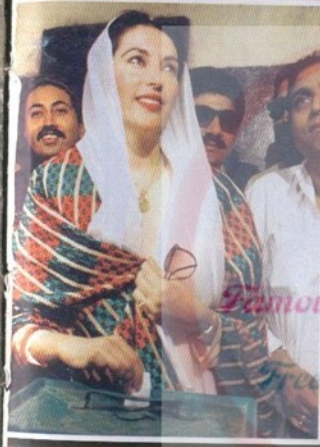
اوپر: نواز شریف، جو دو مرتبہ پاکستان کے وزیر اعظم رہے، 1990ء کی انتخابی مہم کے دوران جس میں وہ کامیاب ہوئے۔
بائیں جانب: بے نظیر بھٹو، وہ بھی دو مرتبہ پاکستان کی وزیر اعظم رہیں، اپنے تحفظ کی یقین دہانی پر وطن واپس آئیں لیکن انھیں 2007ء میں قتل کر دیا گیا۔ میں ان کو اوکسفرڈ کے زمانے سے جانتا تھا۔
نیچے: صدر پرویز مشرف کے ساتھ، راہیں جدا ہونے سے پہلے، جب انھوں نے 2002ء میں شوکت خانم میموریل ہسپتال کا دورہ کیا۔

خود کو برے رجحانات، عادات اور ماحول سے بچانے کی کوشش۔ ثانیاً کسی تشدد کے بغیر ناانصافی کا مقابلہ۔ ثالثاً غیر مسلموں کے حملے کی صورت میں طاقت کے ذریعے مسلم معاشرے کا دفاع۔ انصاف کے لیے مسلمان کو اٹھنا چاہیے۔ ظلم کے خلاف، خواہ اس کا ہدف غیر مسلم ہوں۔ جو معاشرہ ظلم کے سامنے ڈٹ کر کھڑا نہیں ہوتا، موت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ لندن میں بیس لاکھ مظاہرین نے عراق پر حملے کے خلاف احتجاج کیا۔ اگر وہ مسلمان ہوتے تو بجا طور پر اسے جہاد کہتے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ بار بار یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ظالموں کو وہ پسند نہیں کرتا۔ سب لوگ اگر انصاف کا مطالبہ کرتے ہوئے اٹھیں تو حکمرانوں کے لیے ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ 1980ء کے عشرے میں جہاد کے لفظ سے شان و شوکت وابستہ رہی کہ جنگ مغرب مخالف سوویت یونین کے خلاف تھی مگر اب اسی کو دہشت گردی کہا جانے لگا۔ جہاد کے تصور میں ہرگز کوئی نقص نہیں کہ یہ نیکی کے فروغ اور برائی کو روک دینے کا نام ہے۔ رہا غلط استعمال تو وہ کسی بھی نظریے کا ہوسکتا ہے۔

جو لوگ افغانستان گئے، ان کا مطمع نظر بالکل واضح تھا۔ جارح غیر ملکی افواج کے خلاف وہ افغان عوام کے مددگار تھے۔ افغانستان سے ملحق پاکستانی قبائلی علاقوں میں پہلی بار دنیا بھر سے مسلمان جمع ہوئے کہ سوویت یونین سے نبرد آزما ہوں۔ سعودی عرب، یمن، مصر، الجزائر، تیونس اور عراق سے ہزاروں لوگ یہاں پہنچے، آئی ایس آئی نے انہیں تربیت دی اور وہ سی آئی اے کی مرضی سے مقیم تھے۔ ایک سعودی کھرب پتی خاص طور پر بہت محبوب شخصیت بن کے ابھرا، جس نے افغان جہاد کے لیے آسائش کی زندگی تج دی تھی...... اسامہ بن لادن! میرے دوست، مشہور قانون دان اکرم شیخ کو یاد ہے کہ 1987ء میں اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کی ایک تقریب میں وہ مہمان کی حیثیت سے شریک تھے۔ 1983ء میں، میں رائل کیفے لندن میں مجاہدین کے لیے عطیات جمع کرنے کی ایک مہم میں شریک ہوا، جو امرا کا گڑھ تھا کہ کبھی

آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) اور سر ونسٹن چرچل (Sir Winston Churchill) یہاں آیا کرتے تھے۔ بارسوخ طبقات میں تب یہ ایک محبوب اور مقبول مقصد تھا۔ برطانیہ کے لارڈ کرین بورن (Lord Craneborne) اور امریکہ کی جون ہیرنگ (Joanne Herring) ایسی خاتون جس میں فخر کے ساتھ شریک ہوتے۔ امریکہ میں جنرل ضیاء کی لابنگ کرنے والی پرکشش خاتون جون ہیرنگ، مشہور کتاب اور اس پر بننے والی فلم ''چارلی ولسن کی جنگ'' میں، جس کی تصویر کشی ہوئی۔ خود ترحمی سے پاک افسانوی پشتون شجاعت ان لوگوں کو آمادۂ عمل کرتی۔ 1985ء میں افغان مجاہدین کا ایک وفد وائٹ ہاؤس گیا تو صدر ریگن نے ان کا ذکر اس طرح کیا: ''اخلاقی اعتبار سے وہ امریکہ کی بنیاد رکھنے والے عظیم المرتبت قائدین کے ہم پلہ ہیں۔'' ان میں حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار شامل تھے۔ امریکی امداد حاصل کرنے والوں میں وہ نمایاں تھے اور اب وہی حکمت یار افغانستان میں نیٹو افواج سے برسر جنگ ہیں۔ ان کے نزدیک ان غیر ملکی افواج کی حیثیت وہی ہے، جو سوویت یونین کی تھی۔ طالبان اور القاعدہ کی طرح، اب وہ امریکہ کو مطلوب ہیں۔ امریکی دفتر خارجہ کی اصطلاح میں آج وہ مشہور عالمی دہشت گرد ہیں۔

پشتون قبائل کو 1893ء میں وجود پانے والی ڈیورنڈ لائن نے دو حصوں میں بانٹ رکھا ہے۔ انگریزوں نے یہ سرحدی لکیر افغانستان اور برٹش انڈیا کو تقسیم کرنے کے لیے کھینچی تھی۔ آج ہر ماہ ایک لاکھ افراد اس لکیر کے دونوں طرف آتے جاتے ہیں۔ ایک سرحد کے طور پر ان کے لیے یہ بے معنی ہے۔ قبائلی علاقوں کے لوگ روسی کفار کے خلاف مسلمان اور قبائلیوں کی حیثیت سے جہاد میں شرکت کو ایک بنیادی فرض گردانتے تھے۔ سرحد کے صوبے میں جدید اسلحے کا ایک طوفان تھا۔ صوبہ سرحد کے آخری انگریز گورنر سر اولف کیرو نے (Sir Olaf Caroe) ہر پشتون کو ایک فطری جنگجو کہا تھا، جس کے پاس اسلحہ موجود ہو اور اب تو ان کے پاس ایسے ہتھیار

ہیں، کبھی جن کا خواب ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک طرف نئے ہتھیاروں اور دوسری طرف ہیروئن نے فروغ پایا۔ سی آئی اے کی طرف سے کراچی کی بندرگاہ سے قبائلی علاقے تک، ہتھیاروں کا ایک حصہ راستے ہی میں غائب ہو جاتا۔ نتیجہ یہ کہ کراچی دنیا کے سب سے زیادہ فساد زدہ شہروں میں سے ایک ہے، پورا پاکستان اور خاص طور پر قبائلی علاقہ کلاشنکوف کلچر کی زد میں ہے۔ اسلحہ لانے والے ٹرک واپسی پر ہیروئن سے لدے ہوتے، جو افغانستان اور پاکستان کی سرحدی پٹی میں بنائی جاتی تھی۔ پاکستان دنیا میں ہیروئن کی سب سے بڑی گزرگاہ بن گیا اور اس میں منشیات کے عادی لوگوں کی تعداد غیر معمولی ہوتی گئی۔

1982ء تک افغان جہاد کو امریکہ اور خلیجی ریاستوں سے اوسطاً چھ، چھ سو ملین ڈالر کی امداد پہنچ رہی تھی۔ جہاد کے لیے سعودی پشت پناہی نے انہیں وہابیت کے فروغ کا موقع فراہم کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی فکر نے پشتونوں کو متاثر کیا۔ مدرسوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے بھی مقامی مذہبی ماحول پر اپنے اپنے اثرات ڈالے۔ انٹرنیشنل کرائسز گروپ کی ایک رپورٹ کے مطابق 1982ء سے 1988ء کے دوران ان علاقوں میں ایک ہزار نئے مدارس قائم ہوئے۔ عرب ممالک کی مدد سے یہ ان سنی جماعتوں نے تشکیل دیے جو شدت پسندی کے رجحانات رکھتی تھیں یا جنرل محمد ضیاء الحق کی سیاسی حلیف تھیں۔ امریکیوں کا کہنا بھی یہ ہے کہ ان کا پیسہ جہادی ثقافت کے فروغ کا ذریعہ بنا۔ امریکہ کی یونیورسٹی آف نیبراسکا اوماہا (Nebraska, Omaha) نے ان مدارس اور مہاجر کیمپوں میں مقیم نوجوانوں کے لیے مقامی زبانوں میں نصابی کتب شائع کیں، مقدس مجاہدین جنم دینے اور روسیوں کے خلاف نفرت کی آبیاری کے لیے۔ حکومت کو اس امر کی اجازت نہ دینی چاہیے تھی کہ غیر ملکی اپنے زیر اثر گروہ تشکیل دیں۔ یہ عمل شیعہ سنی اختلاف کا ذریعہ بھی بنا اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ اختلاف بڑھتا گیا۔ سوویت یونین کے خلاف جہاد ختم ہونے کے مرحلے تک مجاہدین کی پوزیشن اس معاملے نے بہت خراب کی۔

افغان جنگ کے نتیجے میں تیس لاکھ مہاجرین پاکستان آئے، جو خود اپنی آبادی کا بوجھ نہ اٹھا سکتا تھا۔ یہ لوگ وسائل میں حصہ دار بنے تو زندگی کا معیار گرنے لگا۔ ایران کے برعکس، جس نے انہیں کیمپوں میں رکھا، پاکستان میں افغان مہاجرین کو ہر کہیں جانے کی آزادی تھی۔ معاملے کا ایک پہلو یہ ہے کہ جس فراخ دلی کے ساتھ پاکستانی عوام نے ان مہاجروں کو گوارا کیا، اس پر مغرب کو شرم آنی چاہیے، جو تارکینِ وطن کے مسئلے پر اس قدر واویلا کرتا ہے۔ افغانوں نے مہاجر کیمپوں میں نظم و نسق قائم رکھنے کی اپنی سی بہترین کوشش کی اور ان کا قبائلی نظام اس عمل میں ان کا مددگار تھا۔

جنرل محمد ضیاء الحق کا گیارہ سالہ دور خوشحالی کا عہد تھا؛ اگرچہ حکومت کی اپنی پالیسیوں کے طفیل نہیں۔ 1980ء کے عشرے میں ترقی کی شرح چھ فیصد سالانہ رہی، امریکی امداد کے علاوہ، آسان قرضوں کی بنا پر۔ علاوہ ازیں اسی دور میں سمندر پار پاکستانیوں کی طرف سے بھیجی جانے والی رقوم میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اندازہ یہ ہے کہ 1975ء سے 1990ء کے درمیان 40 ارب ڈالر سمندر پار سے پاکستان پہنچے۔ اگر یہ دولت دکھاوے اور اشیائے تعیش کی بجائے صحت اور تعلیم پر صرف کی جاتی تو آج ملک کی حالت مختلف ہوتی مگر جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت میں کرپشن اس طرح بڑھ گئی کہ بگاڑ بے قابو ہونے لگا۔ غیر ملکی سرمایے کو اس نے سیاسی حریف خریدنے اور ان سیاسی لوگوں کی سرپرستی کے لیے استعمال کیا جو فوجی اقتدار کی حمایت کر رہے تھے۔

جنرل محمد ضیاء الحق کی بدترین وراثت یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کو اقتدار سے باہر رکھنے کے لیے مخالف سیاسی گروہوں کی سرپرستی ہوئی اور سیاست میں فوج کا رسوخ بڑھا دیا گیا۔ جمہوریت کو اس کی قیمت چکانا پڑی۔ اس ہنگامے میں اس نے اپنے پٹھوؤں کو دولت کمانے کی کھلی چھٹی دے دی۔

یہی وہ زمانہ تھا جس میں نواز شریف ایسا لیڈر تخلیق کیا گیا، جو دو بار ملک کا وزیرِاعظم رہا۔ 1990ء سے 1993ء اور پھر 1997ء سے 1999ء تک۔ اس کا خاندان لوہے کی ایک فاؤنڈری کا مالک تھا، جو بھٹو نے قومیالی تھی۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت نے وہ انہیں واپس کر دی اور پھر پنجاب کے وزیرِ خزانہ کی حیثیت سے اس شخص اور خاندان کو ایک صنعتی سلطنت تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ حاصل کرنے کے بعد یہ رفتار کچھ اور تیز ہوگئی۔ روپے کے بے دریغ استعمال سے وہ پاکستان مسلم لیگ کا سربراہ بن بیٹھا اور بعدازاں اسلامی جمہوری اتحاد کا نمائندہ جو آئی ایس آئی کی تخلیق تھا۔ سپریم کورٹ میں داخل کیے جانے والے، آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل درانی کے ایک حلفیہ بیان کے مطابق، دوسرے سیاستدانوں کے علاوہ صرف ایک موقع پر نواز شریف کو خفیہ ایجنسی نے 35 لاکھ روپے فراہم کئے تھے۔ 1985ء کے غیر جماعتی الیکشن نے کرپشن کو عروج پر پہنچا دیا۔ امیدواروں کا تعلق سیاسی جماعتوں کے ساتھ نہ تھا؛ چنانچہ انہیں پلاٹ اور سرکاری بینکوں سے قرضے سرکاری پرمٹ اور حکومتی ٹھیکے دیے گئے۔ یہ الیکشن پاکستان کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ کرپشن کے ایک طوفان کی بنیاد، آئندہ برسوں میں جسے مزید تباہ کن انداز اختیار کرنا تھا۔

میری توجہ اپنے کام پر ہی تھی لیکن 1970ء سے ملک جس زوال کا شکار تھا، اس پر مجھے ذہنی اذیت ہوتی۔ گرما کے موسم میں، میں انگلینڈ میں کرکٹ کھیلتا۔ اس طرح مسلسل اور متواتر ایک ترقی یافتہ ملک کے ساتھ اپنی قوم کے موازنے کا موقع ملتا...... اور دکھ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جاتا۔ برطانیہ میں ادارے مضبوط تھے جب کہ پاکستان میں کوئی بھی بارسوخ آدمی قوانین کا مذاق اڑا سکتا تھا۔ ان کے لہجے زخمی ہوتے مگر میں خاندان کے بزرگوں کو یہ کہتے سنتا کہ انگریزوں کے دور میں صورتِ حال بعض اعتبار سے بہتر تھی۔ قانون کی حکمرانی، قابلیت کی بالادستی اور نوکر شاہی، انگریزی عہد میں ہر چیز مقابلتاً اچھی تھی۔ بحیثیتِ مجموعی کرپشن پر بھی قابو تھا۔ میرے خاندان

کے بزرگ یہ کہتے کہ حکمرانوں نے ہمیں دھوکا دیا۔ قیامِ پاکستان پر فخر کا کیسا احساس تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ مایوسی اور پریشانی بڑھتی گئی۔ سیاستدانوں کی پہلی نسل میں سے بعض مثلاً سردار شیر باز خان مزاری اور ائیر مارشل اصغر خان نے جناح اور اقبال کے خواب کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں دونوں اسیری کی اذیت سے گزرے اور دونوں نے اپنے تجربات رقم کیے ہیں۔

دوسروں کی طرح میں بھی ملک کی حالتِ زار پہ شاکی ہوتا لیکن بہتری لانے کے لیے کبھی انگلی تک نہ ہلائی۔ میرا تعلق اس مراعات یافتہ طبقے سے تھا جسے زوال نے کوئی تکلیف نہ پہنچائی تھی۔ جس سکول میں ہم نے تعلیم پائی، اس کا نصاب درآمدی تھا۔ تعلیم اگر زوال پذیر تھی تو ہم لوگ اس سے متاثر نہ ہوئے۔ اگر ہسپتالوں کی حالت خراب تھی تو ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ علاج کے لیے ہم بیرون ملک جا سکتے تھے۔ بجلی اگر میسر نہ ہوتی تو ہم جنریٹر خرید سکتے تھے۔ سرکاری دفاتر میں اگر کرپشن تھی تو ہمیں کیا۔ کسی نہ کسی طور ہم رشوت دے کر ہم اپنے مقاصد حاصل کر سکتے تھے۔ ہم سرکاری دفاتر میں ایسے رابطوں کے حامل تھے کہ ہمارا کام رکنے نہ پاتا۔ اگر عام آدمی بھگت رہا تھا تو یہ اس کی بدقسمتی تھی۔ میں تو ذاتی طور پر استحقاق یافتہ مخلوق سے بھی زیادہ خوش قسمت تھا۔ کرکٹ کی دیوانی قوم کا میں ہیرو تھا۔ کسی چیز کے لیے مجھے شاکی نہ ہونا پڑتا۔ زندگی میرے لیے بہت ہی آسان تھی۔

ہر چند مسلمان ہونے پر مجھے فخر تھا مگر پاکستان میں اسلامائزیشن مجھے مذہب کے قریب نہ لا سکی بلکہ اس کے برعکس ہوا۔ جبر کے میں طبعاً خلاف تھا؛ لہٰذا جنرل ضیاء الحق کے اسلامی قوانین نے میرے اندر بغاوت کو ہوا دی۔ جب میں نے اسلام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال ہوتے دیکھا تو میرے اندر بیزاری نے جنم لیا جو بڑھتی گئی۔ مذہب کا میں ادراک نہ رکھتا تھا؛ چنانچہ بدعنوان اشرافیہ جب اسلام کا نام لیتی تو ان لیڈروں کی بجائے، میں مذہب کو ہی

قصور وار سمجھنے لگتا۔ سخت گیر یہ سمجھتے ہیں کہ انقلابی اسلام سے سب مسائل حل ہو جائیں گے۔ وہ غلط طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ملک کو بہتر طور پر چلانے کے بجائے ہمیں مذہب کے معاملے میں اپنے روّیے کو بدل لینا چاہیے۔ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں سرکاری ٹیلی ویژن سے، جو بعض اعتبار سے سب سے مؤثر ادارہ تھا، علمائے کرام کو لوگ اسلام کے بارے میں وعظ کرتے ہوئے سنتے، اکثر نوجوان منہ پھیر لیتے یا ٹی وی بند کر دیتے۔ یہ منافقت تھی جو ردِّعمل کو جنم دیتی۔ لوگ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اسلامی معاشرے میں کردار کا معیار نہایت ہی بلند ہونا چاہیے۔

اسلامی انقلاب کے باب میں افغانستان اور ایران سے بھی میری امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ سوویت یونین کی واپسی کے بعد باہمی جنگوں نے شدید مایوسی کو جنم دیا جنہیں مقدس جہادی مانا جاتا تھا، وہ حصولِ اقتدار کے لیے قتل اور ظلم کے مرتکب تھے۔ کتنے لوگ قربان ہوئے تھے، کتنا بے حساب ایثار، مگر لیڈروں نے دھوکا دیا۔ طالبان نے جنگی سرداروں کی طرف سے پھیلائی گئی ہولناک افراتفری میں اوّل اوّل قانون کی حکمرانی کا تاثر دیا مگر وہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ جبر کا ہتھیار برتنے لگے اس لیے کہ وہ مذہب کی روح کو سمجھتے ہی نہ تھے۔ پشتون دیہی ثقافت کے ناتراشیدہ طریقوں اور روایات کو انہوں نے شریعت کا حصہ بنا کر پیش کیا۔ وہ کسی بھی دوسرے نقطۂ نظر کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگر کسی کے چہرے پر داڑھی نہ تھی تو گناہ اور جرم کا مرتکب ٹھہرا کر اسے سزا دی جاتی۔ دریں اثنا افغانستان میں جنگ ختم ہو جانے کے بعد، جہادی گروپوں کے زوال نے انہیں فرقہ پرستی اور تعصب کی طرف دھکیل دیا۔ اس طرح 1970ء اور 1980ء کے عشروں کا مذہبی آئیڈلزم دم توڑنے لگا۔ افغان جنگ کے دوران سعودیوں اور ایرانیوں نے فرقہ پرستوں کی مدد کی تھی۔ اب وہ ایک دوسرے کے مقابل ہوئے یعنی شیعہ اور سنی گروپ۔ عام لوگوں کے نزدیک یہ اسلام کی روح کے خلاف تھا کہ وہ

رواداری پہ شدید اصرار کرتا ہے۔ ایران سے بھی لوگوں کو مایوسی ہوئی۔ ان کی امیدیں تحلیل ہوتی گئیں، جو یہ سمجھتے تھے کہ تہران عالمِ اسلام میں اسلامی جمہوری حکومتوں کے لیے ایک مثال بن سکے گا۔ مسلم عوام کو ایران کے مذہبی لیڈروں کی نگران کونسل کے کردار سے صدمہ پہنچا، جسے جمہوری اداروں کے فیصلے ویٹو کرنے کا اختیار تھا۔ یہ اسلام کی جمہوری روح سے متصادم تھا۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ کا طریق یہ نہ تھا۔

اسلام کے سنہری دور میں جمہوری اصول اس کا کبھی الگ نہ ہونے والا حصہ تھے۔ رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور چاروں خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی، لیکن حضرت علیؓ کے بعد، جن کی حکومت مصر سے ایران تک پھیلی تھی، مسلم دنیا جمہوریت سے محروم ہونے لگی۔ اٹھارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے نشان دہی کی کہ ملوکیت مغل سلطنت اور مسلمانوں کے عمومی زوال کا سبب ہے۔ انہوں نے کہا کہ بادشاہت معاشرے کو مسخ کر دیتی ہے۔ آج کے بیشتر مسلمان ممالک میں جعلی جمہوریتیں قائم ہیں جو عوام کو آزادی عطا نہیں کرتیں اسی لیے 2011ء کے اوائل میں مشرقِ وسطیٰ میں عوامی تحریکیں اٹھیں۔ مسلمان عوام نے مطالبہ کیا کہ فرد کی راہ میں ہرگز کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اپنی بہترین صلاحیت بروئے کار لائے۔ اسلامی قوانین فرد کی روحانی زندگی اور بنیادی حقوق، دونوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایک طرف ان کا تعلق نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ساتھ ہے، تو دوسری طرف بنیادی انسانی ضروریات سے، جیسا کہ مغرب میں یعنی زندگی کا تحفظ، مذہب اور خاندان کے علاوہ آزادیٔ اظہار اور نجی ملکیت کا حق۔ اسلامی حکومت عوام کو حکمران کے جبر سے محفوظ رکھتی ہے۔ کوئی ایسا طاقتور نہ ہوگا کہ قانون سے بالاتر ہو۔ رسول اکرمؐ کے بعد ان کے چار خلفاء میں سے دو کو عدالتوں کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ حضرت علیؓ ایک یہودی کے خلاف مقدمہ ہار گئے کہ جج نے ان کے صاحبزادے کی شہادت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسلام میں تمام تر حقیقی اختیار چونکہ اللہ

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

تعالیٰ کے پاس ہے؛ لہٰذا عام شہری اور حکمران دونوں کو قانون کی حدود میں رہنا ہوتا ہے۔ امریکی آئین کے بانیوں نے یہی راستہ چُنا، جب انہوں نے دستور کو بالاتر قرار دیا۔ 1947ء میں جب قائداعظم سے پوچھا گیا تو انہوں نے ارشاد کیا کہ پاکستان کے آئین کا ماخذ قرآن مجید ہوگا۔

جمہوریت کے ساتھ ساتھ انصاف، بھائی چارہ، عوامی بہبود اور مساوات اسلام کے اجتماعی نظام کی روح ہیں۔ آج کی غیر مسلم دنیا میں بعض بلند تر اخلاقی اور جمہوری اقدار کارفرما ہیں۔ 1970ء میں جب میں برطانیہ پہنچا تو میں نے پہلی فلاحی ریاست دیکھی۔ ایوب خاں کے پاکستان سے لندن پہنچنے والے آدمی کو سماجی بہبود کے تصورات نے حیران کر دیا۔ میری حالت اس ممتاز اسلامی سکالر محمد عبدہ (Muhammad Abduh 1849-1905) ایسی تھی، جنہوں نے یورپ سے اپنے وطن مصر کو مراجعت پر کہا تھا ''میں نے یورپ میں کوئی مسلمان نہ پایا مگر بہت سا اسلام دیکھا جبکہ ہمارے یہاں مسلمان بہت ہیں مگر اسلام ہرگز نہیں۔'' یہ قول آج بھی سچا ہے اس لیے کہ ایمان کی بنیادی اہمیت اپنی جگہ لیکن اجتماعی معاملات کے اندر مغرب کی اجتماعی زندگی میں اسلامی شریعت کی روح، عالمِ اسلام سے کہیں زیادہ کارفرما ہے۔

جب تک میں نے باقاعدہ مطالعہ شروع نہ کیا، مغرب کے دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا کہ شریعت فقط عہدِ قدیم کے قوانین کا مجموعہ ہے۔ یہ جوش و جنون، پردے میں چھپی خواتین، دہشت گردی اور عدم رواداری کا مظہر ہے۔ اس احساس کا ایک سبب اسلام کے بارے میں مغربی ذرائع ابلاغ کا تعصب ہے۔ بدقسمتی سے ہم مسلمان بھی اس کے ذمہ دار ہیں کہ بعض مسلمان حکمران اور جماعتیں اسلام کی بہت ہی قدامت پسندانہ اور قبائلی انداز کی تشریح پیش کرتی ہیں۔

اصولاً اسلامی ریاست کو ایک فلاحی ریاست ہونا چاہیے۔ مجھے اس پر تعجب ہوتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی ریاست کی بات کرنے والوں کو دائیں بازو والا کہا جاتا ہے۔ اسلامی اقدار

بائیں بازو سے زیادہ مشابہت رکھتی ہیں مثلاً سماجی بہبود اور مساوات۔ حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ نے جو 634ء سے 644ء تک حکمران رہے، تاریخ میں پہلی بار ایک فلاحی ریاست قائم کی حتیٰ کہ پنشن جاری کی۔ بیواؤں، معذوروں، یتیموں اور بے روزگاروں کو سرکاری خزانے سے وظیفہ ملا کرتا۔ قرآن کے مطابق ہر سال اپنی دولت پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے تاکہ مفلسوں اور محتاجوں کی نگہداشت ہو سکے۔ پھر اسلامی ریاست میں ''وقف'' کا تصور موجود تھا جس کے تحت یتیم خانے، ہسپتال، مدرسے اور سرائے موجود ہوتے۔ مفت کی قیام گاہوں میں مسافر قیام کرتے۔ آج مغرب میں سماجی بہبود (سوشل سیکیورٹی) کا بہترین نظام قائم ہے۔ سب سے عمدہ مثال تو سکینڈے نیویا کے ممالک ہیں، خود امریکہ بھی اپنے غریبوں پر سالانہ اربوں ڈالر صرف کرتا ہے۔ بدقسمتی سے مسلم ممالک کی اکثریت ایسے کسی بھی نظام سے محروم ہے۔ پاکستان میں رشتہ داروں کے سوا غریب آدمی کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں۔ تعلیم، صحت اور انصاف تک ان کی رسائی نہیں۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے تحت ہونے والے ایک سروے کے مطابق 54 فیصد پاکستانی زندگی میں کئی طرح کی محرومیوں کا شکار ہیں۔ تقریباً دو تہائی شہری روزانہ دو ڈالر سے کم میں گزارا کرتے ہیں۔ 40 فیصد بچے غذا کی کمی کا شکار ہیں...... پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کیسے کہا جائے؟

موسم گرما میں کرکٹ کھیلنے کے بعد جب میں ہر سال سرما کے موسم میں پاکستان پہنچتا تو رنج کے ساتھ ملکی حالت کا جائزہ لیتا جو بتدریج بگڑتی ہی چلی جاتی تھی اس کے باوجود مجھے ملک چھوڑنے کا خیال کبھی نہ آیا اور پاکستان کے سوا کسی دوسرے وطن کا تصور میرے ذہن میں کبھی نہ جاگا۔ اس زمانے میں، میں نے سیاست میں داخل ہونے کا خواب تک نہ دیکھا تھا۔ اگر کوئی تجویز کرتا تو شاید میں یہ کہتا کہ اس سے بدتر کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ 1980ء کے عشرے تک مراعات یافتہ طبقات کے دوسرے افراد کی طرح میں یہ سوچنے لگا کہ چونکہ پاکستان کے مسائل

بہت پیچیدہ ہیں اور حل نہیں ہو سکتے؛ لہٰذا آدمی کو فقط اپنی ہی فکر کرنی چاہیے پھر یہ کہ سیاست مجھے کیا دیتی؟ میں ایک ایسی زندگی گزار رہا تھا کہ پاکستان ہی نہیں، دنیا کے دوسرے ممالک کے اکثر لوگ بھی جس کا صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ میں دنیا بھر میں گھومنے پھرنے والا ایک امیر اور کرکٹ کا مقبول ہیرو تھا۔ میرے نزدیک سیاست ایک گندا کھیل تھا، ان لوگوں کا کام جنہیں کوئی دوسرا مشغلہ میسر نہ ہو۔ میرے سکول کے جو طالب علم ساتھی سیاست میں گئے، ان میں سے اکثر تعلیم اور کھیل کے میدان میں ناکام رہے تھے۔ بیشتر جاگیردار خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی بھی سیاستدانوں کو بے لوث اور مخلص نہ سمجھتا تھا، جو ملک کو بہتر بنانے کے آرزومند ہوں۔ اس دور میں مجھے فلاحی کاموں سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ زکوٰۃ بھی شاید ہی کبھی دی ہو۔ میرا اندازِ فکر یہ تھا کہ چونکہ میں نے اپنے ٹیکس ادا کر دیے؛ چنانچہ فرض کی ادائیگی ہو چکی۔

یہی وہ دن تھے، جب میں نے سوچنا شروع کیا کہ خدا کا وجود ممکن ہے۔ یہ خیال پاکستان میں اسلامائزیشن نہیں بلکہ کرکٹ سے پھوٹا۔ 1982ء میں، کھلاڑی کی حیثیت سے میں عروج کے قریب تھا۔ سات سال تک میں متواتر کھیلتا رہا۔ ساتھی کھلاڑیوں کو میں قسمت کے بارے میں بات کرتے ہوئے سنتا رہتا تھا۔ کبھی بہترین کیفیت میں ہونے کے باوجود میں کچھ نہ کر پاتا اور کبھی کاہلی کے باوجود کامیابی حاصل کر لیتا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ سخت مقابلوں میں ایک نکتہ ایسا ہوتا جس سے معاملہ کسی ایک ٹیم کے حق میں پلٹ جاتا۔ بعض اوقات کھیلنے کی صلاحیت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا۔ مثال کے طور پر امپائر کی کسی ایک غلطی یا تعصب سے نہ صرف ایک میچ بلکہ پوری سیریز کا پانسا ہی پلٹ جاتا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ایک ٹیم جیت رہی ہوتی مگر کسی انہونی چیز مثلاً بارش کے نتیجے میں دوسری فتح یاب ہو جاتی۔ بعض اوقات ٹاس سے فتح یا شکست کی راہ ہموار ہو جاتی۔ پھر ایک اور پہلو بھی ہے جس کی داد باؤلر ہی دے سکتے ہیں۔ بعض اوقات بہترین طور پر گیند پھینکنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، حالات خواہ کتنے ہی سازگار

ہوں اس کے برعکس کبھی نامساعد حالات میں بھی گیند ہدف کو جا لیتی ہے۔ بعض اوقات گیند نرم یا بدنما ہو جاتی ہے اور بہترین باؤلر بھی کچھ نہیں کر سکتا اور نتیجہ خراب نکلتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کبھی ایک بلے باز اس طرح کھیلتا ہے کہ اس کا خود پہ بھرپور اعتماد ہوتا ہے۔ یہ اعتماد کسی بھی طرح مجروح نہیں ہوتا اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ضرور رنز بنا لے گا۔ وہ غلطیاں کرتا ہے، گیند کو کیچ کرا دینے والی غلطیاں۔ لگتا ہے کہ ابھی ابھی وہ آؤٹ ہو جائے گا لیکن سب تعجب کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ وہ کامیاب رہتا ہے۔ میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ: فقط اعتماد اور کوشش ہی کامیابی کی ضمانت نہیں۔ جو کھلاڑی اہلیت، ہنر اور عزم رکھتے ہیں، وہ پیہم کامران رہتے ہیں مگر ایک حد ہے جس سے آگے ہر کوئی بے بس ہے۔ اسی کا نام قسمت ہے۔ شب و روز گزرتے رہے اور میں نے اپنے آپ سے ایک سوال پوچھنا شروع کیا: جس چیز کو ہم قسمت کہتے ہیں، کیا وہی اللہ کی رضا نہیں؟ دوسرا سوال، جس کی وجہ سے میں نے اللہ کے وجود کا ادراک شروع کیا، یہ تھا: کوئی بھی کھلاڑی، کسی وقت بھی زخمی ہو سکتا ہے۔ مہینوں تک ایک کھلاڑی کسی خاص موقع کے لیے جان توڑ محنت کرتا ہے لیکن پھر یہ ممکن ہے کہ آخری وقت پر کوئی پٹھا کھنچ جائے۔ کیا یہ ہے، ساری تگ و دو کا انجام؟ مجھے تیز رفتار باؤلر کی حیثیت سے ہر میچ کے لیے خود کو بہترین حالت میں رکھنا ہوتا مگر بارہا ایسا ہوتا کہ کچھ نہ کچھ زخمی ہونے کے باوجود مجھے کھیلنا پڑتا اور یہ معلوم نہ ہوتا کہ کیا اس طرح زخم اور بھی بگڑ نہ جائیں گے؟ آدمی کا بس نہیں چلتا۔ 1982ء میں جسمانی صحت، تجربے اور تربیت کے اعتبار سے میں بہترین حالت میں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں کرکٹ کی تاریخ میں سب سے زیادہ وکٹیں لینے کا ریکارڈ قائم کر دوں گا۔ میں اس وقت مضبوط اور طاقتور تھا۔ یوں لگتا جیسے کوئی چیز میری راہ روک نہ سکے گی۔ میں یہ سوچتا: آدمی بوڑھا کیسے ہو جاتا ہے؟ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ گزرتا ہوا وقت میری قوت میں کمی لا سکے گا۔ میں خود کو ناقابلِ تسخیر محسوس کرتا۔ صرف ایک برس میں، صرف تیرہ ٹیسٹ میچوں میں، میں نے 40 وکٹیں حاصل کر لی

تھیں، جو تقریباً ایک عالمی ریکارڈ تھا۔ میں ریاضت اور جنون کے ساتھ اس منزل پہ پہنچا تھا اور میں نے خود اپنی ذات کے سوا کسی پر انحصار نہ کیا تھا۔ اگر میں زخمی ہو جاتا تو شاید ہی کبھی معالج کے پاس جاتا بلکہ زخم مندمل کرنے کے لیے ورزش پہ بھروسا کرتا۔ پاکستانی ٹیم نہایت تیزی کے ساتھ کرکٹ کے عالمی منظرنامے پر ایک نئی قوت بن کر ابھر رہی تھی۔ ابھی حال ہی میں ہم نے بھارت اور آسٹریلیا کی دھنائی کی تھی۔ ٹھیک اس مرحلے پر مجھے پنڈلی کی ہڈی پر چوٹ آئی اور اڑھائی برس تک میں باؤلنگ نہ کر سکا۔

سارے سپنے ٹوٹ گئے۔ صرف ایک کھلاڑی ہی محسوس کر سکتا ہے کہ جب ایک چوٹ سے اس کا کیریئر تباہ ہونے لگے تو دل پر کیا گزرتی ہے۔ میری اب تک کی زندگی میں یہ سب سے بڑا حادثہ تھا۔ میں وہ اعتماد بھی کھو بیٹھا، جو مدتوں کی محنت کا ثمر تھا۔ کامیابی حسد پیدا کرتی ہے اور اب مجھے اس کا سامنا تھا۔ میرے متعلق افسوس ناک مضامین چھپنے لگے۔ دو تین کھلاڑیوں نے، جو تب میرا مقابلہ کرنے کی تاب نہ رکھتے تھے، غیبت کو شعار بنایا۔ ان کا خیال تھا کہ میں ختم ہو چکا اور یہ قرض چکانے کا وقت ہے۔ ایسے لوگوں کا مقابلہ میں ہمیشہ میدان میں کرتا اور ان کا منہ بند کر دیا کرتا۔ اب میں بے بسی کا شکار تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ایک ذہنی بحران نے مجھے آلیا۔ اب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ تو محض چائے کی پیالی میں اٹھنے والا ایک طوفان تھا۔ بہت بعد میں، میں نے کرکٹ کے مؤرخ ڈیوڈ فرتھ (David Frith) کی کتاب پڑھی کہ کتنے ہی کھلاڑیوں نے اس حال میں خودکشی کر لی، جب وہ میدان میں اترنے کے قابل نہ رہے۔ اگرچہ میں اس کیفیت میں کبھی مبتلا نہ ہوا لیکن اب میں ان کی ذہنی اذیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ ذہن میں اس سوال کے ساتھ کہ اب کبھی میں باؤلنگ کر سکوں گا یا نہیں، میں نے خود کو غیر محفوظ پایا اور اپنے آپ پر میرا اعتماد متزلزل ہونے لگا۔

میں ایک ستارہ شناس اور قسمت کا حال بتانے والے دو اور آدمیوں سے ملا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ایسے لوگوں کے بارے میں سوچا تک نہ تھا۔ کبھی مجھے ان کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ خود پر میرا اعتماد ایسا تھا کہ اپنی صلاحیت اور ریاضت سے جو چاہوں میں حاصل کر سکتا ہوں۔ میں ان کھلاڑیوں جیسا نہ تھا جو شگون لیتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں چیز یا عادت کی وجہ سے کامیابی کا حصول ممکن ہے۔ نجومیوں سے میری ملاقاتیں بے ثمر رہیں۔ جو کچھ انہوں نے کہا، اس کا بڑا حصہ بے بنیاد تھا۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ کبھی ان کے پاس نہ جاؤں گا۔ احتیاج اور پریشانی کے باوجود میں اللہ کی طرف متوجہ رہا خاص طور پر اس وقت جب پنڈلی میں ٹیس اٹھتی۔ دوبار زخم کے مکمل طور پر مندمل ہونے سے پہلے میں نے گیند کرانے کا تجربہ کیا۔ تیسری بار میں محتاط رہا لیکن اپنے آپ سے میں نے کہا: ”اللہ جانے اب کیا ہوگا، میں کبھی کھیل بھی سکوں گا یا نہیں؟“

موت اور پاکستان کی روحانی حیات

پاکستان اسلام کی بنیاد پر وجود میں آیا، اپنے بانیوں اور ان کے ماننے والوں کے اسلامی عقائد کی اساس پر۔ بدلتے ہوئے حالات نے اسلام کے بہتر ادراک، جوانی کے ماہ وسال میں، جس سے میں محروم رہا تھا، میں میری مدد کی۔ اب میں پاکستان کے حالات، تاریخ کا وہ دھارا جس میں وہ شامل وشریک تھا اور مستقبل کے امکانات پر زیادہ غور کرنے لگا۔ جوں جوں میں اسلام کا زیادہ فہم حاصل کرتا گیا، ملک کی سیاسی زندگی سے میری وابستگی بھی زیادہ ہوتی گئی۔ روحانیت کا ادراک آپ کو اجتماعی زندگی سے وابستہ کرتا ہے، جبکہ ایک مادہ پرست فقط اپنی ذات کے لیے فکر مند ہوتا ہے۔

ایسے کئی لوگوں سے مجھے واسطہ رہا جو روحانی مشاہدات سے گزرتے تھے، میرے خاندان کے کئی بزرگ۔ میری والدہ اس وقت روحانیت کی طرف زیادہ متوجہ ہونے لگیں، جب میری عمر دس برس تھی۔ ساہیوال سے تعلق رکھنے والی ایک صوفی خاتون سے ان کی اور میری خالہ کی ملاقات ہوئی اور وہ پابندی سے وہاں جانے لگیں۔ پاکستان میں روحانی پیشوا اور پیر بہت

ہیں۔ لاکھوں لوگ مذہبی معاملات کے علاوہ افلاس اور بیماری میں ان سے رجوع کرتے ہیں۔ میری والدہ مجھے مذہب کی ترغیب دیتیں۔ میرے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت اس سے قدرے مختلف تھی جو میری اپنے بچوں کے ساتھ ہے۔ وہ میری زندگی پر اثر انداز ہونے والے سماجی اور ثقافتی اثرات سے بے خبر تھیں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک مغربی معاشرے میں مسلمان کے طور پر پروان چڑھنے کے کیا معنی ہیں۔ میرے والد بھی مذہبی تھے لیکن ذرا مختلف انداز میں۔ برصغیر کے عظیم صوفیا کے وہ بے حد قائل تھے اور ان کی تکریم کرتے، مگر وہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست تعلق پر یقین رکھتے تھے۔ میری والدہ اور خالہ کی طرح وہ اس باب میں کسی روحانی پیشوا سے رہنمائی کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔

چودہ سال کی عمر میں، مجھے اپنے پہلے روحانی تجربے سے واسطہ پڑا، جب میں اللہ اور مذہب کے بارے میں تشکیک کا شکار تھا۔ میری والدہ کی روحانی پیشوا پہلی اور آخری بار ہمارے گھر آئیں۔ میری والدہ بہت پرجوش تھیں۔ وہ مجھے ان کے پاس لے گئیں کہ وہ میرے لیے دعا کریں اور رہنمائی بھی۔ اپنی تین چار ماننے والیوں کے ساتھ وہ فرش پہ بیٹھی تھیں اور انہوں نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میری طرف انہوں نے دیکھا تک نہیں اور نہ مجھے ان کا چہرہ نظر آسکا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہیں اور پھر انہوں نے کہا کہ میں نے (ناظرہ) قرآن کی تعلیم مکمل نہیں کی۔ یہ بات صرف میں جانتا تھا یا مجھے پڑھانے والے مولوی صاحب۔ میں سکول کے بعد قرآن کا سبق لیا کرتا اور طبیعت راغب نہ ہوتی۔ اس وقت میں زمان پارک میں اپنے رشتے کے بھائیوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے لیے بے تاب ہوتا۔ سال بھر میں مولوی صاحب مجھ سے مایوس ہو گئے۔ ایک دن ہم دونوں نے ایک منصوبہ بنایا اور والدین کو بتا دیا کہ ناظرہ قرآن کی تعلیم مکمل ہو چکی۔ میری والدہ نے میرا فق ہونے والا چہرہ دیکھا اور فوراً ہی انہیں پتہ چل گیا کہ میرے بارے میں بتائی جانے والی بات درست ہے۔ خاتون روحانی پیشوا نے فقط یہ کہا: ”فکر نہ کیجئے، یہ ایک اچھا

لڑکا ہے اور ایک وقت آئے گا کہ یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“ میری والدہ کے چہرے پر اطمینان اترنے لگا اور اب انہیں بتایا گیا: ”آپ کا فرزند عالمگیر شہرت کا حامل ہوگا اور خود آپ کے نام کا چرچا اس کی وجہ سے گھر گھر پہنچ جائے گا۔“ 21 برس بعد جب کینسر کی وجہ سے میری والدہ کا انتقال ہوا تو انہی کے نام پر شوکت خانم میموریل ہسپتال بنایا گیا اور دُور دُور تک اس کا چرچا ہونے لگا۔

ہسپتال کھلا تو کامرانی کی ایک عظیم ترین مسرت میرے اندر جاگی۔ کرکٹ میں حاصل کی جانے والی تمام کامیابیوں کے مقابلے میں یہ ایک زیادہ بڑا کام تھا۔ سچی اور حقیقی خوشی سے قلب و دماغ جھوم اٹھے۔ کرکٹ کے کھلاڑی سے ہسپتال کے معمار اور سیاستدان بننے کے سفر تک شکوک و شبہات اور ذہنی الجھنوں سے بھی مجھے واسطہ پڑا۔ رفتہ رفتہ مگر میں نے دریافت کیا کہ سچا اطمینان انہی چیزوں سے جنم لیتا ہے، جو ہمارے ذرائع ابلاغ کے نزدیک ہرگز دلچسپی کی حامل نہیں۔ مالی ایثار، دوسروں کی مدد، خاندانی زندگی اور بے غرضی کے ساتھ اعلیٰ مقاصد کے لیے تگ و دو۔ طویل اور المناک علالت کے بعد 1985ء میں میری والدہ کے انتقال نے میری زندگی کا راستہ بدل دیا۔ بے بسی کے ایک ہولناک احساس نے زندگی کو ایک نیا موڑ دیا۔ رنج اور دکھ سے نجات کے لیے اب ایک نئی راہ درکار تھی۔

والدہ کے کینسر میں مبتلا ہونے کا علم مجھے 1984ء میں ہوا۔ ٹیلی فون پر جب میری بہن علیمہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا کہ جو چیز معدے کا زخم سمجھی گئی، دراصل وہ کینسر ہے۔ میں اس وقت لندن میں تھا اور میری پنڈلی کی چوٹ مندمل ہو رہی تھی۔ علاج کے لیے والدہ کو لندن لے کر آیا لیکن ستمبر میں جب تک ہم انہیں گھر لے جاتے، بیماری جگر تک پھیل چکی تھی۔ ان کے آخری چھ ہفتے بہت ہی دردناک تھے اور یاد آتے ہیں تو آج بھی میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے ذہن میں انہیں اجاگر نہ ہونے دوں۔ لاچار ہونے کی دردناک کیفیت میں، میں اللہ سے دعا مانگتا: ”یارب میری ماں کی مدد کر۔“ خاندان کے دوسرے لوگ بھی یہی کر رہے تھے۔ میں اتنا

ہیں۔ لاکھوں لوگ مذہبی معاملات کے علاوہ افلاس اور بیماری میں ان سے رجوع کرتے ہیں۔ میری والدہ مجھے مذہب کی ترغیب دیتیں۔ میرے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت اس سے قدرے مختلف تھی جو میری اپنے بچوں کے ساتھ ہے۔ وہ میری زندگی پر اثر انداز ہونے والے سماجی اور ثقافتی اثرات سے بے خبر تھیں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک مغربی معاشرے میں مسلمان کے طور پر پروان چڑھنے کے کیا معنی ہیں۔ میرے والد بھی مذہبی تھے لیکن ذرا مختلف انداز میں۔ برصغیر کے عظیم صوفیا کے وہ بے حد قائل تھے اور ان کی تکریم کرتے، مگر وہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست تعلق پر یقین رکھتے تھے۔ میری والدہ اور خالہ کی طرح وہ اس باب میں کسی روحانی پیشوا سے رہنمائی کی ضرورت محسوس نہ کرتے تھے۔

چودہ سال کی عمر میں، مجھے اپنے پہلے روحانی تجربے سے واسطہ پڑا، جب میں اللہ اور مذہب کے بارے میں تشکیک کا شکار تھا۔ میری والدہ کی روحانی پیشوا پہلی اور آخری بار ہمارے گھر آئیں۔ میری والدہ بہت پرجوش تھیں۔ وہ مجھے ان کے پاس لے گئیں کہ وہ میرے لیے دعا کریں اور رہنمائی بھی۔ اپنی تین چار ماننے والیوں کے ساتھ وہ فرش پہ بیٹھی تھیں اور انہوں نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میری طرف انہوں نے دیکھا تک نہیں اور نہ مجھے ان کا چہرہ نظر آسکا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہیں اور پھر انہوں نے کہا کہ میں نے (ناظرہ) قرآن کی تعلیم مکمل نہیں کی۔ یہ بات صرف میں جانتا تھا یا مجھے پڑھانے والے مولوی صاحب۔ میں سکول کے بعد قرآن کا سبق لیا کرتا اور طبیعت راغب نہ ہوتی۔ اس وقت میں زمان پارک میں اپنے رشتے کے بھائیوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے کے لیے بے تاب ہوتا۔ سال بھر میں مولوی صاحب مجھ سے مایوس ہو گئے۔ ایک دن ہم دونوں نے ایک منصوبہ بنایا اور والدین کو بتا دیا کہ ناظرہ قرآن کی تعلیم مکمل ہو چکی۔ میری والدہ نے میرا فق ہونے والا چہرہ دیکھا اور فوراً ہی انہیں پتہ چل گیا کہ میرے بارے میں بتائی جانے والی بات درست ہے۔ خاتون روحانی پیشوا نے فقط یہ کہا: ”فکر نہ کیجیے، یہ ایک اچھا

لڑکا ہے اور ایک وقت آئے گا کہ یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“ میری والدہ کے چہرے پر اطمینان اترنے لگا اور اب انہیں بتایا گیا: ”آپ کا فرزند عالمگیر شہرت کا حامل ہوگا اور خود آپ کے نام کا چرچا اس کی وجہ سے گھر گھر پہنچ جائے گا۔“ 21 برس بعد جب کینسر کی وجہ سے میری والدہ کا انتقال ہوا تو انہی کے نام پر شوکت خانم میموریل ہسپتال بنایا گیا اور دُور دُور تک اس کا چرچا ہونے لگا۔

ہسپتال کھلا تو کامرانی کی ایک عظیم ترین مسرت میرے اندر جاگی۔ کرکٹ میں حاصل کی جانے والی تمام کامیابیوں کے مقابلے میں یہ ایک زیادہ بڑا کام تھا۔ سچی اور حقیقی خوشی سے قلب و دماغ جھوم اٹھے۔ کرکٹ کے کھلاڑی سے ہسپتال کے معمار اور سیاستدان بننے کے سفر تک شکوک و شبہات اور ذہنی الجھنوں سے بھی مجھے واسطہ پڑا۔ رفتہ رفتہ مگر میں نے دریافت کیا کہ سچا اطمینان انہی چیزوں سے جنم لیتا ہے، جو ہمارے ذرائع ابلاغ کے نزدیک ہرگز دلچسپی کی حامل نہیں۔ مالی ایثار، دوسروں کی مدد، خاندانی زندگی اور بے غرضی کے ساتھ اعلیٰ مقاصد کے لیے تگ و دو۔ طویل اور المناک علالت کے بعد 1985ء میں میری والدہ کے انتقال نے میری زندگی کا راستہ بدل دیا۔ بے بسی کے ایک ہولناک احساس نے زندگی کو ایک نیا موڑ دیا۔ رنج اور دکھ سے نجات کے لیے اب ایک نئی راہ درکار تھی۔

والدہ کے کینسر میں مبتلا ہونے کا علم مجھے 1984ء میں ہوا۔ ٹیلی فون پر جب میری بہن علیمہ نے مجھ سے رابطہ کیا اور بتایا کہ جو چیز معدے کا زخم سمجھی گئی، دراصل وہ کینسر ہے۔ میں اس وقت لندن میں تھا اور میری پنڈلی کی چوٹ مندمل ہو رہی تھی۔ علاج کے لیے والدہ کو لندن لے کر آیا لیکن ستمبر میں جب تک ہم انہیں گھر لے جاتے، بیماری جگر تک پھیل چکی تھی۔ ان کے آخری چھ ہفتے بہت ہی دردناک تھے اور یاد آتے ہیں تو آج بھی میں کوشش کرتا ہوں کہ اپنے ذہن میں انہیں اجاگر نہ ہونے دوں۔ لاچار ہونے کی دردناک کیفیت میں، میں اللہ سے دعا مانگتا: ”یارب میری ماں کی مدد کر۔“ خاندان کے دوسرے لوگ بھی یہی کر رہے تھے۔ میں اتنا

پریشان تھا کہ ایک روحانی معالج کو گھر لایا جو بالکل جعلساز ثابت ہوا۔ ان دنوں مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ ملک میں پیروں، روحانی معالجوں اور جعل سازوں کی ایک پوری ''صنعت'' موجود ہے۔

والدہ کی وفات کے چند ماہ تک میں اللہ کو بالکل ہی بھولا رہا مگر اس کے بعد میرے اندر اس سوال کی جنگ پھر سے جاگ اٹھی کہ اس کائنات کا کوئی پروردگار ہے یا نہیں؟ اللہ سے میں ناخوش تھا۔ اگر وہ موجود ہے تو میری ماں اس اذیت سے کیوں دوچار ہوئی؟ وہ ایک روحانی ہستی اور اس قدر بے غرض تھیں۔ والدہ کی موت اور پنڈلی کی چوٹ نے مجھے احساس دلایا کہ آدمی کتنا بے بس ہے۔ اپنی صلاحیت اور محنت پر جو اعتماد کبھی پوری قوت سے کارفرما تھا، اب باقی نہ رہا۔ ایسا لگا کہ کسی نے میری ہستی کی ساری حقیقت مجھے یاد دلا دی ہے۔ اب پھر سے میں فجر کی نماز پڑھنے لگا۔ ایک طرح سے یہ احساسِ تحفظ کی آرزو تھی۔ اگر اللہ واقعی موجود ہے تو اس کے سامنے جھکنا چاہیے۔ شاید بعض دوسرے مسلمان بھی اسی طرح سوچتے ہوں۔ وہ اس لیے عبادت نہیں کرتے کہ اللہ کے وجود پر انہیں یقین ہے بلکہ اس لیے کہ وہ موجود ہے۔ میری پنڈلی اب ٹھیک ہوگئی اور پورے جوش و جذبے کے ساتھ ایک بار پھر میں کرکٹ کی طرف لوٹ گیا۔ ایک بار پھر میں ویسی ہی کامیابیاں حاصل کرنے لگا۔ امتحان کے ماہ و سال نے ذہنی طور پر مجھے مضبوط کر دیا تھا۔ جس طرح ورزش سے جسم توانا ہوتا ہے، امتحانات کی بھٹی میں تپ کر ذہن بھی زیادہ بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اب میں نے محسوس کیا کہ وہ چمک دار طرزِ زندگی جو دور سے بہت دلکش لگتا ہے، محض فریبِ نظر ہے۔ وقتی اور عارضی مراسم میں جدائی کے بعد جو زخم لگتے ہیں اور باطن میں ویرانی کا جو احساس جنم لیتا ہے، سچی مسرت کو گھن کی طرح چاٹ لیتا ہے۔ 1980ء کے عشرے میں، شاندار پارٹیوں میں شریک ہونے والے جتنے لوگوں کو میں جانتا تھا، ان میں سے اکثر کا حال یہ تھا کہ جب تک معدے کو وہ الکحل سے بھر نہ لیتے، تقریبات میں گھل مل جانے کے قابل نہ

ہوتے۔ یہ خدا کی باقی ساری کائنات سے کٹی ہوئی دنیا تھی۔ اب ان چیزوں سے بھی مجھے وحشت ہونے لگی، جو کبھی بہت بھاتی تھیں۔ جن لوگوں سے میری راہ و رسم تھی، وہ مہنگے ریستورانوں، مشہور کمپنیوں کے قیمتی ملبوسات، ساحلوں اور کشتیوں پر چھٹیاں منانے والے اور ہالی وڈ کے اندازِ زندگی کے عادی تھے۔ مگر اب نائٹ کلبوں اور پارٹیوں ہی سے نہیں، گھر سے باہر کھانا کھانے سے بھی مجھے وحشت ہونے لگی۔ میں گھر پہ کھانا کھانے لگا۔ زندگی کا انداز بدلا تو مجھے معلوم ہوا کہ فطری مسرت اور تلاش کی جانے والی خوشی میں فرق کیا ہے۔ لذت کو میں نے خوشی کا متبادل سمجھ لیا تھا، جس کا نتیجہ آخر کار منفی ہوتا ہے۔ زندگی میں کتنے ہی لوگوں کو میں نے لذت طلبی، بادہ نوشی اور منشیات کے ہاتھوں اپنی زندگی برباد کرتے دیکھا، گلوکاری، فلم اور کھیل کے کتنے ستاروں کو۔ میری زندگی اس پھسلن میں اتر کر برباد ہوگئی ہوتی کہ جب اس دنیا کو میں نے دریافت کیا تو میری عمر صرف 18 سال تھی...... جنسی آوارگی، منشیات اور راک اینڈ رول کے انقلاب کا زمانہ! جس چیز نے مجھے تباہی سے بچالیا، وہ کرکٹ تھی۔ بہترین کارکردگی کے لیے مجھے بہترین صحت درکار تھی؛ چنانچہ میں اس طرزِ زندگی میں کچھ زیادہ ملوث اور مبتلا نہ ہوا۔ عزتِ نفس کے گہرے احساس نے مجھے اجازت نہ دی کہ کرکٹ کے میدان میں خود کو تحقیر سے دوچار ہونے دوں۔ اپنے خاندان، قریبی رشتہ داروں اور ان سب سے بڑھ کر اپنی والدہ کے سامنے خفت سے دوچار ہونے کے خوف نے مجھے اپنے آپ پر قابو پانے پر آمادہ کیا۔

اب میں نے دریافت کیا کہ جس ماحول میں ہم پروان چڑھتے ہیں، کس طرح وہ ہم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ شمالی علاقوں کی سیاحت اور سالٹ رینج میں تیتر کے شکار کو میں نے معمول بنا لیا اور ان سے لطف اندوز ہونے لگا۔ ان سب کھانوں کے برعکس، دنیا بھر کے اعلیٰ ریستورانوں میں جن کا میں نے لطف اٹھایا تھا، پاکستان کی شاہراہوں پر ٹرک ڈرائیوروں کے ہوٹل مجھے زیادہ اچھے لگے، جہاں چارپائیاں بچھی ہوتی ہیں اور چائے کی پیالیوں کے ساتھ چٹ پٹے طعام

میسر۔ سادہ سے کھانے مگر بالکل تازہ۔ دیسی گھی میں پکی دال، گوشت یا مُرغ۔ سب سے اچھے کھانے مگر پرانے لاہور کے ہیں۔ پورے برصغیر میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔

ایک دیہی علاقے میں پہلی بار میں اس آدمی سے ملا، جسے میری روحانی زندگی کا اوّلین رہنما بننا تھا۔ محض اتفاقاً اس شخص سے میری ملاقات ہوئی اور جو کچھ اس نے مجھے بتایا، اس کے نتیجے میں میرا تجسس بڑھتا گیا۔ اب میں اس نوع کے خیالات پر اور زیادہ خوش دلی سے غور کرنے لگا۔ اپنے ان تجربات کو میں پاکستان کی تاریخ کا ایک حصہ ہی سمجھتا ہوں کہ تبھی مجھے اپنی قوم کا ادراک ہوا۔ تبھی اپنے سامنے بے حجاب ہوتے تاریخی عمل کو میں سمجھ پایا اور یہ کہ خود اس میں میرا کردار کیا ہو سکتا ہے۔

1987ء میں، جب پہلی بار میں نے کرکٹ سے سبکدوشی کا اعلان کیا تو ایک دن میں شمال میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ لاہور سے لگ بھگ سو میل کے فاصلے پر تھا۔ شکار سے فارغ ہونے پر میرے میزبان نے مجھ سے کہا کہ واپسی کے دوران، میں ایک روحانی آدمی سے مل لوں، جو ایک گاؤں میں رہائش پذیر ہے۔ ذاتی طور پر کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوئی مگر دوسروں کی خاطر میں آمادہ ہو گیا۔ بابا چالا نام کا یہ آدمی بھارتی سرحد سے چند میل اِدھر مقیم تھا۔ مطمئن چہرے اور چھوٹے قد کے ساتھ وہ چبھتی ہوئی آنکھوں والا شخص تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ میں کون ہوں۔ گاؤں کے کسی گھر میں ٹیلی ویژن نہ تھا۔ مزید یہ کہ وہ ایسا شخص نظر نہ آتا تھا جسے کرکٹ سے دلچسپی ہو۔ میری سبکدوشی کے بارے میں یقیناً اس نے کچھ نہ سنا تھا؛ اگرچہ اخبارات اور ٹی وی میں اس کا چرچا تھا۔ میرے میزبان نے اس سے پوچھا کہ کرکٹ کے بعد میں کیا کروں گا۔ اس شخص نے میری طرف دیکھا اور کہا کہ ابھی کرکٹ اس نے ترک نہیں کی۔ ہم سب نے اس سے کہا کہ میں نے واقعی کرکٹ چھوڑ دی ہے اور واپسی کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں۔ اس کا جواب یہ تھا ”اللہ کی مرضی یہی ہے کہ ابھی تم کھیلتے رہو۔“ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میری کتنی بہنیں ہیں اور

ان کے نام کیا ہیں۔ پھر وہ میرے دوست محمد صدیق کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوگا؛ لہٰذا وہ کاروبار میں لگی اپنی رقم واپس لے لے اور یہ کہ بالآخر معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ محمد صدیق کو یہ بتا کر اس نے بالکل ششدر کر دیا کہ کتنی رقم کی اس نے سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ ہم وہاں سے حیران واپس آئے اور اس بارے میں بحث کرتے رہے کہ میری بہنوں کے نام اسے کس نے بتائے ہوں گے۔ جس چیز نے سب سے زیادہ پریشان کیا، وہ یہ تھی کہ کاروبار میں لگی صدیق کی رقم کے بارے میں اس کے پاس مکمل ترین معلومات کیسے آئیں؟ چند ماہ بعد (اسلام آباد کے ایک عشائیے میں) جنرل محمد ضیاء الحق نے مجھ سے درخواست کی کہ میں سبکدوشی کا فیصلہ واپس لے کر پھر سے کرکٹ ٹیم کی قیادت کروں۔ میں چند ماہ بعد ویسٹ انڈیز میں کرکٹ کھیل رہا تھا اور محمد صدیق کے کاروبار میں بالکل وہی کچھ ہوا، بابا چالا نے جس کی پیش گوئی کی تھی۔ دور دراز گاؤں میں بیٹھے اس آدمی کو ان چیزوں کا علم وادراک کیسے ہوا؟ میں اس بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے اپنی والدہ کی روحانی رہنما کا خیال بھی آتا رہا، جس نے بتایا تھا کہ میں نے قرآن کی تعلیم مکمل نہیں کی تھی۔

سال بھر کے بعد اس شخص سے میری ملاقات ہوئی، جسے روحانی طور پر میری زندگی پہ سب سے زیادہ اثر انداز ہونا اور یکسر اسے بدل ڈالنا تھا۔ لاہور میں ایک دوست نے مجھے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ صرف ایک مہمان اور تھا۔ ساٹھ کے پیٹے میں دبلے پتلے، زرد رو میاں محمد بشیر۔ ان کے خدوخال کہتے تھے کہ زندگی میں بہت کچھ وہ جھیل چکے ہیں۔ وہ نچلے درجے کے ایک سرکاری اہل کار تھے اور مجھے بتایا گیا کہ وہ اپنی محدود سی پینشن میں گزر اوقات کرتے ہیں۔ کھانے کے دوران وہ خاموش رہے، گویا کسی بھی چیز سے انہیں کوئی واسطہ نہ ہو۔ کھانے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں قرآن کی فلاں آیات پڑھا کرتا ہوں۔ میں نے کہا: ”جی نہیں، میں نے ان آیات کے بارے میں کبھی سنا تک نہیں۔“ ان کا چہرہ سوچ میں ڈوب گیا،

آنکھیں موند لیں، گہرے غور وفکر میں کچھ دیر وہ غرق رہے اور پھر یہ کہا: ''معاف کیجئے، یہ آپ کی والدہ تھیں، جو آپ کی حفاظت کے لیے آیات پڑھا کرتیں۔'' حیرت زدہ اور گنگ، مجھے یاد آیا کہ وہ درست کہتے ہیں۔ جب میں بچہ تھا تو سونے سے قبل والدہ تین بار پڑھتیں اور میرے چہرے پر پھونکتیں۔ انہوں نے کہا: ''انہی آیات نے آپ کی حفاظت کی۔'' پھر میرے خاندان کے متعلق دو تین اہم واقعات کے بارے میں انہوں نے مجھے بتایا۔ یہ اس قدر ذاتی نوعیت کے تھے کہ کوئی ان کے بارے میں جان ہی نہ سکتا تھا۔ ان کی نجی نوعیت کے سبب میں انہیں یہاں لکھ نہیں سکتا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ ہنر انہوں نے کیسے حاصل کیا۔ ان کا جواب تھا ''یہ اللہ کی رضا ہے۔ بعض اوقات التجا کے بغیر ہی وہ مجھے بتا دیتا ہے۔ بسا اوقات میں دعا کرتا ہوں لیکن باریاب نہیں ہوتی۔'' مجھے گہرے تجسس نے آلیا۔ مزید جاننے کا میں آرزومند تھا۔

میاں بشیر کے والد دنیا سے اس وقت چلے گئے، جب ان کی عمر دو برس تھی۔ ان کی والدہ کو اپنے بیٹے کی پرورش کے لیے بہت دکھ اٹھانا پڑے کہ ماموؤں نے ان کی جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ سات سال کی عمر سے وہ گاہے ایسے مناظر دیکھتے، جن کی وہ کوئی توجیہ نہ کر سکتے۔ تب ایک شخص سے ان کی ملاقات ہوئی، جس نے ان سے کہا کہ وہ قرآنِ کریم پڑھیں اور اللہ کی طرف متوجہ رہیں۔ ''زندگی میں اتفاقات نہیں ہوتے۔ یہ اللہ کی طرف سے میری رہنمائی کا اہتمام تھا۔'' انہوں نے مجھے بتایا۔ جب ان کی عمر بارہ برس ہوئی تو ان کے اساتذہ بھی ان سے متاثر تھے کہ جو کچھ دوسرے کبھی نہ دیکھ سکتے، گاہے وہ دیکھ لیتے۔ اب انہوں نے سکول چھوڑ دیا اور لوگوں کو اُن پیروں کے بارے میں آگاہ کرنے لگے جو ہندو جوگیوں کی طرح مجبور لوگوں کو دھوکا دے کر پیسہ کماتے ہیں۔ وہ اخبار میں اشتہار دے کر ان لوگوں کو مقابلے کی دعوت دیتے جو پنجاب اور سندھ کے غریبوں کو لوٹتے پھرتے تھے۔

آئندہ سال کے دوران کئی بار میں میاں بشیر سے ملا، ہر بار ایک کمال اشتیاق کے

ساتھ۔ میری والدہ محترمہ کی روحانی پیشوا کی طرح، وہ بالکل ایک عام آدمی کی طرح نظر آتے۔ اپنی ذات کو اہمیت نہ دیتے۔ ان میں بے حد انکسار تھا اور وہ کہتے: ''میں ماضی یا مستقبل میں نہیں جھانک سکتا بلکہ جب میں اللہ کی طرف متوجہ ہوتا اور دعا کرتا ہوں تو بعض اوقات وہ پردہ ہٹا دیتا ہے، مجبوروں کی مدد کے لیے۔'' وہ کہتے ''اللہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا'' ان کے ساتھ ہر ملاقات کے بعد اللہ پر میرا یقین بڑھ جاتا۔ والدہ کی وفات کے بعد میرا دل رنج سے بھرا تھا۔ بہت سے سوالات مجھے پریشان کرتے، جن کے جواب میں جاننا چاہتا تھا۔ دو تین برس کے اندر انہوں نے میری بہت سی الجھنیں دور کر دیں جو حقیقی اعتقاد کی راہ میں حائل تھیں۔ میاں بشیر اور ان مولویوں میں، جن سے میرا خاندان میں واسطہ رہا یا جن سے میں نے قرآن پڑھا، بنیادی فرق یہ تھا کہ وہ عبادات کی کبھی زیادہ تلقین نہ کرتے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے یہ نہ کہا کہ نماز پڑھوں، روزہ رکھوں یا قرآن کی تلاوت کروں۔ بالکل برعکس، وہ مجھے بتاتے کہ حیات اور کائنات کے حقائق کیا ہیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ سچے یقین کے بغیر محض دکھاوے کے لیے عبادت کا کوئی فائدہ نہیں۔ سب سے پہلے آدمی کو مسلمان ہونا چاہیے۔ اس کے باطن کو بدلنا چاہیے اور یہ کہ یقین وقت گزرنے کے ساتھ ہی گہرا ہوتا ہے۔ کبھی ان کی بات سمجھنے میں مجھے چھ ماہ لگ جاتے مگر انہیں کبھی جلدی نہ ہوتی۔

جس چیز نے مجھے متاثر کیا، وہ یہ تھی کہ ان کا کوئی ذاتی مقصد نہ تھا۔ وہ محض میری بھلائی کے لیے میری رہنمائی کر رہے تھے۔ خود کو ناگزیر بنانے کی بجائے، جو اکثر مذہبی لوگ کرتے ہیں، وہ کہتے کہ وہ ایک خاص حد تک ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔ میں ان سے درخواست کرتا کہ وہ میرے لیے دعا کریں تو وہ جواب دیتے: ''نہیں، تم خود اللہ سے دعا کرو۔'' میں ان سے مشورہ مانگتا تو وہ یہ کہتے: ''بلکہ تمہیں اللہ سے ہدایت کی التجا کرنی چاہیے۔'' انہوں نے کبھی کوئی چیز نہ مانگی اور ان کا کہنا یہ تھا کہ جو شخص کسی مادی منفعت کا آرزومند ہے، وہ ایک جعل ساز کے سوا کچھ

نہیں۔ جس کے پاس روپیہ ہو، اسے دوسروں کو دینا چاہیے۔ اسی طرح میاں بشیر کا خیال تھا کہ جسے اللہ نے علم دیا ہو، اسے خلقِ خدا میں بانٹنا چاہیے۔

میاں بشیر کی رائے میں جو لوگ ظاہری عبادات ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے، وہ غلطی پر تھے اور مذہب کی روح سے نا آشنا۔ وہ کہتے: ''ان میں سے بعض نے مذہب کو پیشہ بنا لیا ہے اور ذاتی فوائد حاصل کرتے ہیں۔'' ان کی رائے میں بعض مولوی صاحبان لوگوں کی مذمت کر کے انہیں دین سے دور کر دیتے ہیں۔ قرآن بنی نوع انسان کے لیے اللہ کا تحفہ ہے۔ یہ زندگی کو مشکل بنانے کے لیے نہیں۔ آپ کو لوگوں پر دباؤ ڈالنے کی بجائے ان کے قلوب و اذہان کو اسے قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہیے۔ ''ایمان اللہ کی سب سے بڑی عطا ہے'' انہوں نے مجھے سکھایا کہ مذہب اگر ذہنی سکون عطا نہیں کرتا تو وہ حقیقی نہیں یعنی آدمی کے باطن میں سرایت نہیں کر سکا۔ مذاہب کا موازنہ کرنے والے اکثر اسے نقصان پہنچاتے ہیں کہ سبھی ادیان بے غرضی، آدمیت اور انصاف کی تعلیم دیتے ہیں۔ مذہب کے نام پر قتل و غارت کرنے والے، سوشلزم، قوم پرستی اور سرمایہ داری کے نام پر جنگیں لڑنے والوں سے ہرگز مختلف نہیں۔

اب میں جانتا تھا کہ انسانوں کا ایک معبود ہے لیکن مذہب کا ادراک کرنے کے لیے اب مجھے مطالعہ کرنا تھا کہ میری مغربی انداز کی زندگی نے حیات کے ابدی حقائق کو میری نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ میاں بشیر کی تعلیم معمولی تھی اور قرآن کریم کے سوا، وہ دوسری چیزوں کے مطالعے میں میری رہنمائی نہ کر سکتے تھے۔ 1988ء میں سلمان رشدی پر اٹھنے والے ہنگامے نے مجھے مطالعے کے لیے مہمیز کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو مسخ کر کے پیش کرنے پر مسلمان بجا طور پر غصے میں تھے۔ برہمی اس لیے زیادہ تھی کہ وہ بھارت کے ایک مسلمان خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس حرکت کا نتیجہ کیا ہوگا؟ آپ آزادی کا نام لے کر کسی مذہب کے ماننے والوں کا مذاق اڑانے کا ہرگز کوئی حق نہیں رکھتے۔ اکثر لوگوں نے اس کتاب کا بائیکاٹ کر کے اپنے ردِعمل کا اظہار کیا لیکن کچھ شدید تر احساسات کے لوگ تھے۔ صرف چند

انتہا پسندوں نے تشدد پر مبنی راہ اختیار کی لیکن ایک ارب تیس کروڑ مسلمانوں کا تاثر بگاڑنے کی کوشش کی گئی۔ جاپان، اٹلی اور ناروے میں کتاب کے مترجمین پر حملے کیے گئے۔ اسلام آباد میں امریکی کلچرل سنٹر پر حملے میں متعدد افراد جاں بحق ہوئے۔ بریڈفورڈ (برطانیہ) میں پاکستانیوں سمیت بہت سے مسلمانوں نے کتاب کی کاپیاں جلائیں۔ برطانوی مسلمانوں نے مذہبی توہین کے قانون کا حوالہ دے کر، اس کتاب پر پابندی کی تحریک چلائی مگر یہ ناکام رہی کہ قانون صرف مسیحی مذہب کے حوالے سے مؤثر تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ امام خمینی نے مصنف رشدی اور پبلشروں کو قتل کرنے کا فتویٰ جاری کیا۔ تہران کے ایک اسلامی خیراتی ادارے نے رشدی کے قتل پر انعام مقرر کر دیا۔ بہت سے علماء اور اسلامی کانفرنس نے خمینی کے فتوے کی مذمت کی؛ اگرچہ قرآن کریم میں توہین رسالت کی سزا موت ہے مگر فتویٰ اس اعتبار سے نادرست تھا کہ اسلام ملزم کو عدالت میں اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

غیر مسلم دنیا اس ہنگامے سے پریشان تھی۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ مسلمان اللہ کے آخری رسول ﷺ سے کس قدر، بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ہمارے عقیدے کا تمام تر انحصار انہی پر ہے کہ قرآن ان پر نازل ہوا۔ قرآن کریم پر ہمارا عقیدہ استوار ہے لہٰذا نبی کریم ﷺ پر کوئی تنقید ہم گوارا ہی نہیں کر سکتے۔ میں مسلمان دانشوروں اور علماء کو ذمہ دار سمجھتا ہوں کہ وہ اس باب میں مسلمانوں کی حساسیت سے مغرب کو آگاہ نہ کر سکے۔ اسلامی کانفرنس کو اس سلسلے میں ایک وفد یورپی یونین اور امریکی کانگرس کے پاس بھیجنا چاہیے تھا۔ مغرب وگرنہ یہ بات کیسے سمجھتا، جہاں آئے دن مذہبی شعائر کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہودی قیادت اس باب میں بے حد کامیاب رہی، جس نے مغرب کو بتایا کہ جرمنی میں یہودیوں کے قتلِ عام کا تذکرہ ان کے لیے کس قدر اذیت ناک ہے اور یہ کہ اس بات کا مذاق نہ اڑایا جانا چاہیے۔ مسلمان ممالک کو اس مثال سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔

اسلام کا دفاع کرنے والا کوئی نہ تھا اور مغرب کے عام لوگ نازی جرمنی میں کتابوں کو نذرِ آتش کرنے سے اس واقعے کا موازنہ کر رہے تھے۔ خود میرا علم ایسا نہ تھا کہ اس موضوع پر بات کرسکوں۔ نیوزی لینڈ کے دورے میں مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا اسلام ایک متشدد مذہب ہے۔ اب میں نے اسلام پر اہم کتابوں کا مطالعہ شروع کیا اور میرا ذہن روشن ہونے لگا۔ اقبالؔ کے علاوہ میں نے ایرانی سکالر ڈاکٹر علی شریعتی کو پڑھا، جو خود کو اقبالؔ کا پیروکار کہتے ہیں۔ دونوں اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلام میں ایک منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کی زبردست صلاحیت ہے۔ وہ سنہری دور، جو رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد کی پہلی پانچ صدیوں میں موجود تھا۔ جوں جوں میں قرآن پڑھتا گیا، اس کے معنی مجھ پر زیادہ آشکار ہونے لگے کہ ہر آیت کی کئی جہات اور پرتیں ہوتی ہیں۔ مطالعہ کرنے والا جتنا زیادہ عالم ہوگا اور جتنے زیادہ اخلاص اور انہماک سے وہ پڑھے گا، فکر و فہم کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوتا جائے گا۔ برطانوی نومسلم چارلز لی جائی ایٹن (Charles Le Gai Eaton) کی تحریروں نے بھی مجھے متاثر کیا۔ ایک سفارت کار، براڈ کاسٹر اور مصنف، ایٹن مغرب کے اولین مسلمانوں میں سے ایک تھا۔ وہ اسلام کے روحانی پہلو پر زیادہ زور دیتا۔ خود اپنی زندگی کے تجربات سے وہ انتہا پسندوں اور نظریہ سازوں کے تضادات واضح کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ کیسے ایک نومسلم مغرب اور مشرق کے درمیان ایک پُل کا کردار ادا کرسکتا ہے اور وہ خود اپنے معاشرے کی خدمت کرنے میں کیونکر کامیاب رہا۔ لندن کے مشہور اخبار گارڈین نے ایٹن کی موت پر لکھا: ''کسی بھی لسانی یا ثقافتی ماڈل کی پیروی سے انکار کر کے، اس بے مثال انگریز شہری نے الفاظ کی بجائے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ اسلامی عقائد برطانوی معاشرے کے اندر نہایت خوش اسلوبی سے بروئے کار لائے جاسکتے ہیں اور اس سے ہم آہنگ رہ سکتے ہیں۔''

اگرچہ میری بنیاد مسلم معاشرے کی روایات تھیں مگر میری تعلیم مغربی تھی۔ جس چیز نے

مجھے متاثر کیا، وہ ایک مغربی شہری کی حیثیت سے اسلام کے بارے میں اس کا اندازِ فکر تھا۔ ثقافتی سے زیادہ ایک نومسلم کا تجربہ روحانی ہوتا ہے۔ اسلامی دنیا کے بہت سے سکالر مقامی ثقافت اور تاریخ کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں، جیسا کہ ایٹن اپنی کتاب ''اسلام اور انسان کا مقدر'' میں واضح کرتا ہے: ''پیدائشی مسلمان کی بجائے، جو شخص خود مسلمان ہوتا ہے، اس کی جڑیں مذہب میں گہری ہوتی ہیں۔ قرآن اور رسولِ اکرم ﷺ کی سنت میں، لیکن وہ مسلمانوں کے رواجوں اور عادات کا اسیر نہیں ہوتا۔ وہ ان کی سی قوت نہیں رکھتا مگر ان کی کمزوریوں سے بھی بچا رہتا ہے۔ اس احساسِ کمتری سے بھی محفوظ جو ان کی حالیہ تاریخ کا ورثہ ہے۔'' ایٹن کے علاوہ جس نومسلم نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ڈاکٹر محمد اسد ہیں جو 1900ء میں آسٹریا کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا نام لیوپولڈ ویس (Leopold Weiss) تھا۔ وہ ایک صحافی، سکالر اور سفارت کار تھے۔ انہیں پاکستان کی شہریت پیش کی گئی اور پاکستان کے اوّلین دستور کے لیے ان سے مشورہ کیا گیا۔

سب سے بڑھ کر جو شخص میرے خیالات پر چھا گیا، وہ اقبالؔ تھے۔ مولانا روم کے ایک پیروکار، جو تیرھویں صدی کے ایران میں ایک عظیم شاعر اور صوفی ہوگزرے ہیں۔ جدید اسلامی معاشرے کے اس عظیم مفکر اقبالؔ نے مشرق اور مغرب دونوں میں تعلیم پائی۔ تبدیلی کی آرزومند مسلم برصغیر کی اس نسل پر، جس سے ان کا تعلق تھا، وہ سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے۔ ان کی فکر کا محور خودی ہے۔ ان کی رائے میں خودی کا حصول، خود انحصاری، عزتِ نفس، اپنے آپ پر اعتماد اور اپنی صلاحیتوں کے ارتقا سے ممکن ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ آدمی خود اپنی تقدیر رقم کرتا ہے اور اس کا انحصار کردار کی تشکیل پہ ہے۔ ان کا نظریہ عملی ہے اور وہ آدمی کو اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں کے مکمل ارتقا کی طرف راغب کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اہم ترین علامت شاہین ہے، جس میں عزم، جرأتِ پرواز اور خودداری پائی جاتی ہے۔ وہ پرندوں کا بادشاہ ہے کہ

تحفظ اور پناہ کا آرزومند نہیں ہوتا۔ نوجوان نسل کو وہ یاد دلاتے ہیں۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام ترا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

....

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اقبال کے جس دوسرے وصف نے مجھے متاثر کیا، وہ انصاف اور آزادی سے ان کی بے پناہ لگن ہے۔ عمر بھر وہ دنیا بھر کے مظلوموں سے وابستہ رہے۔ مسلمانوں کو وہ اکساتے رہے کہ ظلم کی ہر شکل کے خلاف جہاد کریں۔ وہ مذہبی ہو، معاشی، سیاسی، ثقافتی یا علمی۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسلام، جس کا مطلب ہی اللہ کے سامنے جھکنا ہے، خدا کے سوا کسی اور کے سامنے سپر انداز ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ ان کے مطابق قرآن کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ آدم زاد کو ان زنجیروں سے رہائی عطا کرنے سے متعلق ہے جو روایت پسندی، معاشی و معاشرتی جبر، قبائلیت، نسل پرستی اور ذات پات کے نظام سے پھوٹتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ غلام معاشروں کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ غلامی میں ایک قوم پانی سے محروم ندی کی طرح ہو جاتی ہے اور آزادی میں بحرِ بیکراں۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

ہر ملک کو اپنا راستہ خود تلاش کرنا چاہیے۔ 1938ء میں جب دوسری عالمگیر جنگ کے لیے فضا ہموار ہو رہی تھی، اقبال نے آل انڈیا ریڈیو کے لیے اپنے پیغام میں استعمار کی سختی سے مذمت کی۔ چند ماہ بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہونے والے تھے۔ ان کا کہنا تھا: ''سامراجیت کا ظلم دور دور تک پھیل رہا ہے۔ اس نے اپنے چہرے کو جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فاشزم

اور خدا جانے اور کتنے نقابوں میں چھپا رکھا ہے۔ دنیا کے ہر کونے میں، ان عنوانات سے روحِ آزادی اور ابنِ آدم کے وقار کو پاؤں تلے روندا جا رہا ہے...... وہ نام نہاد راہنما (Statesmen) جنہیں حکومت اور انسانیت کی قیادت سونپی گئی ہے، خون ریزی، ظلم اور محکومیت جیسے جرائم کے نمائندے ثابت ہوئے۔ وہ حکمران، جن کا فرض تھا کہ وہ ان اقدار کی حفاظت کرتے اور انہیں ترقی دیتے جو اعلیٰ بنیادوں پر تعمیر انسانیت کا ذریعہ تھیں، تاکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلائی جائے اور انسانیت کے فکری و اخلاقی معیارات کو بلند تر کیا جائے۔ انہوں نے سامراجی عزائم کی تکمیل اور غلبے کی ہوس میں لاکھوں انسانوں کا لہو بہایا اور لاکھوں ہی کو غلام بنایا تاکہ اپنے دھڑوں کی ہوس کو آسودہ کر سکیں۔ غریب اقوام کو غلام بنانے اور ان پر اپنا غلبہ قائم کرنے کے بعد انہوں نے ان اقوام کو ان کے مذہب، اخلاقیات، تہذیبی روایات اور ادب سے محروم کیا۔ ان کے مابین تقسیم کا بیج بویا تاکہ وہ ایک دوسرے کا خون بہائیں اور غلامی کے نشے میں سوتے رہیں، اس طرح کہ سامراجی کیڑا کسی رکاوٹ کے بغیر، ان کا خون چوستا رہے۔''

ان کا پیغام آج بھی اتنا ہی اہم ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم۔

مطالعہ اور ادراک کا یہ عمل میرے لیے دریافت کا ایک ولولہ انگیز تجربہ تھا جبکہ دوسروں کے لیے اسے سمجھنا مشکل ہو رہا تھا۔ میری بہنیں اور خاص طور پر میرے والد مجھے دیکھتے اور ہنستے کہ کیا یہ وہی ہے جو مذہب سے مکمل طور پر دور تھا۔ پاکستان اور برطانیہ، دونوں جگہوں پر میرے دوست حیرت زدہ تھے کہ شاید میں کچھ جنونی سا ہو گیا ہوں۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ میں اس پر لوگوں سے الجھتا نہیں تھا۔ لیکن جب لوگوں نے بہت زیادہ بحث مباحثہ کیا تو میں تنگ آ گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے ایمان کو ان لوگوں کے سامنے بیان نہیں کر سکتا جو یہ خیال کرتے ہیں کہ جس چیز کو سائنسی انداز میں پیش نہ کیا جا سکے، اس کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ بعض لوگ یہ گمان کرنے لگے کہ اس تبدیلی کا تعلق اس خوف کے ساتھ ہے، جو میرے اندر جنم

لے رہا ہے۔ ان کے خیال میں اب میں کھیل کے میدان سے رخصت ہونے والا تھا اور اندیشوں کا شکار تھا۔ میرے دوست مجھے ایک ایسے آدمی کے طور پر جانتے تھے جو عقلیت پسند تھا اور توہمات سے دور رہتا تھا۔ ان کے لیے ایک اُن دیکھے خدا پر یہ پرجوش ایمان ایک معمہ تھا۔ یہی معاملہ میرے بدلتے ہوئے اندازِ زندگی کا تھا۔ علامہ اقبالؔ کے نواسے، یُوسف صلاح الدّین میرے قریب ترین دوستوں میں سے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ میں بنیاد پرست ہو گیا ہوں۔ پاکستانی مغرب زدہ طبقے میں اگر آپ مذہب پر گفتگو کریں تو آپ پر فوراً مُلّا کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ کئی سال بعد، جب میں نے یُوسف الاسلام (سابقہ کیٹ سٹیونز Cat Stevens-) سے گفتگو کی تو اس نے بتایا کہ جب اس نے خدا کو دریافت کیا تو یہ مرحلہ اس کے لیے کتنا سخت تھا۔ اس نے ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ گلوکاری ختم کر دی، اپنے پرانے دوستوں کو بھول گیا اور اپنا لباس تک تبدیل کر لیا۔ اسے اپنے خیالات میں تبدیلی اور پھر اس کے نتیجے میں ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے میں کچھ وقت لگا۔ میرا معاملہ یہ تھا کہ جو مجھ سے بہت قریب تھے، ان کے لیے یہ سب سمجھنا مشکل تھا۔ جو مجھے لا ابالی نوجوان کی شہرت رکھنے والے ایک سپورٹس سٹار کے طور پر جانتے تھے، ان کا ردِّعمل زیادہ انتہا پسندانہ تھا۔ مجھ پر منافقت کا الزام لگا۔ یہ کہا گیا کہ میں ادھیڑ عمری کے بحران سے دوچار ہوں یا میرا اعصابی نظام متاثر ہو گیا ہے۔ مجھے پاکستان کے ایک انگریزی اخبار میں شائع ہونے والا وہ مضمون یاد ہے جس میں میرا موازنہ ایک اور سابق کرکٹر فضل محمود کے ساتھ کیا گیا تھا۔ وہ اپنے وقت کے نامور کھلاڑی تھے۔ اپنی ریٹائرمنٹ تک انہوں نے رنگ و نور کی ظاہری دنیا میں ایک بھرپور زندگی گزاری اور پھر خدا کی طرف رجوع کر لیا۔ میرے نزدیک لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بعض اوقات ایک پیشہ ور کھلاڑی کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ایک مقصد کو کسی دوسرے سے بدل دے۔ اکثر اس معاملے میں مذہب کا نام آتا ہے اور کھلاڑی کھیل کو مذہب سے بدل

دیتے ہیں۔ میں بھی سوچتا تھا کہ فضل محمود نے بھی جیسے مذاق کیا ہو۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ میری طرح انہوں نے بھی تیز رفتار زندگی میں گلیمر کو دیکھا اور پھر اپنی روح کی تسکین کو کہیں اور تلاش کیا۔

پاکستان کے مغرب زدہ طبقے میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو سیکولر نہیں بلکہ مذہب مخالف ہے۔ وہ اسلام پر حملہ کرنے کے لیے مُلّا یا بنیاد پرستوں کو سامنے رکھتا ہے۔ سابق ترک وزیر اعظم نجم الدّین اربکان نے بھی ترکی کے اسلام مخالف طبقے کے اسی رویے کو واضح کیا ہے۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ کیسے پارلیمنٹ میں یہ لوگ اس وقت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے اور ڈیسک بجانے لگتے جب رسالت مآب ﷺ کا ذکر ہوتا ہے۔ اسی طرح کا پاکستانی طبقہ اور میڈیا کے بعض لوگ مجھ پر برس پڑے اور مجھے نومولود مسلمان کا نام دیا گیا۔ تاہم روحانی تبدیلی راتوں رات نہیں آتی۔ یہ انقلاب کا ایک داخلی سفر ہے، جو وقت لیتا ہے اور زندگی کے بہت سے واقعات سے عبارت ہوتا ہے۔ یہ کوئی سیدھا سادہ سفر بھی نہیں۔ ایک ایسا وقت بھی مجھ پر گزرا جب میں شکوک میں مبتلا تھا۔ قرآن اہل ایمان کو خبردار کرتا ہے کہ ان کے ایمان کو آزمایا جائے گا۔

میری ماں جانتی تھی کہ جن باتوں سے مجھے نفرت ہے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مجھے زبردستی کسی کام پر آمادہ کیا جائے۔ مجھے کسی نے خوف اور دباؤ سے ایک اچھا مسلمان بنانے کی جتنی کوشش کی، اتنا ہی میرے اندر مزاحمت پیدا ہوئی۔ قرآن واضح لفظوں میں کہتا ہے: ''دین میں جبر نہیں۔'' آپ کسی آدمی کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ دل اور دماغ کی کشمکش ہے۔ اس لیے اگر میں کسی قدر باعمل مسلمان بن گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ میرا اختیاری فیصلہ تھا جو مدتوں کے غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ لوگوں میں حقیقی تبدیلی اسی وقت آتی ہے جب ان کے عقائد بدلتے ہیں۔ میں یہ نہیں مانتا کہ لوگ اس وجہ سے تبدیل ہو جاتے

ہیں کہ وہ لذتوں سے بھرپور زندگی گزار چکے ہوتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ میں زندگی کی رعنائیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو چکا، اس لیے اب مذہبی ہو گیا ہوں۔ میں اس سے اختلاف کرتا ہوں۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ وقتی انبساط کی تلاش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ لذت کے خوگر، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تلاش میں مزید متحرک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر اس دلیل کو قبول کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی زندگی میں کوئی ارتقا نہیں اور انسانوں کی اصلاح ممکن نہیں۔ یہ صرف ایمان کی معرفت حاصل ہونے والے ارادے کی مضبوطی ہے کہ انسان نفسانی خواہشات کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ رسالت مآب ﷺ نے اسے جہادِ اکبر قرار دیا ہے۔ یہ جہاد زندگی بھر جاری رہتا ہے۔ یہ صرف دہریوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی ہے کہ جب کوئی شخص مذہبی بن جائے تو اس کی تمام ترغیباتِ نفس ختم ہو جانی چاہئیں۔ جس لمحے وہ اپنے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، اسے فرشتہ بن جانا چاہیے۔ ایمان کا اقرار تو دراصل ایک جنگ کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ روح کی بالیدگی کے لیے ایک معرکے کی ابتدا ہے۔ جب ایک مسلمان دن میں پانچ بار نماز پڑھتا ہے تو وہ مسلسل خدا سے یہ دعا کرتا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر چلنے میں اس کی مدد کرے۔ آدمی نیک ہو یا گناہ گار، دعا کا ایک ہی مفہوم ہے۔ دن میں پانچ بار، ایک دن کے بعد دوسرے دن، ایک سال کے بعد اگلے سال، مسلسل راہنمائی کی درخواست۔ ''ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان کا جو مغضوب ہوئے اور گمراہ (الفاتحہ ۱:۶)۔'' یہ ایک شخص کے کردار میں اصلاح کا مسلسل عمل ہے۔

میں نے کم ہی کوئی آدمی دیکھا ہے جو ماہرین نفسیات سے ملنے کے بعد تبدیل ہو جاتا ہو۔ ایٹن کے مطابق: ''علم نفسیات، روح کے بارے میں ان لوگوں کا حاصلِ مطالعہ ہے، جنہیں روح کی کچھ خبر نہیں۔'' بحالی کے مراکز میں بہت دفعہ جانے کے باوجود منشیات کے بہت سے عادی اپنی عادات پر قابو پانے کی کوشش میں ناکام رہتے ہیں۔ میرا دوست، جے پور کا شہزادہ

جگت سنگھ، اپنی عمر کی چوتھی دہائی میں تھا جب منشیات سے لڑتے لڑتے اس کا انتقال ہو گیا۔ وہ ملک میں اور ملک سے باہر بحالی کے مہنگے مراکز میں جاتا رہا لیکن بے سود۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک بے سمت زندگی گزارتا تھا اور اس کی روح بے چین تھی۔ بحالی کا کوئی مرکز اس معاملے میں مددگار نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو مکمل طور پر تبدیل ہو گئے جب ان کی روح ایمان سے لذت آشنا ہوئی۔ اپنے اس سفر میں، میں نے میاں بشیر صاحب کی راہنمائی سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ایمان اگر کسی سمت راہنمائی اور بصیرت کے بغیر ہو تو وہ جنونی، فقط خود کو کھرا سمجھنے والے نیکوکاروں اور راہبانیت پسند لوگوں کو جنم دیتا ہے۔ ایک اچھے عالم کی راہنمائی بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اہلِ علم کا بے پناہ احترام ہے۔ تیمور، اس منگول فاتح نے جو انسانی تاریخ کے سب سے بڑے قصابوں میں شمار ہوتا ہے، جب بھی کسی بستی میں قتل عام کیا تو پہلے اس بات کا اہتمام کیا کہ تمام اہل علم کو احتیاط سے الگ کر دیا جائے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اہل علم ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہے ہیں اور ہر جگہ انہیں بے پناہ احترام سے نوازا گیا۔

میاں بشیر مجھ پر ہنستے اور کہتے: ''سوچو! ایمان لانے میں تمہیں کتنا وقت لگا، اب تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں چند منٹ میں جان جائیں۔'' وہ مجھے کہتے کہ قرآن مجید کے ان الفاظ کو یاد کرو: ''کہہ دیجیے! میں ان کی عبادت نہیں کرتا، جنہیں تم پوجتے ہو، نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو، میں جس کی عبادت کرتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔''

(الکافرون۱۰۹۔۱۔۲)

انہوں نے وضاحت کی کہ قرآن کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ انسان ایک خدا پر ایمان لائے، آخرت پر، یوم حساب پر ایمان لائے اور دوسروں کی مدد کے لیے نیک اعمال کرے۔ بہت سے مقامات پر قرآن نے مسلمانوں کے بارے میں کہا ''جو ایمان لائے اور جنہوں نے

نیک عمل کیے۔'' حسنِ عمل کے بغیر مذہبی رسوم پر عمل انہیں بے معنی بنا دیتا ہے۔

اس خیال سے متاثر ہو کر، میں نے کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی والدہ کے نام پر ایک ہسپتال کی تعمیر پر ساری توجہ مرتکز کر دی۔ تاہم ابھی تک میرا طرزِ حیات پوری طرح اسلامی نہ تھا۔ میاں بشیر اس بات سے باخبر تھے لیکن انہوں نے مجھ پر وعظ نہ کیا کہ میں نماز پڑھوں، قرآن پڑھوں یا متقی آدمی کی طرح زندگی گزاروں۔ مجھ سے وہ یہی کہتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس ہسپتال کی تعمیر سے زیادہ خوش کرنے والا عمل کوئی دوسرا نہیں۔ جب وہ مجھے دیکھتے کہ میں ہسپتال کے راستے میں حائل رکاوٹوں سے پریشان ہوں تو وہ مجھے یقین دلاتے کہ اللہ یہ سب مسائل حل کر دے گا اور یہ کہ وہ اچھی نیت سے شروع کیے گئے کاموں کو اپنی تائید سے نوازتا ہے۔ جب بھی میرا ایمان متزلزل ہوا، انہوں نے مجھے تسلی دی۔ اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ انہوں نے مجھ سے کہا ''خود پیغمبر اسلام ﷺ ابتدا میں وسوسے کا شکار ہوئے تو ان کی اہلیہ سیدہ خدیجہؓ نے انہیں یقین دلایا کہ حضرت جبریل علیہ السلام سے ان کی ملاقات حقیقی تھی اور آپ ﷺ پر (خدانخواستہ) جنون کا کوئی اثر نہیں۔''

میاں بشیر ممکن ہے مستقبل میں جھانکنے کی کچھ صلاحیت رکھتے ہوں لیکن مجھ پر ان کی جس بات کا حقیقی اثر تھا وہ ان کی بصیرت اور خدا کے وجود پر یقین کامل تھا۔ انہوں نے اللہ پر میرے ایمان کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ دور کرنے میں میری مدد کی۔ ذاتِ خداوندی کو میں اپنے احاطہ خیال میں لا نہ سکتا تھا۔

بچپن میں، جب میں خدا کے بارے میں سوچتا تو ایک ایسے بوڑھے شخص کا تصور ابھرتا جس کی لمبی سفید داڑھی ہے، جب میں مزید بڑا ہوا تو میرے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ کوئی ایسی ذات بھی ہے جو اتنی طاقتور ہے کہ اس نے پوری کائنات کو تخلیق کیا اور اس کائنات میں واقع ہونے والی ہر بات کو محض اپنے ارادے اور اختیار سے کنٹرول کرتی ہے۔

میاں بشیر اس معاملے میں صرف قرآن مجید کی بات دُہرا دیتے وہ بتاتے کہ یہ انسانی ذہن کی حدود سے ماورا ہے کہ وہ ذاتِ خداوندی کو سمجھ سکے اس لیے یہ بے کار کوشش ہے کہ وہ اسے اپنے خیال میں مجسم کرے۔

اس کے برخلاف اسے چاہیے کہ وہ قرآن مجید میں بیان کردہ اسمائے حسنیٰ سے اسے سمجھنے کی کوشش کرے جو اس کی مختلف صفات کا بیان ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس طرح فرشتوں اور جنت دوزخ کو بھی ذہن میں مصور کرنا مشکل ہے۔

میں نے میاں بشیر سے ایک اور مسئلے پر بھی بات کی جو مجھے ایک عرصے سے پریشان کیے ہوئے تھا۔ اس سوال کا تعلق ایک بے اخلاق صاحب ایمان اور ایک بااخلاق دہریے سے تھا۔ میں مغرب میں ایسے بہت سے بااخلاق اور اصول پسند افراد سے ملا جو خدا پر ایمان نہ رکھتے تھے۔ اس طرح پاکستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دن میں پانچ بار نماز پڑھتے ہیں لیکن ہر بداخلاقی میں ملوث ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب نماز محض ایک جسمانی مشق بن جائے اور انسانی روح کے تار چھیڑنے میں ناکام رہے تو اسے مادی حیوانی مطالبات کی مزاحمت کے لیے سخت کوشش درکار ہوگی۔ بہت سے لوگ جو مذہبی ہیں دراصل خدا پر سچا یقین نہیں رکھتے۔ ایک بااخلاق لیکن خدا پر ایمان نہ رکھنے والے کسی شخص کے بارے میں، ان کا کہنا تھا کہ ایسے آدمی کے لیے اخلاقیات کا ماخذ والدین، سکول یا معاشرہ ہوتا ہے۔ تاہم ہر نظامِ اخلاق بہرحال مذہب ہی سے پھوٹا ہے۔ ان کے بقول دنیا میں ''اخلاقی دہریت'' نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی، جب لوگ مذہبی اقدار سے کٹ جاتے ہیں تو آخرکار ایک معاشرہ اخلاقی زوال سے دوچار ہو کر رہتا ہے۔

میں نے میاں بشیر سے پوچھا کہ انہیں اس بات کا کیسے علم ہوا کہ میرے بچپن میں، میری والدہ قرآن مجید کی فلاں آیت پڑھ کر مجھے پھونکا کرتی تھیں۔ انہوں نے بار بار وضاحت

کی کہ وہ صرف وہی کچھ دیکھ سکتے ہیں جو اللہ انہیں دیکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کئی بار انہوں نے مراقبہ کیا اور دعا کی کہ کسی آدمی کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں علم عطا کرے لیکن بارگاہ خداوندی سے انکار ہو گیا۔ میں نے سوال کیا کہ انہیں یہ قدرت کیسے حاصل ہوئی۔ ان کا جواب تھا ''اللہ کی طرف رجوع سے۔'' انہوں نے بتایا کہ چونکہ اللہ کی ذات سارے علم کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے جب ایک آدمی اس کے قریب ہو جاتا ہے تو اللہ اسے وہ کچھ دیکھنے کی اجازت دے دیتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ ہر آدمی ہر علم حاصل نہیں کر سکتا۔ بعض اس کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے لیکن ناکام رہتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جیسے اللہ کے پیغمبر، جنہیں بہت کم کوشش سے یہ صلاحیت حاصل ہو جاتی ہے۔ عام فانی انسانوں کو خلوت اور انسانی خواہشات سے رہائی کے عمل سے گاہے یہ صلاحیت مل سکتی ہے۔ جب میں نے بارہویں صدی کے اندلسی صوفی محمد ابن عربی کی سوانح عمری پڑھی تو مجھے میاں بشیر کی بات بہتر طور پر سمجھ میں آئی۔ ابن عربی ان لوگوں کے بارے میں کہتے ہیں ''یہ وہ ہیں جو دونوں آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔'' ان کا یقین تھا کہ روحانی عمل اور ارتقائی عمل سے گزرنے کے بعد، ایک آدمی مراقبے کے دوران ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرتا ہے۔

میں نے تصوف کے بارے میں پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک پوری روحانی دنیا ہے جس کے بارے میں، میں بالکل بے خبر تھا۔ تصوف ایک پورا مضمون ہے جو اس کتاب کا موضوع نہیں، تاہم یہاں صوفی شاعر مولانا روم کے چند خوبصورت اشعار نقل کرتا ہوں، جو آدمی کے داخلی سفر اور روحانی عروج سے متعلق ہیں۔ جو لوگ تصوف سے واقف ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ انسانی روح کس طرح اللہ کی طرف سفر کرتی ہے۔

تہہ زمین کہیں
لوہا اگلتی چٹانیں اور پتھر ہیرا ممکن ہیں
اور پھر میں رنگ برنگے پھولوں میں مسکراتا ہوں
وقت کے آوارہ اور بے سمت لمحوں میں گھومتا ہوں
خاک، ہوا اور سمندروں میں
ایک نئے روپ میں
میں ڈوبتا اور اڑتا ہوں
رینگتا اور بھاگتا ہوں
اور میرے وجود کے سربستہ راز مصور ہوتے ہیں
ایک ایسی صورت میں جو انہیں قابل دید بنا دیتی ہے
ایک انسان کی صورت
اور پھر میرا نصب العین
بادلوں سے اوپر، آسمان سے پرے
ایسی دنیا میں جہاں موت ہے نہ تبدیلی
عالمِ ملائکہ میں اور پھر ادھر
شب و روز کی حدود سے ماورا
موت و حیات اور دیدہ و نادیدہ سے آزاد

جہاں ازل سے ہے

وہ جو اَحد ہے اور کامل

میاں بشیر نے مجھے سکھایا کہ تصوف کے مختلف پہلوؤں کو میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں
جان سکتا کہ ہمارا علم محدود ہے اور ہمارے اندر عاجزی ہونی چاہیے۔ یہ گمان کہ ہم سب جانتے
ہیں، ہمارے علم کی سطحیت اور کمزوری کا اظہار ہے۔ انسان کی تاریخ میں لوگوں نے حقیقتِ مطلق
کا دعویٰ کیا لیکن بعد میں ان کے دعوے غلط ثابت ہوئے۔ علم کا ایک پہلو وہ بھی ہے جو سائنس،
منطق اور جدید تعلیم سے ماورا ہے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جس کا (سائنسی) ثبوت نہیں، وہ
موجود ہی نہیں۔ جیسے جیسے آپ کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، آپ پر منکشف ہوتا ہے کہ آپ
کا علم کتنا محدود اور کم ہے۔ میں نے دیکھا کہ میاں بشیر کی طرح کے لوگ، جو گہرا علم رکھتے ہیں،
ان کے مزاج میں عاجزی اور انکسار ہوتا ہے۔ میرے لیے اس کے بعد داخلی تضاد ختم ہو گیا۔
اب میری ایک شدید خواہش تھی، اپنے خدا کو پہچاننا۔ میں نے میاں بشیر سے پوچھا: ''مجھے کہاں
سے آغاز کرنا ہوگا؟'' قرآن پڑھو، ان کا جواب تھا، قرآن کریم پڑھا کرو۔ میں نے پوچھا:
''آپ نے پہلے مجھے یہ نصیحت کیوں نہ کی؟'' ''تم ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ قرآن صرف
ان کے لیے بامعنی ہے جو حق کی تلاش میں ہوتے ہیں نہ کہ ان احمقوں کے لیے جو فقط مسترد
کرنے کے لیے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ جو محض ظاہری دلیل اور منطق پر یقین رکھتا ہے، اس
کے لیے ماننا مشکل ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ یہ قرآن اور رسالت مآب ﷺ کی شاندار
حیات مبارکہ کا ایک ساتھ مطالعہ تھا۔ جس نے مجھے قائل کیا کہ یہ کتاب الہامی ہے۔

مجھے جب قرآن مجید کی کوئی آیت سمجھ میں نہ آتی تو میں میاں بشیر سے راہنمائی چاہتا۔
وہ پیچیدہ مسائل کو بہت سادہ الفاظ میں سمجھا دیتے۔ کچھ عرصے میں انہوں نے اکثر ایسے
سوالات کے جواب دے دیے جو وجود باری تعالیٰ کے بارے میں میرے ذہن میں اٹھتے تھے۔

ان میں ایک سوال یہ بھی تھا: ''اگر خدا ہے تو پھر دنیا میں اتنے دکھ کیوں ہیں؟'' جواب ملا: ''جب
آپ کا ایمان ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک دنیا ہے جو ہمیشہ کے لیے ہے تو وہاں ان دکھوں کا مداوا
ہو جائے گا۔ یہ ایمان اس دنیا میں ہمیں مشکلات سے بچانے کے لیے نہیں، بلکہ ہمیں ہمت عطا
کرنے کے لیے ہے کہ ہم ان پر کیسے قابو پا سکتے ہیں؟'' (برسوں بعد، میرے بارہ سالہ بیٹے
سلیمان نے بھی یہی سوال مجھ سے پوچھا) یہ دنیا آخرت کے حوالے سے دارالامتحان ہے۔
مطالعۂ قرآن کے دوران ذہن میں اٹھنے والے بہت سے سوالات کے جواب اللہ کی کتاب کے
اوراق ہی میں ملے۔ ایک وقت تھا، جب مجھے اس کتاب سے دلچسپی نہ تھی۔ اب اس کے ہر صفحے
پر میرے لیے حکمت کے موتی بکھرے تھے۔ اس کے باوجود، میں پوری عاجزی کے ساتھ یہ
اعتراف کرتا ہوں کہ میرے پاس سب سوالات کے جواب نہیں۔ میں سوچتا ہوں اور جیسے
رسالت مآب ﷺ نے بھی فرمایا، مجھے ماں کی گود سے قبر تک، سیکھتے رہنا ہے۔

مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ میں اسلام کا کوئی عالم ہوں، مگر اپنے روحانی سفر سے میں نے جو
کچھ سیکھا، اس کی بنیاد پر میں مغرب میں اسلام کے حوالے سے پھیلی غلط فہمیوں اور واہموں
کی اصلاح کر سکتا ہوں۔ ایک عظیم مذہب کو اگر آج برا بھلا کہا جا رہا ہے تو اس کی واحد وجہ
اہلِ مغرب کی لاعلمی نہیں۔ اس میں بڑا حصہ حقیقی اسلام کے بارے میں خود ہماری جہالت کا بھی
ہے۔ معتدل اور انقلابی اسلام کے بارے میں طرح طرح کی بات ہوتی ہے، عجیب و غریب
مباحث۔ دراصل اسلام ایک ہی ہے۔ ہر انسانی معاشرے میں معتدل، شدت پسند یا لبرل لوگ
ہوتے ہیں، لیکن دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا بنیادی پیغام صبر و تحمل اور بردباری ہی ہے۔ ایمان
یہی ہے کہ وہ انسان میں موجود خیر کو ابھارے۔ فرد اور اجتماعیت میں موجود بھلائیوں کے
امکانات میں اضافہ کرے۔ مذہب کو اقتدار کے حریص لوگوں کے ہاتھوں ایک سیاسی ہتھیار
کے طور پر استعمال نہ ہونا چاہیے جیسا کہ پاکستان، دوسرے مسلمان ممالک اور دورِ وسطیٰ کے

یورپ میں ہوتا رہا۔ میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ دہشت گردی کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ یقیناً اسلام کی حقیقی تعلیمات سے بھی اس کا کوئی واسطہ نہیں، ایک بے رحمانہ قتل عام اور انسانوں کو اذیت دینے کا عمل مذہب سے کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے؟ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام کو بھی شخصی اور سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا گیا۔ اسی طرح سوشلزم اور کیمونزم ایسے نظریات کو بھی۔

جیسے میرا ایمان پختہ ہوا، تو زندگی کے بارے میں میرا زاویہ نگاہ مکمل طور پر تبدیل ہو گیا اور میں نے اپنے کردار کی اصلاح کا آغاز کیا۔ جو لوگ اس عقیدے کے تحت جیتے ہیں کہ انہیں دنیا کے اعمال کے لیے آخرت میں جواب دہ ہونا ہے، وہ ان لوگوں سے مختلف زندگی گزارتے ہیں جو صرف اس دنیا کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر میں اس داخلی تبدیلی سے نہ گزرا ہوتا تو وہی زندگی گزار رہا ہوتا جس میں انسان کا مطمح نظر دنیاوی لذّتوں کا حصول ہے۔ میرے پاس ضرورت کی ہر چیز ہے۔ کرکٹ کی کمنٹری اور اخباری مضامین سے میں چند ماہ میں اتنا کما سکتا ہوں کہ سال بھر اطمینان سے زندگی گزاروں۔ میری ذاتی زندگی محدود سی ہے۔ پاکستان اور برطانیہ میں میرے چند دوست ہیں اور میں نے اپنے سماجی حلقے کو وسیع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس رجحانِ طبع کے باعث میرے لیے ان لوگوں کے ساتھ گھلنا مشکل ہوتا ہے جنہیں میں اچھی طرح نہیں جانتا۔ شادی سے پہلے کی زندگی ایک اعتبار سے میرے مزاج سے ہم آہنگ تھی۔ میری کوئی ذمہ داری نہیں تھی اور میں ذاتی حوالے سے فیصلے کرتا تھا۔ اس طرح میری زندگی میرے اس فلسفے سے ہم آہنگ تھی کہ زندگی کا مقصد عیش ونشاط ہے۔ مجھے بچوں کی کوئی خواہش نہ تھی کیونکہ میں جس طرح کی زندگی گزارنا چاہتا تھا، اس میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ میرے بہت سے دوست ہیں جنہیں شادی شدہ زندگی میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بچوں کے لیے وقت نہ نکال سکے اور پھر تلخیوں کے بعد طلاق تک نوبت جا پہنچی۔ میرے

مستقبل کے منصوبے اس خیال کے گرد گھومتے تھے کہ میں اس زندگی کو کس طرح بھرپور بنا سکتا ہوں۔ موسم سرما کے ایام پاکستان میں خاندان اور دوستوں کے ساتھ اور پھر تیتر کا شکار کھیلتے ہوئے۔ جون اور جولائی لندن میں کہ یہ وہاں کی سماجی سرگرمیوں کا دورِعروج ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ لارڈز ٹیسٹ اور ویمبلڈن۔ پھر اگست میں، میں پاکستان لوٹ آتا، قراقرم کی طرف عازمِ سفر ہونے کے لیے۔ تاہم جیسے جیسے میرا ایمان پختہ ہوتا گیا، مجھ میں یہ احساس پیدا ہوا کہ میں جس معاشرے کا حصہ ہوں اس کا بھی مجھ پر حق ہے۔ میں نے جانا کہ زندگی میں مادی اور جسمانی لذتوں سے بلند تر بھی کچھ مقاصد ہوتے ہیں۔ مجھ پر یہ حقیقت بھی واضح ہونے لگی کہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بے پناہ کرم اور احسان ہے۔ میں اس سے پہلے ان چیزوں کے بارے میں سوچتا تھا جو مجھے میسر نہیں تھیں۔ اب میرا دھیان ان نعمتوں کی طرف ہوا جو مجھے دی گئیں اور اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھے بھی بطور شکر کچھ لوٹانا چاہیے۔ کچھ ایثار بھی کرنا چاہیے۔

میں قرآن مجید کی اس ہدایت سے متاثر ہوا کہ جو ضرورت کا ہے وہ پاس رکھو اور باقی اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ اس بات کو سمجھنے میں، مجھے بہت وقت لگا۔ اسی میں انسانی مسرت اور اطمینان کا راز پوشیدہ ہے۔ بہت سے لوگ خواہش اور ضرورت میں فرق نہیں کر پاتے۔ ضروریات محدود ہوتی ہیں اور خواہشات لامحدود۔ میں اپنے ساتھ کھیلنے والے کرکٹرز کو دیکھتا تھا۔ ان میں سے بہت سے عام گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مسلسل پیسہ کمانے کی کوشش میں لگے رہتے اور کھیل چھوڑنے کے بعد بھی ان کی یہ کوشش ختم نہ ہوتی۔ میں نے جانا کہ اس کی بنیاد عدم تحفظ کا احساس ہے۔ ایک کھلاڑی کے پاس محدود وقت ہوتا ہے جس میں وہ زیادہ سے زیادہ رقم کما سکتا ہے۔ یہ لوگ ایک ایسی دوڑ میں شریک ہو جاتے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جتنا بھی کما لیا جائے، جمع کر لیا جائے، اطمینان فقط اس سے کیونکر حاصل ہوگا۔ پاکستان کے حکمران طبقے کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہمارے کچھ سیاست دان ایسے ہیں جن کے پاس اربوں ڈالر ہیں لیکن

ان کی ہوس ہے کہ ختم ہونے کو نہیں آ رہی۔ ہسپتال کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم کے دوران مجھ پر منکشف ہوا کہ دنیا میں سب سے ناخوش لوگ وہ ہیں جن کے مقاصد مادی ہیں۔ جن لوگوں نے سب سے زیادہ چندہ دیا، وہ روحانی شخصیت رکھتے تھے اور زیادہ آسودہ اور خوش دکھائی دیتے تھے۔ اسی طرح میں نے زندگی میں سب سے زیادہ خوش اور مطمئن ان لوگوں کو دیکھا جو پاکستان کے دیہات میں رہتے ہیں۔ ایک مدت سے میرا اس پر یقین ہے کہ دنیا میں امیر ترین لوگ وہی ہیں جنہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہ جا سکے۔

سندھ اور پنجاب میں بسنے والے بہت سے پاکستانیوں کے آباء واجداد ہندو تھے۔ تقسیم کے بعد جو علاقے پاکستان کہلائے، یہ مذہبی اعتبار سے زیادہ متنوع علاقے تھے۔ مسلمان، سکھ، عیسائی اور ہندو جہاں ایک ساتھ رہتے تھے۔ اب ان علاقوں کی 95 سے 97 فیصد تک آبادی مسلمان ہے۔ سندھ میں اب بھی ہندوؤں کے کافی اثرات ہیں۔ پاکستانی ہندوؤں کی اکثریت سندھ میں آباد ہے۔ ہندو مذہب میں ''کرما'' کا ایک تصور ہے یعنی وہ جو مقدر میں لکھا گیا، ہو کر ہی رہے گا۔ سندھ میں ایک کسان کے ساتھ سندھی جاگیردار ایک غلام سے بدتر سلوک کرتا ہے اور وہ اسے قبول کر لیتا ہے۔ پاکستان کے بعض حصوں بالخصوص سندھ کے کسان طبقے میں آج بھی ہندوؤں کا فلسفۂ جبریت موجود ہے۔ اس تاثر کے برخلاف جو بعض اہلِ مغرب مسلمانوں کے اس رویے سے اخذ کرتے ہیں کہ جب وہ کثرت کے ساتھ انشاء اللہ (اگر اللہ چاہے) کہتے ہیں، جبریت مسلمانوں کے عقیدے کا حصہ ہرگز نہیں۔ آپ ماضی کو تو جیسے وہ ہے، قبول کرتے ہیں لیکن مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اقبال سختی سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان اپنا مقدر خود بناتا ہے اور قسمت کی کنجی فرد کا کردار ہے۔ انسان کی خودی ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ کوئی فیصلہ صادر کرنے سے پہلے خدا اپنی مخلوق سے پوچھتا ہے کہ اس کی مرضی کیا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

دوسرے لفظوں میں ہم اپنے مقدر کے خود مالک ہیں۔ اقبال کے پیشِ نظر صرف ایک فرد نہیں، بلکہ معاشرے کی تبدیلی بھی تھی۔ اس کی بنیاد قرآن مجید کے اس فرمان پر ہے کہ ''تمہاری حد اللہ تعالیٰ ہے۔'' (سورہ ۵۳، النجم: ۴۲)

بہت سے لوگوں کی طرح، میں اپنی غلطیوں پر خود کو کوستا رہتا تھا۔ کرکٹ کی غلطیوں پر میری زیادہ توجہ ہوتی، اپنے آپ سے کہتا میں کہ مجھے فلاں کام اور طرح سے کرنا چاہئیں تھے۔ اپنے ایمان کے سبب میں نے یہ جانا کہ جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ اپنی زندگی کے دو اذیت ناک موقعوں پر، میں نے اس کو آزمایا۔ ایک مرتبہ اپنی ماں کی موت پر اور دوسری بار طلاق کے بعد۔ قرآن مجید کا کہنا ہے: ''جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، وہ خود ان کی حفاظت کرتا اور ان پر رحم فرماتا ہے۔ بے شک جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور جو عیسائی ہوئے اور جو صابئین ہیں، ان میں سے جو بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور یوم آخرت پر ایمان رکھا اور نیک اعمال کیے، وہ اپنے رب سے اجر پائیں گے، انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔''

ایمان کے سبب مجھ پر سب سے بڑا کرم یہ ہوا کہ میں ہر طرح کے خوف سے آزاد ہوتا گیا۔ ناکامی کا خوف، جان کا خوف، ضروریاتِ زندگی سے محرومی کا خوف، دوسروں کے ہاتھوں بے توقیر ہونے کا خوف، ''قسمت سے مت لڑو کیونکہ قسمت خدا ہے'' رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ماضی سیکھنے کے لیے ہے اور مستقبل اس لیے کہ آگے کی طرف دیکھا جائے اور خوف زدہ نہ ہوا جائے۔ انسان کو پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے، اسے مشیت الٰہی سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے اور اس کے مطابق فیصلے کرنے چاہئیں۔

اداکاروں اور ماڈلز کی طرح میرے پیشے کی بھی ضرورت تھی کہ میری جوانی برقرار رہے۔اس لیے میں جوانی کے ڈھلنے اور عمر کے بڑھنے پر فکرمند رہنے لگا۔کرکٹ کے بعد میں کیا کروں گا؟ تاہم میں نے یہ جان لیا کہ زندگی، صحت اور موت کا وقت، ہر چیز اللہ کے ہاتھ میں ہے۔کھیل کے آخری دو سالوں میں بطور خاص اس عقیدے نے میری بہت مدد کی۔اگر آپ ہر وقت کھیل میں لگے نہیں رہتے تو آپ کے لیے پیشہ ورانہ کرکٹ کھیلنا مشکل ہو جاتا ہے۔اپنے ہسپتال کے لیے فنڈز جمع کرنے کے لیے میں اس وقت صرف انٹرنیشنل کرکٹ کھیل رہا تھا۔اب مشکل تھا کہ میں اپنی مہارت کو بڑھا سکتا۔میرا دورِ عروج اب ماضی بن چکا تھا۔اس کے باوجود کرکٹ کے آخری دو سالوں میں جس طرح مجھے سراہا گیا اور جو عزت مجھے ملی، یہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔میں نے اپنے زخم سے نجات حاصل کی اور 1992ء کا ورلڈ کپ کھیلا۔میں ناکامی کے خوف سے آزاد ہو چکا تھا اور مجھے یہ اندیشہ بھی نہیں تھا کہ کہیں کرکٹ سے میری رخصتی بے توقیری کے ساتھ نہ ہو۔ماضی میں کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ اس نوعیت کے زخم اور یکسوئی نہ ہونے کے باوجود، میں نے اعلیٰ سطح کی کرکٹ کھیلنے کا خطرہ مول لیا ہو۔قرآن مجید کہتا ہے ”جب کوئی اللہ پر بھروسا کرتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔“ یہ جاننے سے کہ عزت و ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے، میرے اعتماد میں اضافہ ہوا۔ میں تنقید کے بارے میں بہت حساس تھا۔ میں لوگوں سے لڑ پڑتا اگر مجھے یہ لگتا کہ وہ میرے ساتھ بدتمیزی کر رہے ہیں۔اگر کسی صحافی نے میرے بارے میں کوئی منفی بات لکھ دی تو میں اس سے بات کرنا چھوڑ دیتا تھا۔ایک دو بار تو میں نے ایک اخبار نویس کو تھپڑ بھی جڑ دیا، جس نے سرعام میری توہین کی۔ میں نے اپنے شرمیلے پن کو جارحیت سے چھپانا چاہا، لیکن پھر ایمان ہی نے مجھے بے توقیر ہونے کے احساس سے رہائی دلائی۔

مجھ میں خطرات مول لینے کی عادت تھی اور ایمان نے اس میں اضافہ کیا۔خواب کی تعبیر اور کامیابی کی راہ میں ایک انسان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ اس کا خوف ہے۔اپنے

کرکٹ کے دور میں، میں نے دیکھا کہ بہت سے کرکٹر محض ناکامی کے اندیشے میں مبتلا ہو جانے کی بنا پر اپنی صلاحیتوں کو ڈھنگ سے استعمال نہ کر سکے۔ بسا اوقات کم صلاحیت رکھنے والے کرکٹرز نے مثبت رویہ اختیار کر کے بہتر نتائج دکھائے۔بعض غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے بلّے باز محض اس وجہ سے اپنے ساتھ انصاف نہیں کر سکے کہ وہ تیز رفتار باؤلروں سے خوف زدہ رہتے۔ اندیشہ کہ کہیں چوٹ نہ لگ جائے۔ زندگی کے ہر شعبے میں، خوف سے آزادی کامیابی کی بہترین ضمانت ہے۔ایک سپاہی جو موت سے ڈرتا ہے، کبھی کسی اعزاز کا مستحق نہیں ہوتا۔ایک تاجر اگر خطرہ مول نہیں لیتا تو اس کی کامیابی کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ایک لیڈر جس میں جرأت کی کمی ہے، کبھی عزت نہیں پا سکتا اور نہ اپنی ٹیم میں جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔سب سے زیادہ ایک راہنما کو جرأت کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ فیصلے صادر کر سکے۔ ایک اچھے اور ایک برے راہنما میں فرق یہی ہے۔اچھا لیڈر ناکامی کے تمام نتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے خطرات مول لیتا ہے جبکہ دوسرا خطرہ تو مول لیتا ہے لیکن ممکنہ نتائج کا اچھی طرح جائزہ نہیں لیتا۔کامیاب لوگ اندیشے کی بنیاد پر فیصلے نہیں کرتے وہ راہنما جو اقتدار چھن جانے کے خوف سے پالیسیاں بناتے ہیں، ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔عظیم راہنماؤں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ دباؤ کی مزاحمت کر سکتے ہیں اور اپنی پالیسیاں ایک نظریے کے مطابق نہ کہ خوف کے تحت تشکیل دیتے ہیں جیسا کہ اقبالؔ نے بھی کہا کہ بزدلی کی سزا موت ہے۔ ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

جب آپ خوف پر قابو پانا سیکھ جاتے ہیں، آپ کی زندگی بدل جاتی ہے۔ بے خوف لوگ مثالیت پسند ہوتے ہیں۔ مایوسی کفر ہے۔ دوسری طرف مادہ پرستی لوگوں کو محدودیت پسند بناتی ہے میری مراد یقیناً یہ نہیں کہ لوگوں کو اپنی حدود کا خیال نہ رکھنا چاہیے۔ دنیا کے کامیاب

ترین کرکٹرز وہ ہیں جو اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے کھیلتے ہیں لیکن ایک آدمی کو بہر حال ان حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ میں ہمیشہ مثالیت پسند رہا ہوں اور میں اپنی ظاہری حدود کو تسلیم کرنے پر کبھی آمادہ نہ ہوا۔ میں جب عالمی کرکٹ کا آغاز کر رہا تھا تو 1972ء میں پہلی مرتبہ میں نے تیز رفتار باؤلر ڈینس للی (Dennis Lillee) کو گیند کراتے دیکھا۔ میں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے اس کی طرح فاسٹ باؤلر بننا چاہا۔ میرے سینئر کھلاڑیوں اور وارسیسٹر شائر (Worcestershire) میں میرے کوچ نے اصرار کیا کہ میری جسمانی ہیئت اور گیند پھینکنے کا اندازہ ایسا نہیں ہے کہ میں ویسا بن سکوں اور اگر میں نے اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی تو میرا کیریئر ختم ہو جائے گا۔ اگر میں نرا محدودیت پسند ہوتا تو کبھی یہ خطرہ مول نہ لیتا۔ میں نے تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کوشش میں میرا جسم اس طرح بہتر ہوتا گیا کہ میں تیز رفتار بن گیا۔ اقبال کا کہنا یہ ہے:

روزِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرائیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

اگر سر ایڈمنڈ ہیلری (Sir Edmumd Hillary) عقل کا غلام رہتا تو کبھی ماؤنٹ ایورسٹ سر نہ کر سکتا۔

حرفِ آخر، یہ کہ ایمان مادی خواہشات پر قابو پانے میں آپ کی مدد کرتا ہے اور آپ کے ارادے پر آپ کو اختیار حاصل ہونے لگتا ہے۔ یہ داخلی جہاد کا ایک حصہ ہے۔ روزے کے بارے میں یہ سوچتا کہ یہ میرے لیے مشکل پیدا کرتا اور میرے معمولات میں رکاوٹ بنتا ہے۔ مشقت بھری تربیت کے دوران میں روزہ نہ رکھتا۔ میں اندیشے کا شکار ہوتا کہ کہیں میرے جسم میں پانی اور نمکیات کی کمی نہ ہو جائے۔ کرکٹ کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ورزش سمیت اپنے روزمرہ معمولات کو میں رمضان میں بھی جاری رکھوں گا۔ مہینے کے اختتام پر مجھے محسوس ہوا کہ میری قوت

برداشت میں اضافہ ہوا ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جسمانی طور پر میں زیادہ اجلا ہو گیا ہوں۔ اس طرح میں نے یہ سیکھا کہ انسانی ارادہ درحقیقت کتنی قوت رکھتا ہے۔ آپ اس کی جتنی تربیت کرتے ہیں، یہ اتنا ہی مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ روزہ اگر اس کی حقیقی روح کو سمجھ کر رکھا جائے تو اس کے نتائج غیر معمولی ہوتے ہیں۔ بہت سے مسلمان اس کی روح کو برباد کر دیتے ہیں جب وہ دن بھر سوتے اور رات بھر کھاتے ہیں۔ جب میں کینسر ہسپتال کی تعمیر میں مصروف تھا۔ مشقت کے طویل ماہ و سال سے گزر رہا تھا تو نماز اور روزہ میرے لیے محض رسوم نہیں، کہیں زیادہ بامعنی اعمال بن گئے۔ میں نے یہ دیکھا کہ دباؤ سے نکلنے کا سب سے اچھا طریقہ نماز ہے بشرطیکہ آپ ادراک رکھتے ہوں کہ اللہ موجود ہے اور بندے کی التجا سن رہا ہے۔ اس سے پہلے دباؤ کم کرنے کے لیے میرے پاس صرف ورزش ہی کا ایک طریقہ تھا۔ جب کبھی ہسپتال کے بورڈ کا اجلاس تمام ہوتا تو کچھ نئے بحرانوں کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہوتا۔ چونکہ عطیات جمع کرنے کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر تھی، اس لیے میری خواہش ہوتی کہ عملہ اس معاملے میں متفکر نہ ہو، اس کی ہمت نہ ٹوٹے۔ میں سیدھا اپنے ہسپتال کی خوبصورت مسجد میں چلا جاتا اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا۔ ہمیشہ اس کے بعد سکون کا ایک گہرا احساس ہوتا۔ پھر پانچ وقت کی نماز میرے لیے ایک فرض سے زیادہ ضرورت بن گئی۔

میں نے اس علم کو کبھی کم قیمت نہ جانا جو سیدھے راستے پر چلنے کے لیے مجھے میاں بشیر سے ملا۔ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ محض اس بنیاد پر کہ ایک شخص مستقبل شناسی کی حس رکھتا ہے، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدا فی الواقع موجود ہے۔ صلاحیت قیافہ شناسوں اور نجومیوں میں بھی ہوتی ہے تاہم بیس سال کے عرصے میں، جب سے میں میاں بشیر کو جانتا ہوں، ان کی کوئی ایک ایسی پیش گوئی بھی ایسی نہ تھی جو غلط ثابت ہوئی ہو۔ مغرب میں پروان چڑھنے والے بہت سے لوگوں کی طرح، جمائما اس صلاحیت کو شک کی نظر سے دیکھتی تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ میاں بشیر سے

ملی تو انہوں نے جمائما سے کہا کہ وہ تین ایسی چیزوں کے بارے میں لکھے جو اسے زندگی میں سب سے زیادہ مطلوب ہیں۔ وہ حیران و پریشان رہ گئی جب میاں صاحب نے اس کے لکھے کاغذ کو دیکھے بغیر بتایا کہ اس نے اپنی کن خواہشات کا ذکر کیا ہے (ویسے بھی میاں بشیر انگریزی نہ پڑھ سکتے تھے)۔

انسانی تاریخ کے سارے کامران لوگ جناح، گاندھی، مدر ٹریسا، نیلسن منڈیلا، نظریہ رکھتے تھے اور ایک آرزو بھی۔ اگر ان کی کامیابیاں دوسروں سے زیادہ ہیں تو اس کا سبب یہ نہیں کہ ان میں صلاحیت زیادہ تھی بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی آرزوئیں بڑی تھیں، خواب عظیم تھے۔

اعلیٰ عزائم کے لیے جہدِ مسلسل کا تصور میرے دل کو بھا گیا۔ کیونکہ یہ میرے اپنے فلسفۂ حیات کے مطابق تھا جو میں نے کھیل کے دوران مرتب کیا۔ آپ جیسے جیسے اپنے آپ کو چیلنج کرتے ہیں ویسے ویسے اپنے اندر موجود ہمت کے عظیم ذخائر کو دریافت کرتے چلے جاتے ہیں۔ جیسے ہی آپ سست پڑتے اور تحرک کھو دیتے ہیں، اسی لمحے آپ کے زوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے میں نے کوشش کی کہ پاکستان کے لیے کھیلوں، پھر میرا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے ملک کا سب سے اچھا آل راؤنڈر بنوں، پھر سب سے اچھا فاسٹ باؤلر، یہیں سے میرے اندر اس خواہش نے جنم لیا کہ دنیا کا سب سے اچھا آل راؤنڈر اور فاسٹ باؤلر بھی بنوں۔ جب میں کپتان بنا تو میری آرزو یہ ہوئی کہ میں پاکستان کو دنیا کی سب سے برتر ٹیم بنا دوں۔ جب ماں کی یاد میں قائم ہونے والا کینسر ہسپتال کامیاب ہوا تو میں نے پشاور اور کراچی میں ایسے ہی دو ہسپتال بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اب میرے لیے زندگی کا چیلنج یہ ہے کہ میں پاکستان میں سماجی و معاشی انقلاب برپا کر کے اسے ایک مبنی بر انصاف اور انسانیت دوست معاشرہ بنا دوں۔ میں اوکسفرڈ یونیورسٹی کی طرز پر میانوالی میں ایک شہرِ علم کی تعمیر کا ارادہ بھی رکھتا

ہوں جو پاکستان کے دیہی علاقے میں پہلی نجی یونیورسٹی ہے۔ جب ایک مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو کرنے کے لیے ہمیشہ بہت کچھ باقی ہوتا ہے جیسا کہ اقبال نے کہا:۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

جمائما مجھ سے کہا کرتی تھی، میں کامیاب ہوئے بغیر کب تک سیاست کرتا رہوں گا؟ کس موڑ پر یہ فیصلہ کروں گا کہ یہ سب بے کار ہے؟ لیکن میں کبھی اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ خواب وقت کے کسی لمحے میں قید نہیں ہوتا۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ آپ کی تعلیم کتنی ہے اور آپ کا سماجی پس منظر کیا ہے۔ جب تک آپ اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے تگ و دو نہیں کرتے، صلاحیتوں کا ظہور پوری طرح نہ ہوگا۔ انسانی آسودگی کا تعلق اس بات سے ہے کہ کوئی شخص اپنے مقصد حیات سے کتنا باخبر ہے۔ اگر آپ کی خارجی دنیا میں خواہ طوفانوں کا شور برپا ہو، اگر اس وقت آپ اپنے خواب کے لیے سرگرداں ہیں تو آپ کے اندر کی دنیا میں اطمینان جاگزیں ہوگا۔

باب چہارم

خستہ حال جمہوریت

سیاسی حکومت تھی یا فوجی، 1980ء اور 1990ء کے عشروں میں زوال کی طرف ملک کا سفر جاری رہا، خود اپنی قیادت کی مہربانیوں کے طفیل۔ ڈھنگ کا صرف ایک کام اس اثنا میں ہم کرتے رہے۔ سکواش، ہاکی اور کرکٹ کے کھیلوں میں قابلِ فخر کارکردگی۔ اس قوم کے لیے جو خدمت میں انجام دے سکا وہ 1992ء کا عالمی کپ تھا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ کا بدترین لمحہ وہ تھا جب ہم نے مشرقی پاکستان کھو دیا اور بہترین میں سے ایک وہ جب ہم نے کرکٹ کا عالمی تاج پہنا۔ شاید یہ آخری دن تھا جب پورا ملک متحد نظر آیا۔ سب کے سب جشن منا رہے تھے۔ جوش و جذبے سے بھرے لوگ اور ایک ساتھ نعرہ زن، اس روز میں نے جانا کہ یقین کی قوت کس طرح عزم کا شعلہ بھڑکا دیتی ہے۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ ایک پوری قوم کی فتح کا لطف و انبساط ہوتا کیا ہے۔ کرکٹ کے میدان میں اس روز قیادت کی ذمہ داری مجھ پر تھی، سیاست میں یہ کردار ابھی مجھے ادا کرنا ہے...... انشاءاللہ۔

جولائی 1988ء میں جب میں سسیکس کاؤنٹی (Sussex County) کے لیے کھیلا

کرتا اور لندن میں مقیم تھا، پاکستان سے کسی نے میرے ساتھ فون پر رابطہ کیا۔ یہ میرے دوست اشرف نوابی تھے، جنرل محمد ضیاء الحق کے رفیق۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا میں جنرل کی کابینہ میں وزیر بننا پسند کروں گا۔ محمد خان جونیجو کی حکومت ابھی چند ہفتے قبل ختم کر دی گئی تھی جو شاید ملک کی حالیہ تاریخ کے سب سے زیادہ محترم وزیراعظم تھے۔

انھیں اقتدار سونپتے ہوئے جنرل کا گمان یہ تھا کہ وہ بہت لچک دار اور اطاعت شعار ثابت ہوں گے مگر وہ مختلف نکلے اور اپنی بات پر اصرار کرنے لگے۔ خاص طور پر صدر کی طرف سے جنیوا معاہدے پر دستخط سے انکار پر جونیجو نے صدائے احتجاج بلند کی، جس کے تحت افغانستان میں جنگ بند ہو جاتی۔ انہوں نے سرکاری دفاتر میں سادگی کو رواج دینے کی کوشش کی۔ ماضی کے اکثر حکمرانوں کے برعکس جو مغل حکمرانوں ایسی شان و شوکت کے آرزومند اور عادی رہے، اعلیٰ سرکاری افسروں کو انہوں نے سوزوکی کار کا دلکش تحفہ دیا۔

اپنی مثال کے ذریعے وہ وزراء اور اعلیٰ افسروں کو ترغیب دینے لگے کہ وہ کرّوفر سے نجات پائیں۔ نوابی کی پیش کش نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ میں نے شائستگی کے ساتھ انکار کر دیا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں۔ اگلے دن جنرل صاحب کے صاجزادے ڈاکٹر انوار الحق کا فون آیا کہ ملک کی خاطر میں حکومت کا حصہ بن جاؤں۔ جواں سال معالج نے کہا کہ ان کے والد روایتی لیڈروں سے بے زار ہیں جو محض ذاتی مفاد کے لیے سیاست کرتے ہیں۔ ان کے بقول میری طرح کے دیانت دار لوگوں کی کابینہ کو سخت ضرورت تھی۔ یہ بات مجھے مضحکہ خیز سی لگی۔ غیر جماعتی بنیادوں پر ملک کے فوجی حکمران نے الیکشن کرائے تھے اور اب بھی کرانا چاہتا تھا۔ قانون کی حکمرانی کا تصور تک نہیں تھا۔ ڈاکٹر انوار الحق نے میری بہت تعریف کی مگر میں ان کی بات کیسے مان لیتا؟

چند روز بعد جنرل محمد ضیاء الحق بہت سے اعلیٰ فوجی افسران اور امریکی سفیر کے ہمراہ ایک

پراسرار فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اس وقت میں فرانس کے جنوب میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ یہ بہت صدمے کی بات تھی، بھٹو کی موت ایسی۔ ان کا معاملہ اگرچہ مختلف تھا کہ عدالت کے ذریعے انہیں سزا دلوائی گئی اور ان کی موت بہت زیادہ غیر متوقع واقعہ بہرحال نہ تھی۔ حادثے کی وجہ ابھی تک ایک راز ہے، ایک گہرا تاریک راز۔

شبہ یہ تھا کہ اس میں سی آئی اے ملوث ہے۔ جنرل کے قتل کا فیصلہ تبھی ہو گیا تھا جب اس نے امریکہ کے تجویز کردہ راستے پر چلنے سے انکار کیا۔ اس کی موت کے بعد ملک کی حالت وہی تھی جو مشرف کی رخصتی کے بعد ہوئی۔ جوش و جذبہ کہ پھر سے ہم آزاد ہو جائیں گے، آمریت اور کرپشن سے نجات پالیں گے، میڈیا آزاد ہو گا اور گاڑی پھر سے جمہوریت کی پٹڑی پہ چڑھ جائے گی۔ تین ماہ بعد نئے الیکشن ہوئے اور بھٹو کی بیٹی، بینظیر وزیراعظم بن گئیں۔ طویل عرصے کے بعد بظاہر یہ آزادانہ اور منصفانہ الیکشن تھے۔ اکثر پاکستانیوں کی طرح مجھے بھی ان سے بہت سی توقعات تھیں۔ مغرب کے جمہوری معاشروں کا انہیں تجربہ تھا، ہارورڈ اور اوکسفرڈ یونیورسٹیوں میں انہوں نے تعلیم پائی تھی۔ قدرت نے انہیں موقع دیا کہ چاہیں تو ملک میں ایک نئے دور کا آغاز کر دیں۔ خوش حال وہ پہلے سے تھیں۔ ہمارا خیال تھا، اس دولت کی انہیں ضرورت نہیں جو اقتدار کے بل بوتے پر کمائی جاتی ہے۔ وہ مقبول تھیں اور مغرب میں ہماری سب سے زیادہ جانی پہچانی شخصیت بھی۔ مغربی میڈیا ان کے لیے نغمہ زن تھا۔ ایک کرشماتی رہنما کی طرح دار کا نورِ نظر جو پھانسی چڑھا تھا۔ مغربی میڈیا کے سامنے بینظیر بھٹو نے بڑی کامیابی سے ''دخترِ مشرق'' کا انوکھا کردار ادا کیا۔

بےنظیر کے اقتدار سنبھالنے سے پہلے کچھ نہ کچھ خدشات تو موجود تھے تاہم اس قدر بھی نہیں کہ تمام امیدیں ہی تحلیل ہونے لگتیں۔ سب سے بڑا صدمہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو پہنچا جو جمہوریت کے لیے برسوں تک جنرل محمد ضیاء الحق کی جیلوں میں سڑتے رہے تھے۔ ان کی

جدوجہد کا محور تو ایک خوش حال اور مساویانہ معاشرہ تھا۔ ہر ایک کو جہاں انصاف ملے، چاندی جیسا دودھ ملے اور پانی صاف ملے مگر کچھ بھی، کچھ بھی نہ ملا۔ انہوں نے جمہوری نظام کا اس وقت تماشا سا بنا دیا جب ارکان اسمبلی کو خریدنے کے لیے وہ نواز شریف کے مقابل بولی دینے لگیں۔ نظریہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سیاست دان نیلام ہوئے، آزاد ارکان اور ان کے عزیز و اقارب پر پیش کشیں بارش کی طرح برسیں۔ ''چھانگا مانگا کلچر'' کی اصطلاح میاں محمد نواز شریف کے اسی کارنامے کی یاد دلاتی ہے۔ اپنے ارکان اسمبلی کو انہوں نے لاہور کے قریب ایک جنگل میں جا آباد کیا تا کہ پیپلز پارٹی والے زیادہ قیمت دے کر انہیں خرید نہ لیں۔

بہت دن نہ گزرے تھے کہ بینظیر سے ہم سب مایوس ہو گئے۔ وزیر اعظم کی بجائے وہ ایک ملکہ جیسی زندگی گزارنے لگیں۔ ان کی وفات کے بعد ولیم ڈلرمپل (William Dalrymple) نے ان دنوں کو یاد کیا جب وزیر اعظم کے طور پر اس نے ان کا انٹرویو کیا تھا اور شاہانہ بلکہ شہنشاہانہ انداز کا حامل پایا۔ اس نے لکھا ہے ''ارادتاً وہ نپے تلے اور پرشکوہ انداز میں بات کرتی تھیں اور میں کی بجائے ''ہم'' کہہ کر اپنا حوالہ دیتیں۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو میں شاہانہ انداز کی جھلک تو پہلے سے موجود تھی۔'' وہ ایک شخص کی دھجیاں اڑا رہی تھیں، پہلی بار جب میری ان سے ملاقات ہوئی۔ اس نے ان کی سوشلسٹ ساکھ پر سوال اٹھانے کی جسارت کی تھی۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی کے طالب علم کی حیثیت سے میں اداکار آرٹ ملک (Art Malik) کے بھائی ضیاء ملک کے ساتھ ایک مکان میں شراکت دار تھا۔ ایک دن میں گھر لوٹا تو بحث کرتی ہوئی ایک خاتون کی آواز سنائی دی۔ میں نے موٹر سائیکل کو تالا لگایا اور اندر داخل ہوا۔ ضیاء ملک نے بے نظیر سے ملاقات کے لیے اوکسفرڈ کے پاکستانی طلبا کو مدعو کر رکھا تھا۔ اپنی مہمان کو مگر اس نے برہم کر لیا۔ اس نے یہ کہا تھا کہ سندھ میں زرعی اصلاحات پوری طرح نافذ کیوں نہ ہوئیں؟ بے نظیر کی یہ دکھتی رگ تھی۔ اس کے والد نے علامتی طور پر ہی سہی 1972ء میں جاگیرداروں کی

طاقت کو محدود کرنے کی کوشش کی تھی۔ بے نظیر کو میں نے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اس اولین ملاقات کے بعد ہم اچھے دوست بن گئے۔ ان کی شہرت یہ تھی کہ انگریزوں سے وہ بہت نرمی سے پیش آتی ہیں اور پاکستانیوں کے ساتھ وہ تکبر سے ملتی ہیں۔ 1974ء میں نیدرلینڈ کے سفارتخانے میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کے اعزاز میں دی گئی ایک ضیافت مجھے یاد آتی ہے۔ 20 سال کی یہ محترم خاتون جہاندیدہ سفیر کو اس طرح حکم دے رہی تھیں جیسے وہ ان کا ذاتی ملازم ہو۔ ہم سب کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ بڑی مستعدی کے ساتھ وہ بے نظیر بھٹو کے لیے میز کرسیاں سجانے اور ترتیب دینے میں جتا تھا۔

ابتدا ہی سے یہ بھی عیاں تھا کہ بے نظیر کی پرواز بلند تھی۔ وہ برتری اور جاہ و حشمت کی آرزو مند تھیں۔ میں تو وہاں سے چلا آیا مگر بے نظیر مزید ایک برس اوکسفرڈ یونیورسٹی میں قیام پذیر رہیں۔ میرا خیال ہے اس لیے کہ وہ طلبا یونین کی صدر بننے کا پختہ عزم رکھتی تھیں۔ محترمہ کا مسئلہ یہ تھا کہ وزیر اعظم بننے سے قبل انہوں نے کبھی کوئی ذمہ داری نہ سنبھالی تھی، پہلا منصب اور وہ بھی اس قدر گراں بار۔ وزیر اعظم وہ اس لیے بن گئیں کہ بھٹو کی بیٹی تھیں جس طرح کہ 19 سال کی عمر میں بلاول پیپلز پارٹی کا چیئرمین چن لیا گیا۔ چھ ماہ بے نظیر نے جیل کاٹی اور برسوں تک گھر پہ نظر بند رہیں، پارٹی کی قیادت کے لیے مگر انہیں کوئی جدوجہد نہ کرنا پڑی، نہ ہی سیاسی تجربہ حاصل کرنے کے لیے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا پڑا۔ میں اس امتحان کی اہمیت کو کم کر کے پیش نہیں کرنا چاہتا، باپ کی پھانسی کے بعد جس سے وہ گزریں۔ ملک چلانے کے لیے یہ تجربہ مگر کافی نہ تھا۔ کس طرح آپ پاکستان ایسے پیچیدہ ملک کو بطریق احسن چلا سکتے ہیں جب کہ اس سے پہلے آپ نے کبھی کوئی کام ہی نہ کیا ہو۔ قیادت کی سنگلاخ راہوں سے وہ نہ گزری تھیں چنانچہ بصیرت جاگی اور نہ کوئی نظریہ جنم لے سکا۔ حسن انتظام اور ادارہ سازی کا فن ابھی وہ سیکھ نہ پائی تھیں۔ کسی کاروباری کمپنی کا انتظامی سربراہ یا فوج کا جنرل بننے کے لیے بھی آپ کو ایک نہیں

کئی طرح کی مہارت درکار ہوتی ہے۔ یکے بعد دیگرے طرح طرح کی ذمہ داریوں کا بوجھ آپ اٹھاتے ہیں تو اس قابل ہوتے ہیں کہ سربراہی سنبھال سکیں۔ سیاست میں خاندانی میراث، نااہلی اور قیادت کے زوال پر تمام ہوتی ہے۔ جنوبی ایشیا میں سیاست کی سڑاند کا ایک بڑا سبب خاندانوں کا غلبہ بھی ہے۔ بعض اعتبار سے خاندانی سیاست بادشاہت سے بھی بدتر ہے۔ شاہی خاندانوں میں شہزادوں اور شہزادیوں کو کم از کم تربیت کے مراحل سے تو گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ بیرون ملک گزارنے والا بلاول بھٹو زیادہ اہلیت رکھتا ہے یا مغربی دنیا کا شہزادہ چارلز؟ چارلز کو حالانکہ حکومت نہیں سنبھالنی۔

بے نظیر بھٹو کاروبارِ حکومت کے لیے ناتجربہ کار تو تھیں ہی مگر شوہر کے انتخاب میں بھی وہ بدقسمت ثابت ہوئیں۔ پولو کے اس کھیل کے سوا، گنتی کے لوگ ہی جس میں دلچسپی رکھتے ہیں، زندگی میں کوئی کارہائے نمایاں انہوں نے سرانجام نہ دیے۔ سندھ کے ایک زمیندار گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ بے نظیر بھٹو کا دفاع مقصود ہو تو کہا جاتا کہ جس صورت حال سے وہ دوچار تھیں اس میں ایک اچھے شوہر کا حصول ان کے لیے سہل نہ تھا۔ ان کی عمر 34 سال ہوگئی تھی۔ قومی معیار اور مزاج کو ملحوظ رکھا جائے تو شادی کا بہترین وقت گزر چکا تھا۔ مزید یہ کہ بھٹو خاندان کو فوجی حکومت ہراساں رکھتی تھی۔ لوگ ان کے ساتھ رابطہ رکھتے ہوئے ڈرا کرتے۔ پاکستانی سیاست میں حکومت کا مخالف ہونے کا مطلب خطرات سے دوچار رہنے کے سوا کچھ نہیں۔ روایتی خاندانوں سے گھل مل جانا بے نظیر کے لیے مشکل تھا۔ ایک مرحلے پر اپنے ایک کزن قمر خان سے میں نے محترمہ کی ملاقات کرائی۔ شادی کے بارے میں انہوں نے سوچا مگر ایک حادثہ ہوگیا۔ ان کے بھائی مرتضیٰ بھٹو نے اپنے والد کی موت کا انتقام لینے کے لیے ''الذوالفقار'' کے نام سے ایک تنظیم بنا رکھی تھی، پی آئی اے کا ایک طیارہ اس نے اغوا کرلیا۔ جب تک اس معاملے سے اڑنے والا گرد و غبار بیٹھتا، قمر خان شادی کر چکا تھا۔ اب آصف علی

زرداری سے ان کا بیاہ ہوا۔ اوّل اوّل انہوں نے اس شخص سے بڑی محبت کی۔ اسے موقع دیا کہ ان کے اقتدار کو جس قدر چاہے دولت سمیٹنے اور رسوخ پھیلانے کے لیے استعمال کرے۔ ان صاحب نے پاکستان کو ذاتی جاگیر سمجھ لیا، اپنا حق سمجھا کہ طاقت کی نمائش اور سرکاری ٹھیکوں پر کمیشن وصول فرمایا کرے۔ فرانس اور برطانیہ کی جائدادیں اسی دولت سے خریدی گئیں۔ جلد ہی اسے ''مسٹر ٹین پرسنٹ'' کہا جانے لگا۔ اگرچہ اپنے واحد تجربے کی بنیاد پر میں یہ عرض کروں گا کہ اس کی قیمت اتنی کم نہ تھی بلکہ اس سے دوگنا تھی۔

ان دنوں میں ہسپتال کی تعمیر میں مصروف تھا۔ اگرچہ اسی ذمہ داری نے بعد ازاں موصوف کے بارے میں مجھے اور بہت کچھ جاننے کے مواقع بھی مہیا کیے تاہم یہاں پہلی ملاقات کا ذکر ہے۔ کراچی کے بلاول ہاؤس میں بے نظیر سے ملنے گیا۔ حسنِ ظن یہ تھا کہ چونکہ میں وہ کام کر رہا ہوں دراصل جو حکومت کو کرنا چاہیے میری مدد کی جائے گی۔ محترمہ چونکہ مصروف تھیں چنانچہ زرداری صاحب سے ملاقات ٹھہری۔ چونکہ اوکسفرڈ میں بے نظیر بھٹو سے میرا تعلق خوش گوار رہا تھا لہٰذا امید یہ تھی کہ رویہ اچھا ہی ہوگا۔ زرداری صاحب خوش دلی سے پیش آئے اور ایک چھکنے والے طرح دار آدمی نکلے۔ ازراہِ کرم میری انہوں نے ستائش کی، ہسپتال کے لیے مگر امداد کا نام تک نہ لیا اور میرے دوست طارق شفیع سے باتیں کرتے رہے۔ طارق شفیق کا تعلق ٹیکسٹائل انڈسٹری سے ہے۔ اس کاروبار میں ان کا خاندان ممتاز ہے۔ زرداری نے ان سے کہا کہ وہ سندھ میں دو فیکٹریاں قائم کریں۔ ان کے بقول تاکہ اس طرح وہ اپنے لوگوں کو ملازمتیں فراہم کرسکیں۔ تجویز یہ فرمایا کہ اگر وہ 20 فیصد خود انہیں دے سکیں تو تمام سرکاری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی اور سرکاری بینکوں سے جتنا قرض چاہیں انہیں مل جائے گا۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ بے نظیر بھٹو یا ان کے میاں نے ہسپتال کی کبھی کوئی مدد نہ کی۔ میری حیرت کا اندازہ کیجیے، پانچ برس بعد میرے ایک دوست نوید ملک اس وقت میرے پاس تشریف

لائے جب بے نظیر بھٹو کی حکومت کرپشن کے الزامات پر بدنام ہو کر برطرف ہونے والی تھی۔ نوید ملک کو برسوں سے میں نے دیکھا نہیں تھا۔ انہوں نے بے نظیر بھٹو اور آصف زرداری کی فرمائش سے مجھے آگاہ کیا۔ وہ ہمیں شوکت خانم ہسپتال کے افتتاح کا اعزاز عطا کرنے پر آمادہ تھے۔ چھوٹے پیمانے پر کام اگرچہ پہلے ہی شروع ہو چکا تھا مگر افتتاح کے لیے ہم نے 29 دسمبر 1994ء کا دن تجویز کیا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھنے والی دس سالہ بچی سمیرہ یوسف کے ہاتھوں سے یہ رسم انجام پائے۔ عام حالات میں ایک ہسپتال کے لیے اعزاز ہوتا کہ وزیراعظم کے ہاتھوں افتتاح ہو مگر میں نے انکار کر دیا۔ شاہی جوڑے کو انکار کی قیمت مجھے بعد میں چکانا پڑی۔ کرپشن کی وجہ سے میاں بیوی بدنام تھے۔ انہوں نے یہ سوچا تھا کہ اس شاندار ہسپتال کے افتتاح سے ان کا تاثر بہتر ہو جائے گا۔ چھ ہفتے، پورے چھ ہفتے، میں ملک بھر کے گلی کوچوں میں عوام کے درمیان تھا۔ شاید انہوں نے اس میں ایک سیاسی خطرے کی بو سونگھی ہو۔ یہ دورہ ایک انتخابی مہم سے مماثلت رکھتا تھا۔ جہاں کہیں میں جاتا ہزاروں لوگ ہجوم کرتے کہ عطیات دیں۔ انہی میں سے بعض مجھ سے کہتے کہ میں سیاست میں حصہ لوں۔ پہلی بار میڈیا میں بھی اس طرح کی باتیں ہونے لگیں۔

1990ء میں برطرف ہو کر 1993ء میں بے نظیر بھٹو دوبارہ اقتدار میں آئیں۔ درمیانی عرصہ نواز شریف کا تھا۔ لوگوں نے سوچا، شاید یہ آدمی کچھ بہتر ثابت ہو۔ وطن کو تعمیر کرنے کی بجائے عالی جناب اپنی صنعتی سلطنت کے فروغ میں مصروف پائے گئے۔ 1985ء سے 1992ء تک اوّل وزیراعلیٰ اور پھر وزیراعظم کی حیثیت سے کمال مستعدی کے ساتھ اپنے کاروبار کو انہوں نے 4000 گنا بڑھا لیا۔ سیاستدانوں کی خریداری کے مشن کو انہوں نے بام عروج پر پہنچا دیا۔ 1970ء میں پہلی بار جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو وہ ایک عام سے آدمی لگے، کسی عظیم تمنا، مقصد اور خواب سے محروم، سیاست سے زیادہ کرکٹ میں مبتلا۔ میرا

خیال ہے کہ ان کا اصل خواب وزارتِ عظمیٰ کی بجائے پاکستان کرکٹ ٹیم کی کپتانی تھی۔ وہ اس کھیل سے وابستہ چکا چوند کے عاشق تھے۔

1987ء کے موسم خزاں میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا جو نواز شریف کی ذہنیت کا عکاس ہے۔ 1987ء کے عالمی کپ سے قبل جب میں پاکستانی ٹیم کا کپتان تھا، لاہور کے قذافی سٹیڈیم میں ہمیں ویسٹ انڈیز کے ساتھ ایک دوستانہ میچ کھیلنا تھا۔ آغاز سے کچھ ہی دیر قبل کرکٹ بورڈ کے سیکرٹری شاہد رفیع نے مجھے بتایا کہ آج نواز شریف ٹیم کی کپتانی فرمائیں گے۔ میں حیران تو ہوا مگر یہ سمجھا کہ وہ ڈریسنگ روم میں بیٹھ کر مقابلہ دیکھنے کے آرزومند ہیں اور شرکت محض نمائشی۔ دھچکا تب لگا جب میں نے انہیں ویسٹ انڈیز کے کپتان ویورچرڈز (Viv Richards) کے ساتھ ٹاس کے لیے جاتے دیکھا۔ دھماکا مگر اب ہونا تھا۔ ڈریسنگ روم میں نواز شریف صاحب واپس آئے اور پیڈ باندھنے لگے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ مدثر نذر کے ساتھ بیٹنگ کا آغاز کرنے کا فیصلہ فرما چکے تھے۔ گھٹنوں، ٹانگوں اور کمر پر ہیلمٹ اور مخصوص دستانوں سمیت مدثر نے وہ سب کچھ پہنا جو پہنا جا سکتا تھا، ویسٹ انڈیز کے باؤلروں کا مقابلہ کرنے کے لیے۔ کرکٹ کی تاریخ میں یہ سب سے زیادہ تیز گیند پھینکنے والے خطرناک باؤلر تھے۔ نواز شریف کے سر پہ ایک خوب صورت نمائشی ٹوپی، بیٹنگ پیڈ اور ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ جو لوگ کرکٹ کی تاریخ سے واقف نہیں ان کی اطلاع کے لیے اس ٹیم میں چار باؤلر ایسے تھے جو 90 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ گیند پھینکتے تھے۔ کئی عظیم کھلاڑیوں کا مستقبل اس جارحانہ ٹیم نے برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ جب ان کا سامنا کرنا ہوتا تو ایک سے بڑا ایک بلّے باز ڈراؤنے خواب دیکھا کرتا۔ اور یہ تھے وزیراعلیٰ نواز شریف جو اس حال میں ان کا سامنا کرنے چلے تھے۔ اس سطح کی کرکٹ کا انہیں ہرگز کوئی تجربہ نہ تھا۔ خراماں خراماں وہ میدان میں اترے۔ گولی کی رفتار سے آتی گیند آ کر

جناب سے جاٹکرائی تو کیا ہوگا؟ بے چینی سے میں نے پوچھا کہ کیا ایمبولینس کا کوئی انتظام ہے؟

حیرت زدہ اور مبہوت ہم سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ ساڑھے چھ فٹ لمبے ویسٹ انڈین باؤلر نے پہلی گیند پھینکی تو نواز شریف کے بلّا اٹھانے سے پہلے ہی وہ وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں جا پہنچی۔ ٹیم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ گیند سیدھی نہ آئی تھی۔ دوسری بدقسمتی سے سیدھی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ سمجھ سکیں، وکٹیں گر چکی تھیں۔ جو لوگ کرکٹ نہیں جانتے، سمجھانے کی خاطر مثال یہ ہے کہ نواز شریف پرائمری سکول کے ایک بچے کی طرح سکول کی اپنی کاپی کا مقابلہ پی ایچ ڈی کے مقالے سے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب میں سکول میں پڑھتا تھا تو اکثر دن کے اجالے میں ایک خواب دیکھا کرتا۔ ایک ٹیسٹ میچ کے گراؤنڈ میں موجود ہوں۔ اچانک پتا چلتا ہے کہ ٹیم کا ایک کھلاڑی کم ہے۔ ہیرو بننے کے لیے میں اپنا ہاتھ کھڑا کرتا ہوں۔ نواز شریف کا حال بھی یہی تھا۔ ہنرمندی کی آخری سیڑھی تک پہنچنے کے لیے برسوں کی ریاضت کے بغیر ہی وہ منزل تک جا پہنچنے کے خواہاں تھے۔ ہوش سنبھالا تو مجھے معلوم ہوا کہ زندگی میں کوئی مختصر راستہ نہیں ہوتا۔ کسی بھی شے میں بہترین کامیابی کے لیے امتحان کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں ملک کے سب سے بڑے صوبے کا وزیر اعلیٰ کھڑا ہے، بچوں کی طرح سپنے دیکھتا ہوا وہ "معصوم"، کمسن۔

سیاست میں نواز شریف کو ان کے والد نے دھکیلا کہ ان کے کاروبار کا تحفظ کرنے کے قابل ہو سکے۔ بے نظیر بھٹو ہی کی طرح جب ذمہ داری سنبھالی تو موصوف بھی کچھ زیادہ تجربہ نہ رکھتے تھے۔ سوجھ بوجھ اور مہارت کی بجائے جنرل محمد ضیاء الحق کی خوشنودی کے بل پر راستہ بنایا۔ وزیر خزانہ سے 1985ء میں وہ وزیر اعلیٰ بن گئے۔ فوجی حکمران ہمیشہ لچک دار سیاستدانوں کے متلاشی رہے اور نواز شریف اس لحاظ سے موزوں ترین تھے۔ قومی ذمہ داری کے بجائے نواز شریف نے اقتدار کو دولت بٹورنے کا ایک ذریعہ سمجھا۔ 1990ء میں ایک بار جب وزارتِ

عظمیٰ حاصل کر لی تو خاندان کے اثاثے قومی بینکوں کے قرضوں کی مدد سے غبارے کی طرح پھولنے لگے۔ ان میں سے کچھ قرضے کبھی واپس نہ کیے گئے۔ صورت حال ایسی تھی کہ کئی اخبارات کو لکھنا پڑا کہ بعض لیڈر کروڑوں اربوں ہتھیانے کے لیے بینکوں کو دھمکاتے ہیں۔ شریفوں کے دور ہی میں لفافے کی صحافت پھلی پھولی۔ صحافیوں کو انہوں نے پیسہ دے کر خریدا اور سیاسی کارکنوں کو پلاٹوں کی بارش سے۔ آصف علی زرداری کی طرح نواز شریف بھی پاکستان کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک ہیں۔ اقتدار سنبھالنے کے تین سال بعد بدعنوانی کے الزام میں انہیں برطرف کر دیا گیا جس کے بعد بے نظیر بھٹو پھر سے برسرِ اقتدار آ گئیں۔ 1997ء میں وہ دوسری بار وزیر اعظم بن گئے۔ ایک کے بعد دوسرے کی باری، بدعنوان حکومتوں کی یہ جھولا جھلائی عوام کے لیے ویسا ہی دردِ سر تھی جیسی کہ خود سیاستدانوں کے لیے۔ آصف علی زرداری کی سیاسی زندگی ہمیں بتاتی ہے کہ پاکستان کا سیاسی نظام کیا ہے اور کس طرح کام کرتا ہے۔ 1990ء میں بے نظیر برطرف ہوئیں تو اس شخص کو ایوانِ وزیر اعظم سے براہ راست جیل لے جایا گیا۔ 1993ء میں وہ برسرِ اقتدار آئیں تو اس سے پہلے ہی وہ جیل سے نکل کر عبوری کابینہ میں وزیر بنائے جا چکے تھے۔ 1996ء میں محترمہ دوبارہ نکالی گئیں تو موصوف پھر ایوان وزیر اعظم سے زنداں میں جا پہنچے۔ جیسے ہی موصوف ملک کے صدر بنے تمام الزامات سے وہ بری الذمہ ٹھہرے۔ یہ ہے ہمارا نظامِ انصاف، طاقت ور نہیں، وہ کمزور کے خلاف بروئے کار آتا ہے۔ حکمران خواہ جرائم پیشہ ہوں، ان کی حفاظت کرتا ہے۔

بے نظیر بھٹو اور نواز شریف جب بھی اقتدار میں آئے لوگوں نے سوچا شاید اپوزیشن میں اپنے تجربات اور جلاوطنی سے انہوں نے کوئی سبق سیکھا ہوگا، مگر کہاں؟ اکثر لوگوں کی طرح میں بھی اپنے وطن کو مایوسی کے عالم میں ڈھلوان سے اترتا ہوا دیکھتا رہا۔ 1990ء کے عشرے میں پاکستانی قنوطیت کا شکار ہونے لگے۔ ملک میں افراتفری اور بدامنی بڑھتی چلی گئی۔ تقریباً ہر قومی

ادارہ تباہ کر دیا گیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں، ایوانِ وزیراعظم سے وزراء تک، وزراء سے ارکان پارلیمنٹ اور افسر شاہی سے پولیس اور عدالتوں تک کرپشن کینسر کی طرح پھیلتی گیا۔ 1990ء میں ہائیکورٹ نے آئی جی پولیس عباس خان سے پوچھا، ''پولیس میں اس قدر بدعنوانی کیوں ہے؟'' ان کا جواب تھا، ''25,000 پولیس والے سفارش پر بھرتی ہوئے اور ان میں سے بعض جرائم پیشہ ہیں۔'' انہوں نے نواز شریف کی قیادت میں کام کرنے والی پنجاب حکومت کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ سندھ میں پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کی مشترکہ حکومت نے بالکل یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ اپنے لوگ انہوں نے قانون نافذ کرنے والے ادارے میں ٹھونس دیے حالانکہ ان میں سے بعض قانون کے مجرم تھے۔ پولیس اس طرح تباہ کر دی گئی اور یہ جان بوجھ کر ہوا کیونکہ وہ الیکشن جیتنے اور مخالفین کی زندگی حرام کرنے کے کام آتی ہے۔ معاشرے کا اخلاقی پیرہن ادھڑنے لگا۔ 1996ء میں ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل نے 58 ملکوں کے مقابلے میں پاکستان کو دنیا کا دوسرا سب سے زیادہ کرپٹ ملک قرار دیا۔ معیشت کا حال بھی یہی تھا۔ بالواسطہ ٹیکسوں کی وجہ سے بے روزگاری اور افراطِ زر نے فروغ پایا۔ عام لوگ جرائم کی طرف مائل ہونے لگے۔ 1990ء کے عشرے میں معیشت کی شرح نمو کم ہوئی، برآمدات، ٹیکسوں کی آمدن اور ترقیاتی اخراجات بھی کم ہوئے اور غربت میں اضافہ ہوا۔ 1998ء میں ایٹمی دھماکوں کی وجہ سے عائد ہونے والی اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے صورت حال مزید گھمبیر ہوگئی۔

جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ دکھ پہنچایا وہ ماحولیاتی آلودگی اور ثقافتی بحران تھا۔ میرے لیے ملک کا حسن شہروں میں نہیں، پہاڑوں، میدانوں اور وادیوں میں ہوتا ہے۔ 1980ء کے عشرے میں ماحولیاتی حسن کو برقرار رکھنے کی تحریک جوبن پر تھی۔ ادھر پاکستان میں ہم ہر وہ چیز بے دردی سے برباد کر رہے تھے جسے بچا رکھنا ضروری تھا۔ جنگل کٹ گئے، دریا آلودہ ہوئے، تاریخی یادگاریں خستہ و بدحال اور سب سے بڑھ کر جنگلی حیات معدوم ہوتی گئی۔

جمہوری حکومتوں میں جنگل اور بھی زیادہ تیزی سے کاٹے گئے۔ درختوں کی غیر قانونی کمائی سے اندھا دھند دولت کمانے والے ٹمبر مافیا کے سرکردہ اتنے امیر ہوگئے کہ پارلیمنٹ میں پہنچنے لگے۔ برطانوی اخبار گارڈین نے لکھا: ''درختوں کو تباہ کر دینے والی مافیا پاکستان میں سے زیادہ طاقت ور جرائم پیشہ گروہوں میں سے ایک ہے۔ ہر سال اربوں روپے کے شجر وہ کاٹ پھینکتے ہیں۔'' 1993ء کے موسم گرما میں، جب میں شاہراہ قراقرم پہ محو سفر تھا، مجھے پچاس میل تک دیار کے درختوں کی 'لاشیں' نظر آئیں۔ مجھے اس قدر رنج پہنچا کہ نگران وزیراعظم معین قریشی کو میں نے ایک خط لکھا۔ ان لوگوں کے خلاف انہوں نے کارروائی کا آغاز کیا، مگر کب تک؟ مسئلہ یہ بھی ہے کہ برطانوی راج کے بعد سے اب تک جنگلات تباہ کرنے کے خلاف بنائے گئے قانون میں ترمیم نہیں کی گئی۔ فقط چند سو روپے جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔ 2009ء میں اقوام متحدہ کے ادارہ خوراک وزراعت کی طرف سے کیے گئے ایک سروے کے مطابق پاکستان میں جنگلات کی شرح دنیا بھر میں سب سے کم ہے یعنی 2.5 فیصد۔ دوسری طرف ہمارے یہاں جنگلات کاٹنے کی رفتار ایشیا میں سب سے زیادہ ہے یعنی 2.1 فیصد سالانہ۔ ملک کا بڑا حصہ چونکہ بارانی اور نیم بارانی ہے لہٰذا جنگلاتی علاقہ یوں بھی بہت کم ہے۔ اس پر بڑے پیمانے کی غیر قانونی کٹائی چنانچہ اس پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے کہ سیلاب معمول بنتے جا رہے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری حکومت نے جنگلات اور آبی وسائل کو محدود تر ہونے دیا جبکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے وسائل کم سے کم تر ہوتے چلے گئے۔ بدقسمتی سے ماحولیاتی حسن اور جمالیاتی تقاضوں کا ہمارے سیاستدانوں کو ہرگز کوئی ادراک نہیں۔ ان میں سے اکثر روپیہ کمانے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ اجنبی ملکوں میں شاندار مقامات پر ان کے گھر ہیں۔ اپنے بچوں کو وہ مری نہیں، امریکہ اور کینیڈا میں پڑھاتے ہیں۔ قوم کے مستقبل سے ان کی کوئی وابستگی نہیں۔ جب بھی حکومت بدلتی ہے تو بددیانت سیاستدانوں کے ریوڑ باہر کی راہ لیتے اور اپنے محفوظ ٹھکانوں میں پناہ گزین ہو

جاتے ہیں۔ تب تک وہ وہاں ٹھہرتے ہیں جب تک حکومت کمزور نہ ہو جائے۔ اس کے بعد شکار کے لیے واپس آجاتے ہیں۔ ان میں سے جو شہروں میں آباد ہیں، وہ پاکستان کے دیہی علاقوں سے یکسر نابلد ہیں۔ اسلام تو یہ سکھاتا ہے کہ نئی نسلوں کے لیے ان خزانوں کی حفاظت کی جائے مگر وہ ان کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہیں۔

سیاستدانوں نے ملک میں تباہی مچا کر مایوسی پھیلا رکھی تھی۔ جب پاکستان نے کرکٹ کا عالمی کپ جیتا، ماحول کو اس واقعہ نے گرما دیا اور قوم کے حوصلے بلند کر دیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میں اس دور کی کرکٹ کا حصہ بننے کا ارادہ ہی نہ رکھتا تھا۔ 1987ء کا عالمی کپ تمام ہو جانے کے بعد میں نے کرکٹ سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ جنرل محمد ضیاءالحق نے قومی ٹیلی ویژن پر خطاب کرتے ہوئے مجھ سے اپنا فیصلہ واپس لینے کی اپیل کی۔ قومی ٹیم کے اعزاز میں ایک عشائیے کے ہنگامے میں وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے اور کہا: ''حرفِ انکار سے میری بے عزتی نہ کر دینا۔'' انہوں نے مزید کہا ''میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے وطن کی خاطر کھیل میں لوٹ آؤ۔'' جذبۂ حب الوطنی کے زیر اثر اب مجھے ''ہاں'' کہنا تھا...... ایک اور سبب بھی تھا ایک پیاسی تمنا کہ کاش میں ایک بار ویسٹ انڈیز کو ہرا سکوں۔ عالمی کپ کے ساتھ ساتھ بھارت اور انگلینڈ کو اُن کی اپنی ہی سرزمین پر شکست فاش سے دوچار کرنے کی خواہش کے علاوہ مجھے ویسٹ انڈیز کے ساتھ مقابلے کا موقع بھی مل گیا، جب آسٹریلیا نے وہاں کا دورہ منسوخ کر دیا اور اس کی بجائے پاکستان کو دعوت دے دی گئی۔ جب اس ٹیم کے خلاف کوئی دوسرا ملک میدان میں اترتا تو فتح حاصل کرنے کے بارے میں کوئی سوچتا بھی نہ تھا، بس یہ کہ عزت بچائی جائے اور شکست قدرے وقار کے ساتھ رونما ہو۔ پندرہ برس میں ہم پہلی ٹیم تھے جو ان کے اپنے گھر میں، ان کے اپنے امپائروں کے ساتھ کھیلے۔ ہم اس ''اعزاز'' کے ساتھ واپس

ہوئے کہ میچ برابر رہا تھا۔ اگلے برس سے میں نے کرکٹ میں مصروفیت کم کر دی اور ہسپتال کو زیادہ وقت دیا۔ 1990ء میں ہم نے آسٹریلیا کا دورہ کیا اور تب مجھے یہ احساس ہوا کہ ہسپتال کے لیے بھاگ دوڑ کے باعث فرسٹ کلاس کرکٹ نہ کھیلنے کا مجھے کس قدر نقصان ہوا ہے۔ اس معیار پر میں کھیل نہ سکا جس کی امید مجھ سے کی جاتی تھی، خاص طور پر باؤلنگ میں۔ اس کے باوجود یہ احساس مجھے تھا کہ اگر میں ناکام ہو گیا تو ہسپتال کے لیے عطیات جمع کرنے کی مہم کو نقصان پہنچے گا۔ مسئلہ اور بھی سنگین ہو گیا کہ جس ٹیم کی قیادت مجھے سونپی گئی وہ ناقص تھی۔ دو سینئر کھلاڑی سبکدوش ہوئے تھے اور نئے ابھی جم نہ پائے تھے۔ اگرچہ یہ سیریز ہم ہار گئے لیکن ذاتی طور پر میں کامیاب رہا اور بطور بلّے باز آسٹریلیا میں سال کے بہترین کرکٹر کا خطاب میں نے جیتا۔ ٹیم لیڈر کی حیثیت سے بھی مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ کرکٹ وہ واحد کھیل ہے جس میں کپتان کا کردار بے حد اہم ہوتا ہے۔ دوسرے کھیلوں میں ایسا نہیں، ان میں کوچ کی اہمیت زیادہ ہوا کرتی ہے۔ کرکٹ کا کپتان نسبتاً کمزور ٹیم سے بھی بہتر کام لے سکتا ہے، جب کہ ایک کمزور کپتان بہتر ٹیم کی شکست کا باعث بن جاتا ہے۔ کپتان کو خود اپنے عملی کردار کی مثال سے رہنمائی کرنا ہوتی ہے۔ اگر وہ یہ جانتا ہے کہ اس کی ٹیم جاندار ہے تو خود اسے جرأت دکھانا ہوتی ہے۔ اگر اس کی خواہش یہ ہے کہ کھلاڑی اپنی ذات نہیں بلکہ ٹیم کے لیے کھیلیں تو اُسے بے غرض ہونا چاہیے۔ اگر وہ توقیر کا خواہاں ہے تو اس کا کردار بلند ہونا چاہیے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بحران میں دباؤ برداشت کرنے کی صلاحیت اس میں ہونی چاہیے، اسی لیے تو لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔

دباؤ میں آدمی تب آتا ہے جب شکست کا خوف اُسے آ لے۔ خطرہ باہر نہیں اندر ہوتا ہے، آدمی کے ذہن میں، کھیلنے کے لیے وکٹوں کی طرف جاتے ہوئے۔ جب ٹیم بحران میں ہو

اور اگر آپ پہلی گیند پر آؤٹ ہونے کے خوف کا شکار ہو گئے تو تباہی مقدر ہے۔ جب ناکامی کا اندیشہ ذہن کو جکڑ لیتا ہے تو منفی قیادت کی فصل اُگتی ہے۔ میرا طریق یہ تھا کہ کھیل کے آغاز ہی سے بحران کے لیے تیار رہتا۔ ساری توجہ اس بات پر مرکوز کہ مجھے کس طرح کھیلنا ہے۔ اندیشہ اگر ذہن میں پھوٹتا بھی تو میں اسے تھام کر روک دیتا۔ خوف زدہ ہونے کا فوری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھلاڑی کے ہاتھ ڈھنگ سے بروئے کار نہیں آتے۔ میں اپنے ہاتھوں کو ڈھیلا چھوڑ کر حرکت دیتا۔ سوچنے لگتا کہ کس طرح اپنی اننگ آگے بڑھاؤں۔ باؤلر کی حیثیت سے جب میں تیز ترین رفتار کو پہنچتا تو بلے بازی کے لیے میدان میں اترنے والے کھلاڑی کی جسمانی زبان پر غور کرتا، خاص طور پر اس کی آنکھوں میں جھانکتا؛ کیا اس میں خوف کی جھلک ہے؟ مقابلہ کم ہی مختلف ہوتا۔ میں ابتدائی چند مرحلوں کے بعد دباؤ کا سامنا کرنا سیکھ چکا تھا۔ کپتان بنا تو بڑے کھلاڑی جا چکے تھے اور مجھے ایک نوآموز ٹیم کی قیادت کرنا تھا۔ سامنے کی بات یہ تھی کہ اگر خود میں کچھ کر کے دکھا نہ سکا تو باقیوں سے کیا امید۔ کپتان خوف زدہ یا ناتجربہ کار ہو تو ٹیم سے کوئی امید نہ رکھنی چاہیے۔ انکشاف ہوا کہ لیڈر کا اصل کردار بحران میں ہوتا ہے۔ پے در پے بحران کا سامنا کر کے مشکل حالات میں کھیلنا میں نے سیکھ لیا۔ 1980ء میں دنیا میں سب سے اچھی، ویسٹ انڈیز کی ٹیم کا نسخہ تھا کہ وہ کپتان کو ہدف بناتی۔ مخالف ٹیم کا کیپٹن اگر ڈھے پڑا تو باقی کام آسان ہو جاتا۔ میرے نزدیک ٹیم کے لیڈر کی حیثیت سے میری سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس دہائی میں، میں واحد کپتان تھا جس نے بہت بہتر ٹیم کا تین بار مقابلہ کیا اور ہارا نہیں۔ ہر دوسرے مخالف کو انہوں نے کچل ڈالا۔

میں جب آسٹریلیا سے واپس آیا تو کرکٹ کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کیا۔ بہترین وقت میں چھوڑ دینا اچھا تھا۔ اب میں ساری توجہ ہسپتال پہ مرکوز کرنے کا خواہاں تھا۔ ایک اور سیریز کا خطرہ میں مول نہ لینا چاہتا تھا۔ خواہش یہ تھی کہ خود کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے

بجائے آپ اپنے مقدر کا فیصلہ کروں۔ پاکستان تو کیا عالمی کرکٹ میں بھی کم ہی ایسا ہوا ہے کہ کسی کھلاڑی نے اپنے طور پر سبکدوش ہونے کا فیصلہ کیا ہو۔ الگ ہونے کا باقاعدہ اعلان کیے بغیر کھیل کو ترک کر دیا اور ان چیزوں میں مصروف ہو گیا، قبل ازیں جن کی فرصت نہ پاتا تھا۔ پہاڑوں میں مٹرگشت اور تیتر کا شکار۔ شکار سے لوٹ کر آیا اور میں نے ہسپتال کے بورڈ آف گورنرز کو اپنے فیصلے سے مطلع کیا تو وہ خوف زدہ ہو گئے۔ ان سب کا کہنا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو کچھ عرصے بعد عطیات کا سوتا خشک ہو جائے گا۔ کرکٹ کے بارے میں تو وہ کچھ نہیں جانتے تھے مگر یہ بات وہ جانتے تھے کہ مسلسل تشہیر کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ اتنی سی بات تو مجھے بھی معلوم تھی کہ کرکٹ کی دیوانی پاکستانی قوم کے لیے اس سے بڑی خوش خبری ہو ہی نہیں سکتی کہ عالمی ورلڈ کپ جو دوسری بار آسٹریلیا میں برپا ہونا تھا، جیت لیا جائے۔ میں نے سوچا ہسپتال کو بہت بڑی رقوم کی ضرورت ہے۔ بہتر یہی ہے کہ کوئی ڈرامائی طریق اختیار کیا جائے۔ مثال کے طور پر عالمی کپ میں فتح؛ چنانچہ ایک سال قبل ہی پوری عرق ریزی سے میں نے اس ٹیم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ پوری عرق ریزی سے آخری بار عالمی کرکٹ کھیلوں گا۔ بہترین جسمانی صحت کے لیے ہر ممکن تدابیر اور کوششیں میں نے کر ڈالنے کا عہد کر لیا۔ میری عمر 39 سال ہو چکی تھی۔ عہد شباب کے عروج سے میں آگے نکل رہا تھا۔

ہسپتال کا انحصار ورلڈ کپ میں ہماری کامیابی پر تھا۔ میں نے ہسپتال کی مارکیٹنگ ٹیم کو بتا دیا کہ وہ ٹرافی جیتنے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی حکمت عملی تیار کرے۔ کپتان کے طور پر تیسرا اور کھلاڑی کی حیثیت سے یہ میرا پانچواں عالمی کپ تھا۔ پہلی بار پریس سے میں نے کہا "ہم انشاء اللہ جیت کر ہی لوٹیں گے۔" بدقسمتی سے آسٹریلیا پہنچتے ہی میرا منصوبہ ناکامی سے دوچار ہونے لگا۔ ہمارے ممتاز کھلاڑی سعید انور اور وقار یونس زخمی ہو کر مقابلے سے نکل گئے۔ وہ دونوں میچ

جتا دینے والے تھے۔ ایک خوش قسمت ٹیم میں زیادہ سے زیادہ ایسے چار جانباز ہوتے ہیں۔
مقابلہ شروع ہونے سے دو دن قبل میرے کندھے کی ہڈی میں خرابی پیدا ہوگئی۔ میلبورن کے
ایک ممتاز ماہر سے معائنہ کرایا تو اصل نوعیت کا اندازہ ہوا۔ اس نے چھ ہفتے کا مکمل آرام تجویز
کیا۔ میں پریشان ہوگیا۔ یہ تو نری تباہی تھی۔ سال بھر کی ریاضت کے بعد کیا یہی ہونا تھا؟
صرف ایک کھلاڑی ہی میرے احساسات کا درست اندازہ کرسکتا ہے۔ صرف وہی جان سکتا ہے
کہ میرے دل و دماغ پر کیا بیت گئی ہوگی۔ میری نسبتاً نوجوان ٹیم پر اس واقعہ کے کس قدر تباہ کن
اثرات مرتب ہوں گے، میں نے سوچا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شوکت خانم میموریل ہسپتال کے
مستقبل کا انحصار ہی اس امر پر تھا۔ منیجر انتخاب عالم سے میں نے مشورہ کیا اور ہمارا فیصلہ یہ تھا
کہ راز کو راز ہی رہنے دیا جائے، ٹیم کو اس کی بھنک تک نہ پڑے۔

میرے بدترین اندیشے درست نکلے جب ویسٹ انڈیز اور انگلینڈ کے خلاف پہلے دو
میچوں میں ہماری ٹیم کو المناک شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ گزرے ہو ماہ و سال نے ذہنی
طور پر مجھے خاصا مضبوط کردیا تھا، خاص طور پر ہڈی کی چوٹ کے تجربے نے۔ عام حالات میں
اپنے کندھے کی ایسی خرابی کے ساتھ میں کبھی نہ کھیلتا۔ اپنی ٹیم کی خاطر میں ناکامی کی مثال بننا
پسند نہ کرتا پھر یہ کہ ٹیم اگر میرے بغیر جیت سکتی تو میں کھیلنے کا خطرہ کبھی مول نہ لیتا۔ کورٹیزون
(Cortisone) کے ٹیکے لگوا کر اور درد کش گولیاں کھا کر اب بہرحال مجھے کھیلنا تھا۔ میں اپنے
21 سالہ دور میں کبھی اس حال میں میدان میں نہ اترا تھا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ عالمی کپ کا
مقابلہ ختم ہونے کے چھ ماہ بعد تک میں دائیں ہاتھ سے گلاس تک نہ اٹھا سکتا تھا۔ درد کی ایک
شدید لہر دائیں کندھے سے گردن تک پھیل جاتی۔

جنہیں عالمی کپ یاد ہے، انہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ ہم آخری تین ٹیموں میں شامل تھے یعنی

نیچے سے تیسرے نمبر پر۔ قمار بازوں نے ہماری فتح پر 1-50 کا ریٹ لگایا۔ میرے بچپن کے
ہیرو، سلیکشن کمیٹی کے چیئرمین اور میرے کزن جاوید برکی زخمی کھلاڑیوں کے متبادل لینے کے
موضوع پر فون پر مجھ سے بات کر رہے تھے۔ ان کے لہجے اور انداز سے مجھے لگا کہ ہماری جیت کا
سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ میں نے ان سے کہا، ہم کامیاب ہو کر لوٹیں گے۔ فون کے
دوسرے سرے پر تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ میری بہنوں
سے انہوں نے یہ کہا تھا کہ میں آخر کار اپنا رخ بدل چکا تھا۔

میرے عزیز ترین برطانوی دوست جوناتھن مرمیگن (Jonathan Mermagen)
نے ایک سچے ساتھی کی طرح حوصلہ بڑھانے کے لیے مجھ سے فون پر بات کی۔ اسی نے
قمار بازوں کے بارے میں مجھے بتایا۔ پھر میں نے اس سے درخواست کی وہ ہم پر شرط لگائے۔
اس روز اس نے میری بات نہ مانی۔ اس دن وہ میری رائے سے اتفاق کرنے پر بھی آمادہ نہ تھا۔
میرے عزیز ترین دوست موبی (مبشر چوہدری) نے مجھے مشورہ دیا کہ مقابلے کے بعد میں
پاکستان واپس نہ جاؤں، چھٹیاں لوں اور یورپ میں پڑا رہوں۔ اس دوران پاکستانی عوام کے
جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔ یہ تھا لوگوں کا خوف، ہر کھلاڑی کو اس صورت حال سے دوچار
ہونا پڑتا ہے۔ جتنی زیادہ توقعات، اتنی ہی زیادہ مایوسی۔

پاکستانی سفیر نے پرتھ (Perth) میں ٹیم کے اعزاز میں عشائیے کا اہتمام کیا۔ یہ گویا
جنازے کا جلوس تھا۔ میں نے تقریر کی تو کہا، ''اس میں رتی برابر شبہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم جیت کر
دکھائیں گے۔'' جب میں نے یہ بات کہی تو میں سب کے چہروں پر مایوسی، تعجب اور دل شکستگی
دیکھ سکتا تھا۔ تب میں نے ان سے یہ کہنے کی جسارت کی ''اسلام میں مایوسی گناہ ہے کہ یہ اللہ
تعالیٰ پر عدم اعتماد کا اظہار ہے'' پاکستان اخبارات نے یہ تقریر چھاپی اور میرا مذاق اڑایا۔ اس اثنا

میں میری بہن علیمہ جو ہسپتال کی مارکیٹنگ مہم کی نگرانی کر رہی تھی، اس نے ایک اور بری خبر سنا دی۔ ہسپتال کے لیے عطیات کی مہم دم توڑ چکی تھی پریس نے مجھے قربانی کا بکرا بنا دیا تھا۔ میں نے بہر حال یہی کہا کہ وہ ٹرافی ذہن میں رکھ کر مارکیٹنگ کی ایک نئی مہم کا نقشہ بنا لے۔ بدقسمتی سے اس نے مجھ پر اعتبار نہ کیا اور جب ہم فاتح بن کر لوٹے تو انکشاف ہوا کہ ہماری کوئی تیاری نہیں ہو سکی تھی۔ میری خود اعتمادی نے ٹیم کا اعتماد کسی قدر برقرار رکھا اور ہمیں شکست سے بچا لیا۔ بحران میں ٹیم کپتان کی طرف دیکھا کرتی ہے مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ کپتان کہتا کیا ہے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے الفاظ اس کے عمل سے کتنی مطابقت رکھتے ہیں۔ میرے توکل نے میری باڈی لینگویج کو درست رکھا۔ گزشتہ تین برسوں میں ہم نے کئی بار ناممکن کو ممکن بنایا تھا، یہ امر بھی ہمارا مددگار ثابت ہوا۔ 1989ء میں تباہی سے دوچار ہونے کے باوجود بھارت میں ہم نے نہرو کپ جیتا تھا۔ کلکتہ میں ایک لاکھ تماشائیوں کے سامنے ہم نے ویسٹ انڈیز کو ہرا دیا تھا جن کی حمایت میں بھارتی نعرہ زن تھے۔ عالمی کپ میں بھی قسمت نے ہمارا ساتھ دیا۔ اس وقت دو بار بارش کی پیشین گوئی ہوئی تھی، جب بعد میں ہماری باری تھی۔ اگر دس منٹ کے لیے بھی بادل برس جاتا تو ہمارا قصہ تمام ہو جاتا۔ قواعد ہی ایسے تھے کہ بارش کی صورت میں بعد ازاں کھیلنے والا کسی طرح بھی جیت نہ سکتا۔ آک لینڈ میں سیمی فائنل کے دوران بادل گھر کر آئے مگر برسے نہیں۔ برابر کی بازی کھیلتے ہوئے ہم آگے نکلے اور جیت گئے۔ میچ ختم ہونے کے بیس منٹ بعد بارش شروع ہوئی اور آئندہ 24 گھنٹے تک جاری رہی۔

1987ء میں کھیل کے ساتھ میرا ''معاشقہ'' ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد میں جب بھی کھیلا، ہسپتال کے لیے کھیلا۔ مجھ پر ایسی بے پناہ خوشی سوار تھی کہ ٹرافی وصول کرنے کی تقریب میں، ٹیم کی شاندار کارکردگی کو سراہنا ہی بھول گیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ آج بھی اس لمحے کی یاد اپنے ساتھ شرمساری لے کر آتی ہے۔ سچی بات مگر یہ ہے کہ اس وقت تقریر کی بجائے اور

ہی چیزیں میرے ذہن پر سوار تھیں۔ پھر یہ کہ میں تو چند آدمیوں کے سامنے ڈھنگ سے بات نہیں کر سکتا چہ جائیکہ اچانک مجھے تقریر کرنا پڑی، 90,000 لوگوں کے مقابل۔ ٹی وی کے کروڑوں شائقین اس کے علاوہ تھے۔

بہر حال ایک عجیب صورت حال نے جنم لیا۔ ٹیم کے اکثر کھلاڑی کہتے تھے کہ اس تاریخی کامیابی کے بعد قوم کی دولت ہسپتال کے لیے مجھ پر برسے گی۔ میں اب تک حیران ہوں کہ وہ اس انداز سے کیوں سوچنے لگے۔ آسٹریلیا سے وطن واپس آتے ہوئے جب سنگاپور میں ہم رکے تو پاکستانی سفیر نے شوکت خانم کے لیے مجھے چیک دیا۔ میرا خیال ہے کہ تب کھلاڑیوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ انعام تو دراصل انہیں ملنا چاہیے تھا۔ پھر ہم لاہور پہنچے جہاں شہر کے تاجروں نے سترہویں صدی کے مغل بادشاہ شاہ جہاں کے تعمیر کردہ شالیمار باغ میں ہمارے اعزاز میں استقبالیے کا اہتمام کیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہسپتال کے لیے کچھ رقم انہوں نے اکٹھی کر رکھی ہے۔ میں ششدر رہ گیا جب ٹیم اس تقریب سے احتجاجاً اٹھ کر چلی گئی۔ زندگی میں کتنے ہی حادثے مجھ پر گزرے ہیں۔ میری ماں کی موت، اشرف الحق کی زبانی مشرقی پاکستان کے قتل عام کی تفصیل، کھیل کے زمانہ عروج میں ٹانگ ٹوٹ جانا لیکن ایسی اذیت مجھے کبھی نہ پہنچی تھی۔ یہ وہ کھلاڑی تھے، جن کے انتخاب اور تربیت میں میرا حصہ تھا۔ میں بری طرح مایوس ہوا۔ انعامات ہمیشہ برابر تقسیم کیے جاتے۔ اگر کوئی ''مین آف دی میچ'' ہوتب بھی کھلاڑیوں کو حصہ دیا جاتا۔ تقریباً دس گیارہ برس سے میں ''مین آف دی سیریز'' چلا آ رہا تھا۔ ہر بار ہر انعام میں نے تقسیم کیا۔ اکثر کھلاڑیوں نے بعد میں معافی مانگی۔ بعض نے کہا کہ دوسروں نے انہیں گمراہ کیا۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ 1992ء کی فتح کے بعد لالچ کے بیج بوئے گئے۔ سب کو 90 ہزار پاؤنڈ فی کس ملے۔ کبھی کسی کھلاڑی نے اتنی دولت نہ کمائی تھی۔ 1992ء میں جس ٹیم کو میں نے الوداع کہا، اب وہ دنیا بھر میں بہترین تھی۔ آئندہ ایک عشرے تک وہ دنیائے کرکٹ پر حکومت

کر سکتی تھی۔ آئندہ کے دو ورلڈ کپ مقابلوں، 1996ء اور 1999ء میں سب سے زیادہ امیدیں انہی سے وابستہ تھیں اور انہی کی جیت کا امکان سب سے زیادہ تھا لیکن یہ ٹیم اپنی پوری صلاحیت کے مطابق کبھی نہ کھیل پائی۔ 1998ء کے بعد ہمیشہ اس پر بے ایمانی کے الزامات لگتے رہے۔ 2010ء میں تو زوال اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

کپتان کی حیثیت سے میرے لیے تین مقابلے سب سے زیادہ مشکل تھے۔ 1988ء میں بھارت، 1988ء میں ویسٹ انڈیز اور 1992ء کا عالمی کپ۔ بھارت اس لیے کہ ان کا گھر تھا اور امپائر بھی ان کے اپنے۔ بظاہر پاکستانی ٹیم کمزور بھی تھی مگر بھارت میں ہار جانے کو ہماری قوم کبھی برداشت نہ کرتی۔ جب ان دو ملکوں کی ٹیمیں آمنے سامنے ہوں تو یہ محض کھیل نہیں رہتا، گویا ایک جنگ ہوتی ہے۔ کھلاڑیوں پر ایسا دباؤ کہ جس کی کوئی نظیر شاید ہی مل سکے۔ 1979ء میں جب ہم بھارت سے ہارے تو ہمارے کپتان کا برا حال ہوا اور اسے ریٹائر ہونا پڑا۔ 1986ء میں جب ویسٹ انڈیز سے لڑے تو وہ تاریخ کی عظیم ترین ٹیم تھی۔ ایک آدھ غلطی اور قصہ تمام۔ ان کا گھر اور ان کے امپائر، مقابلہ برابر کر کے لوٹ آنا عظیم ترین کامیابی تھی۔ ایک عشرے میں دنیا کی کوئی اور ٹیم ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوئی تھی۔ 1992ء میں عالمی کپ کے مقابلے خاصے اعصاب شکن تھے۔ اپنے ساتھیوں کی قیادت کے طویل تجربے نے دباؤ برداشت کرنے کی صلاحیت مجھے عطا کر دی تھی۔ وہ اہلیت جو ہم میں پیہم تجربے سے پیدا ہوتی ہے۔ بعد میں یہ تجربہ میرے کام بہت آیا۔ ہسپتال کی تعمیر اور سیاسی جماعت کی تشکیل میں اسی نے میری مدد کی۔ ہسپتال میں ایک کے بعد دوسرا بحران۔ تحریک انصاف مسلسل پندرہ برس تک اپوزیشن میں رہی۔ کوئی دوسری سیاسی پارٹی ایسے بحران سے گزر کر سلامت نہ رہی۔

عالمی کپ کے ایک ماہ بعد مجھے برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کے سخت دباؤ کا سامنا تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میں انگلینڈ کا دورہ کروں۔ وہ ہسپتال کے لیے خطیر رقم کی پیش کش کرتے

تھے۔ 21 برس، پورے 21 برس، کرکٹ سے اب میں اکتا چکا تھا اور سبکدوش ہونا چاہتا تھا۔ شالیمار باغ والے واقعہ نے فیصلہ کرنے میں میری مدد کی۔ زندگی کا ایک عہد اس کے ساتھ ہی تمام ہوا اور دوسرا شروع ہو گیا۔ اب ایک چیلنج کا سامنا تھا۔ ہسپتال اب میرے وقت کا ایک ایک لمحہ طلب کر رہا تھا۔ عالمی کپ سے وصول ہونے والی اپنی پوری آمدن میں نے اسے دے دی، مزید یہ کہ اس کامیابی نے عطیات کی فصل ہری بھری کر دی، جیسے بارش برسنے سے دھان کا کھیت لہلہا اٹھے۔ اب صرف چھ ماہ کے اندر چودہ کروڑ روپے جمع ہو گئے اس سے قبل پورے سال میں صرف ایک کروڑ ملے تھے۔ 1994ء تک ہسپتال میں تنگ دستی کا موسم نہ آیا۔

کرکٹ تمام ہوئی لیکن سیاست اب بھی میرے تعاقب میں تھی۔ 1993ء کے موسم گرما میں معین قریشی کے ایک وزیر نے مجھے فون کیا کہ میں کابینہ میں شامل ہو جاؤں۔ وزیر اعظم نواز شریف اور صدر غلام اسحٰق خان کے الگ ہو جانے کے بعد امریکہ سے بلوا کر وہ نگران وزیر اعظم بنائے گئے تھے۔ ایک بار پھر میں نے انکار کر دیا۔ اب مگر میں سوچتا تھا کہ سیاست میں کوئی کردار مجھے ادا کرنا چاہیے۔ ملک زوال کا شکار تھا اور سیاست دانوں کی المناک ناکامی نے عام پاکستانیوں کو آزردہ کر رکھا تھا۔ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف ایک ایک بار وزیر اعظم رہ چکے تھے۔ دونوں کا ہدف، دولت کا حصول تھا۔ ہر حال میں اقتدار سے چمٹے رہنا اور اس مقصد کے لیے اپوزیشن کے خلاف ہر طرح کے ممکنہ منفی ہتھکنڈے استعمال کرنا۔ دونوں کسی وژن اور نظریے سے محروم تھے۔ افرادی قوت کی تربیت اور تعلیم سے انہیں ہرگز کوئی دلچسپی نہ تھی جو کسی بھی ملک کا سب سے بڑا اثاثہ ہوا کرتی ہے۔ ان دونوں کے گیارہ سالہ دور اقتدار میں صحت اور فروغ تعلیم پر سرکاری اخراجات کم سے کم ہوتے گئے۔ تاریخی تجربہ یہ ہے اور ایشیا میں ابھرتی ہوئی نئی قوموں نے اسے اور بھی اجاگر کر دیا تھا کہ ان دونوں شعبوں میں سرمایہ کاری اور مجموعی قومی ترقی میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر میرا احساس یہ تھا کہ سیاست مجھ سے

شرمیلے آدمی کو سازگار نہیں، جو ذاتی زندگی جیتا ہے اور گھل مل جانے کا عادی نہیں۔ خود لیڈر بننے کی بجائے میں نے ان لوگوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا جو بے نظیر اور نواز شریف کے متبادل ہوں اور خلوص دل سے ملک کی خدمت کریں کیوں نہ میں ان کی مدد کروں جتنی کہ کر سکتا ہوں۔ اس دوران میں کئی سیاستدانوں سے، سیاست کو سمجھنے اور اس پر غور وخوض کرنے والوں سے ملا۔ ملک کے اندر جہالت پر ہم نے طویل بحثیں کیں۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے دوستوں کے چھوٹے سے حلقے اور کھلاڑیوں کے سوا کچھ اور لوگوں کے ساتھ ملاقاتوں میں مصروف تھا۔

باب پنجم

کھیل کی بے رحم دُنیا

کھیل کی دنیا بے رحم ہوتی ہے۔ ماں جب تک زندہ تھیں میں رحم کرنے والوں میں شامل نہ تھا۔ اگر آپ دشمن ٹیم کا کام تمام نہ کریں گے تو وہ آپ کا بھرکس نکال کر رکھ دے گی۔ کھیل کے میدان میں، میں نے کبھی کسی مخالف پر ترس کھایا نہ ہی اپنے لیے رحم کی کبھی آرزو کی۔ اگر بے رحم قاتل جیسی جبلت موجود نہ ہو تو آدمی چوٹی کا کھلاڑی کبھی نہیں بن سکتا۔ جب بھی اپنے معاشرے کے محروم طبقے سے واسطہ پڑا تو میں اپنے اسی ذہنی میلان کا مظاہرہ کرتا۔ ترس کھانے کی بجائے، اکثر میں سخت گیر ہی تھا۔ میں سوچتا، یہ لوگ اس لیے غریب ہیں کہ کاہل ہیں اور محنت سے جی چراتے ہیں۔ ہماری اشرافیہ کی غالب اکثریت کا غریبوں کے ساتھ یہی روّیہ ہے۔ مغربی دُنیا کمزور ملکوں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھتی ہے۔ ہسپتال کے تجربے نے میرا اندازِ فکر بدل کر رکھ دیا اور میں نے اپنے وطن کے عام لوگوں کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ عام پاکستانیوں کی صلاحیت اور قوت کا ادراک مجھے ہونے لگا۔ میں نہ صرف اپنے تعصبات پر قابو پا سکا بلکہ مفلسوں اور محتاجوں کے بارے میں بھی میرا اندازِ فکر بدلنے لگا۔ راستے روشن ہونے

لگے۔ انہی مشاہدات سے میں اس فیصلے تک پہنچا کہ مجھے سیاسی طور پر پاکستانی عوام کی خدمت کرنی چاہیے۔ اب میں محسوس کرنے لگا کہ تبدیلی کی مخالف قوتوں کو چیلنج کرنا ہوگا اور عام آدمی کو تحفظ دینے کے لیے جانفشانی سے جدوجہد درکار ہے۔ عام پاکستانی کے ساتھ موروثی سیاست دانوں نے بہت برا سلوک کیا ہے۔ دن رات میں یہی سوچتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں سیاست میں داخل ہونے والا تھا۔

1984ء میں وفات سے قبل میری ماں اذیت کے دن جیتی رہیں۔ میں ڈاکٹر سے مشورہ کرنے ایک دن میو ہسپتال گیا۔ میں کمرۂ انتظار میں تھا، جب ایک بوڑھا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بہت بے چینی تھی۔ تکلیف سے ستا ہوا چہرہ، یہ تاثر میرے لیے عجیب بہرحال نہ تھا۔ پچھلے کئی ماہ سے میرے والد، میری بہنیں اور خود میں اسی حال سے دوچار تھے۔ بوڑھے آدمی کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا اور دوسرے میں کچھ دوائیں۔ چونکہ وہ خود پڑھ نہ سکتا تھا لہٰذا اُس نے سب چیزیں ڈاکٹر کے نائب کو تھما دیں کہ جانچ لے۔ اسے بتایا گیا کہ ایک دوا کم ہے۔ "کتنے میں آئے گی؟" رنجیدہ آدمی نے پوچھا۔ قیمت بتائی گئی تو اداس چہرے پر مایوسی اور ناامیدی گہری ہوگئی۔ کچھ کہے بغیر وہ مڑا اور باہر نکل گیا۔ میں نے پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے۔ بتایا گیا کہ نوشہرہ کا یہ پشتون بزرگ اپنے کینسر میں مبتلا بھائی کو یہاں علاج کے لیے لایا ہے۔ ہسپتال میں کوئی بستر خالی نہیں اس لیے برآمدے میں پڑا ہے۔ بوڑھا قریب ہی ایک زیرِ تعمیر عمارت میں محنت مزدوری کرتا ہے اور باقی وقت اپنے بھائی کی دیکھ بھال۔ میو ہسپتال میں علاج مفت ہونا چاہیے کہ سرکاری ہسپتال ہے مگر مریضوں کو دوائیں اکثر اپنی جیب سے خریدنا پڑتی ہیں۔

میں والدہ کو علاج کے لیے لندن لے گیا تو پتا چلا کہ کینسر کا علاج کس قدر مہنگا ہے حتیٰ کہ مارفین سے بنائی گئی درد کش دوائیں دستیاب ہی نہ تھیں، اگر مل جاتیں تو بے حد گراں۔ چھ ماہ

سے دو سال تک علاج ہوتا ہے۔ اب تو خیر یہ ممکن ہو چکا کہ کینسر کا مریض درد کے بغیر موت کی گہری تاریکی میں ڈوب جائے۔ ان دنوں مگر پاکستان میں کینسر کی تکلیف سے نمٹ لینے کا تصور ہی موجود نہ تھا۔

ایک میں اور میرا خاندان تھا، تمام تر وسائل اور تعلقات کے باوجود گہری مایوسی کی کیفیت سے دوچار، پھر اس غریب آدمی پر کیا گزر رہی ہوگی؟ ماں کی علالت کے دنوں میں مسلسل اسی ایک بات پر میں سوچتا رہا۔ بوڑھے پشتون کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا۔ ماں کو میں برطانیہ لے کر گیا تو انکشاف ہوا کہ مرض کی جس نوعیت میں وہ مبتلا تھیں، بروقت اگر تشخیص ہو جاتی تو شافی علاج ممکن تھا۔ یہ بات بڑی ہی تکلیف دہ تھی کہ علاج کے لیے ملک سے باہر جانا پڑا۔ جو بھی اس تجربے سے گزرا ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ دولت کی فراوانی کے باوجود مریض اور اس کے پیاروں پر کیا گزرتی ہے۔ ملک سے بہت دور جب آپ اپنے خاندان کے گھنے سائے سے محروم ہوں اور مہینوں محروم رہیں تو مشکل اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے فیصلہ کیا کہ پاکستان میں ایک کینسر ہسپتال بناؤں گا جہاں علاج کے اخراجات کی فکر مفلس مریض کے لواحقین کو فکرمند نہ رکھے اور دولت مند بھی وطن سے دور جا پڑنے پر مجبور نہ ہوں۔

بالکل مجھے معلوم نہ تھا کہ پاکستان جیسے غریب ملک میں کینسر ہسپتال کا قیام کتنا مشکل ہوگا خاص طور پر اس لیے بھی کہ یہ کام تنہا کرنا ہوگا۔ معلومات حاصل کرنا شروع کیں تو معلوم یہ ہوا کہ حکومت پنجاب نے 1980ء کی دہائی میں ایک کینسر ہسپتال قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ رقم مختص کرنے کے باوجود منصوبے کو ناقابلِ عمل قرار دے دیا گیا۔ اول تو ہسپتال پر بہت بڑی رقم خرچ ہوگی پھر اسے چلانا اور بھی مہنگا پڑے گا۔ ان دنوں پاکستان میں اس مرض کے صرف دو تین معالج ہی موجود تھے۔ وہ شرمناک حد تک قلیل سرکاری تنخواہ پر کام کرنے میں ہچکچاہٹ کا

شکار تھے۔ بہت مہنگے طبی آلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان میں ایسے انجینئرز بھی بہت کم تھے جو خرابی کی صورت میں اِن مشینوں کی مرمت کر سکیں۔ کرکٹ میں یوں بری طرح مبتلا تھا کہ بہت دن میں اس خیال پہ یکسو نہ رہ سکا۔ 1987ء کے بعد میں نے پھر سے سوچنا شروع کیا کہ منصوبے کو کس طرح عملی شکل دی جائے؟ جتنے لوگوں سے میں نے بات کی، خاص طور پر ڈاکٹروں سے، انھوں نے میری حوصلہ افزائی نہ کی۔ میں شکوک وشبہات کا شکار ہونے لگا۔ عین ممکن تھا کہ منصوبہ ملتوی ہوتا چلا جاتا، جب میرے ایک کزن قمر خان نے 1988ء میں ایک کرکٹ ٹورنامنٹ کے دوران چندہ جمع کرنے کے لیے عشائیے کا اہتمام کر ڈالا۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی تقریب تھی۔ 20 ہزار ڈالر جمع ہو گئے۔ اب ہم آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ پاکستان لوٹا تو میں نے ایک ٹرسٹ اور بورڈ آف گورنرز تشکیل دے دیا۔ فلاحی اداروں کے لیے خدمت کا وسیع تجربہ رکھنے والے وکیل پرویز حسن اور معروف کاروباری شخصیت رزّاق داؤد ہمارے ساتھ شریک ہو گئے، تمام تر توانائی کے ساتھ مصروفِ عمل۔ میرے دوست عاشق قریشی اور عظمت علی بھی اس بورڈ میں شامل ہوئے (افسوس کہ بعد ازاں اسی ہسپتال میں ان کا انتقال ہوا)۔ اندرون لاہور سے تعلق رکھنے والی معروف کاروباری ہستی بابر علی اور بعد ازاں ملک کے وزیرِ خزانہ بننے والے شوکت ترین بھی منصوبے کا حصہ بنے۔ میرے والد اس بورڈ کے چیئرمین تھے۔ میں نے لاہور میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ ملک بھر سے چوٹی کے 20 ڈاکٹروں کو مدعو کیا تاکہ وہ بورڈ آف گورنرز کو بتائیں کہ منصوبے پر مزید پیش رفت کس طرح ممکن بنائی جائے۔ 20 میں سے 19 ڈاکٹروں نے رائے دی کہ یہ سرے سے قابلِ عمل ہی نہیں۔ جس نے کہا تھا، قابلِ عمل ہے، وہ بولا ''اس بات کا مگر کوئی امکان نہیں کہ غریبوں کو مفت علاج میسر آئے، اخراجات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔'' اس اجلاس کے بعد ہم سب بددلی کا شکار تھے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ صورتِ حال سے نمٹا کس طرح جائے۔ منصوبے کو میں خیر باد نہ کہہ سکتا تھا۔ ایک تو میں اعلان کر

چکا تھا، ثانیاً کچھ عطیات بھی وصول کر لیے تھے۔ میرے کزن جاوید برکی کا مشورہ یہ تھا کہ میں اپنی ماں کے نام پر ایک بڑی ڈسپنسری بنا دوں اور ہسپتال کا خیال دل سے نکال پھینکوں۔ میری بہنیں میرے لیے بہت پریشان تھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ میری تمام تر عزت اور سارا اعتبار خاک میں مل جائے گا۔ جو توقیر کرکٹ سے میں نے کمائی ہے، ہسپتال میں گنوا دوں گا مگر اب بہت دیر ہو گئی تھی۔ چاہتا بھی تو دستبردار نہ ہو سکتا تھا۔ لوگوں سے لیا ہوا چندہ کس طرح میں واپس کرتا؟ ٹھیک اس وقت، مایوسی کے اس کالے دشت میں اچانک ایک شمع جل اٹھی۔ پاکستان ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکن ڈاکٹرز کے ساتھ ایک ملاقات میں چراغ روشن ہوا، روشن رہا اور پھر روشن تر ہوتا گیا۔ مدد کا انھوں نے وعدہ کیا اور اس وعدے نے مجھے حوصلہ دیا کہ کرکٹ کی مصروفیت کم کر کے ساری توجہ ہسپتال پر مرکوز کر دوں۔ میں نے اپنا ایک دفتر قائم کیا۔ یہ میرے دوست عمر فاروق گولڈی نے مجھے مفت فراہم کیا تھا۔ اسی دفتر میں ہسپتال کا پہلا ملازم بھرتی کیا گیا۔

آغازِ کار میرے اندر ویسا جنون نہ تھا جو کبھی کرکٹ کے لیے جاگتا رہتا اور فتح حاصل کرنے کی امنگ کے ساتھ مجھے بیدار رکھتا تھا۔ غریبوں کے لیے ہسپتال میں بنانا تو چاہتا تھا لیکن یہ تحریک میرے اندر طوفان نہ بنتی تھی۔ ایک عظیم ذمہ داری انجام دینے کا ویسا شدید احساس نہ تھا جو ہونا چاہیے۔ بس، ایک اخلاقی فرض جس کی جڑیں خود پر گزری بے پناہ اذیت اور توڑ کر رکھ دینے والے دردناک لمحات کی یادوں میں پیوست تھیں۔ وہ جان لیوا کیفیت جو میو ہسپتال کے کمرۂ انتظار میں بوڑھے پشتون کو دیکھ کر مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ کبھی یہ احساس مجھے تحریک دیتا کہ پاکستان میں اگر ایک کینسر ہسپتال ہوتا تو میری ماں کی جان ممکن ہے بچ گئی ہوتی۔ انسانوں کی خدمت کے لیے میرا تصور ابھی بہت محدود تھا۔ میری ماں ہر سال کرکٹ سے حاصل ہونے والی آمدن کا ایک حصہ مجھ سے لے کر غریبوں کو دے دیا کرتیں کہ یہ زکوٰۃ ہے۔ ان کی وفات کے

بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ 1987ء میں بازار حصص جب برباد ہوا تو میری جمع پونجی کا ایک بڑا حصہ ڈوب گیا۔ روحانیت کی جانب میرے سفر کا سلسلہ اب شروع ہو چکا تھا۔ ایک خیال مجھ پر طاری ہوگیا۔ شاید اس بات کی سزا مجھے ملی ہے کہ میں نے اپنی دولت کو آلودہ رکھا، زکوٰۃ سے اجلا نہ کیا۔ تب میں ایمان اور عقیدے کے تحت زکوٰۃ نہ دیتا تھا، بعد میں بات دوسری ہوگئی۔ میں نے پاکستان کے عام لوگوں کو فیاضی کے ساتھ خیرات کرتے دیکھا تو میرا ایمان راسخ ہونے لگا۔ یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ مفلسوں اور محتاجوں کی مدد پسند ناپسند کی بات نہیں بلکہ فرض ہے، بالکل بنیادی فرض۔

جتنے زیادہ لوگوں نے ہسپتال کے منصوبے کا تمسخر اڑایا، اتنا ہی میرا عزم پختہ ہوتا گیا۔ انہیں بہرحال غلط ثابت کرنا تھا۔ ہمیشہ سے میں ایک ضدی آدمی تھا۔ اسی ضد نے کرکٹ کے میدان میں میری مدد کی۔ حال تو ورنہ میرا یہ تھا کہ پہلے ہی ٹیسٹ میچ کے بعد میں ٹیم سے نکال دیا گیا اور کہا یہ گیا کہ میرا پہلا میچ ہی آخری ہے۔ مجھ پر بے پناہ بوجھ تھا۔ بار بار مجھے بتایا جاتا کہ یہ ہسپتال سفید ہاتھی ہوگا۔ بعض نے کہا کہ بھائی! اس ملک میں تو عام علاج کی سہولت دستیاب نہیں اور تم چلے ہو بین الاقوامی معیار کا منصوبہ مکمل کرنے۔ میں پوچھتا، ''پھر ان غریب لوگوں کا کیا بنے گا جنہیں کینسر کا موذی مرض لاحق ہو جاتا ہے؟'' جواب یہ ہوتا ''ہر ایک کو مرنا ہے، کسی بھی صورت جب موت آلے۔'' ایک دن ملنے والوں میں سے ایک نے چند دوستوں کی موجودگی میں یہ کہا ''سستی شہرت حاصل کرنے میں لگے ہو، جس طرح کہ مشہور لوگ خبروں میں زندہ رہنے کے لیے خیراتی اداروں کو چندہ دیا کرتے ہیں۔'' میں اسے مارنے لپکا۔ یہ ہماری اشرافیہ کا مزاج ہے۔ ان میں سے کچھ ایسا ہی رویّہ رکھتے ہیں۔ پستی کی آخری حد تک پہنچے ہوئے، اخلاقی طور پر دیوالیہ لوگ۔ وہ کسی مغربی شخصیت کا ذکر کریں گے اور ایک عجیب سحر زدہ کیفیت میں کرتے ہی چلے جائیں گے۔ اگر آپ اپنے لوگوں کی، ان کی خدمت کرنے کی بات

کریں اور آپ کے لہجے میں کچھ خواہش کی شدت پیدا ہو جائے تو وہ آپ کو گھسیٹ کر نیچے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہاں، جہاں صدیوں سے خود وہ کیڑوں مکوڑوں کی طرح جی رہے ہیں۔ ایک بار پھر ایسا ہوا کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا، جب انگلینڈ میں مجھے میرے مقصد سے بھٹکانے والے ایک شخص سے میرا واسطہ پڑا۔ یہ لندن کا شیزان ریسٹورنٹ تھا جہاں میں پاکستانی ڈاکٹروں سے ملنے گیا۔ انہوں نے مجھ سے ہسپتال کے بارے میں تکنیکی سوالات پوچھنا شروع کیے۔ پھر ان میں سے ایک منصوبے کا مذاق اڑانے لگا۔ تکنیکی سوالوں کے حوالے سے طبّی معلومات پر اس نے میری کم علمی کا تمسخر اڑانے کی کوشش کی۔ بتایا کہ میرا یہ میدان نہیں اور میں ناکام رہوں گا۔ نیک نامی خاک میں مل جائے گی۔ اس قدر غصہ مجھے آیا کہ کھانا کھائے بغیر اٹھ کر وہاں سے آگیا۔ ڈاکٹروں کے ساتھ مشورہ کرنے میں جایا کرتا لیکن زیادہ تر ماہرین کو میں نے منطق پرست پایا۔ یہ لوگ نام نہاد عملیت پسندی، آہنی عملیت پسندی کے حصار میں جیتے ہیں۔ اب میں تو ہمیشہ سے ایک خواب دیکھنے والا ہوں۔ میری جدوجہد نے تو مجھے یہ سکھایا ہے کہ اگر آپ ہار نہ مانیں تو کوئی بھی چیز ناممکن نہیں ہوتی۔

ہسپتال کا تصور اب بھی مبہم تھا۔ رضا کار ڈاکٹر ہماری مدد کر رہے تھے۔ بدقسمتی سے اتنے بڑے منصوبے کے لیے درکار تجربہ ان کے پاس بھی نہ تھا۔ اس دوران ایک نمائشی کرکٹ میچ کے لیے میں نیویارک گیا۔ میری ملاقات توصیف احمد نامی کینسر کے ایک ممتاز پاکستانی ماہر سے ہوئی۔ میں نے ان سے درپیش مشکلات پر بات کی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایسے پاکستانی ڈاکٹر کو جانتے ہیں جو یہ عظیم منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جس آدمی کا اس نے نام لیا، اتفاق سے وہ میری ماں کا سب سے چہیتا بھانجا نوشیرواں برکی تھا۔ نوشیرواں سے بات کی تو وہ آمادہ ہوگیا۔ تمام تر معاملاتِ کار اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اب میں نے اپنی پوری توانائی عطیات جمع کرنے پر مرکوز کر دی۔ ایک بڑا بوجھ کندھوں سے اتر

گیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے شوکت خانم ہسپتال کے قیام میں ایثار کیا لیکن اس میں رتی برابر شبہ نہ ہونا چاہیے کہ باہمت نوشیرواں کا کردار کلیدی تھا۔ اگر فیصلہ کن موڑ پر میری ملاقات اس سے نہ ہوئی ہوتی تو شاید آج بھی میں انجانے راستوں پر ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوتا۔ بورڈ کے سامنے اس کی پہلی ہی مفصل تجزیاتی گفتگو کے بعد ہم سب نے سکھ کا سانس لیا۔ آخر کار ایک ایسا شخص موجود تھا جو سب کچھ جانتا تھا۔ جو جانتا تھا کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور کیا کرنے کے آرزومند ہیں۔ اس نے ہم میں اعتماد پیدا کیا کہ ایک دن ہمارا خواب سچا ہو جائے گا، حقیقت کا روپ دھارے گا۔ نوشیرواں کوئی معمولی معالج نہیں وہ نہ صرف ایک غیر معمولی پلمونولوجسٹ (Pulmonologist) ہے بلکہ اس کا غیر معمولی دماغ ہر وقت صحت سے متعلق پورے نظام پر، ہر پہلو سے متجسس رہتا ہے۔ یہ اس کے لیے ایک موزوں چیلنج تھا۔ کینٹکی (Kentucky) یونیورسٹی ہسپتال کے اس پروفیسر نے وہیں امریکہ میں بیٹھے بیٹھے، ماہرین کے انتخاب سے لے کر عملے کے چناؤ تک سارے کام کی منصوبہ بندی کی۔ امریکہ میں اپنے تعلقات برت کر مناسب ترین قیمت پر اعلیٰ معیار کے بہترین آلات کی خریداری کا بندوبست کیا۔

ماں کی وفات کے بعد اللہ کی طرف میرے سفر کا آغاز ہو گیا تھا۔ ابھی تک مگر زندگی بسر کرنے کا میرا طریق خود پسندی پر مبنی تھا۔ پھر ہسپتال اور میرا ایمان ایک ساتھ تکمیل کے مراحل طے کرنے لگے۔ اس ادارے نے اللہ پر میرے یقین کا آخری حد تک امتحان لیا اور ہر اگلے مرحلے میں اللہ کا شکر ہے کہ اسے مزید پختہ بھی کیا۔ میرے ایمان ہی نے ہسپتال کی تکمیل میں میری مدد کی۔ ان در و دیوار سے ایسی محبت مجھے ہو گئی کہ اب ہم لازم و ملزوم تھے۔ رفتہ رفتہ بتدریج اللہ کے وجود پر تمام شکوک میرے دل سے رخصت ہوئے۔ یقین پختہ ہونے لگا اور اس کے ساتھ یہ احساس بھی کہ اللہ کو کامیابی منظور تھی وگرنہ میری اور اس ناتجربہ کار ٹیم کی غلطیوں نے یہ منصوبہ ڈبو دیا ہوتا۔ کتنے ہی مواقع آئے جب مایوسی کی گھٹائیں چھا گئیں لیکن پھر کسی نہ کسی

طرح سورج نکلتا اور نور ہر سو پھیل جاتا۔ ساڑھے تین برس کی ریکارڈ مدت میں جب یہ ہسپتال مکمل ہو گیا تو تکبر کی بجائے اللہ نے میرے اندر عجز و انکسار پیدا کیا۔ میں حیران اور ششدر کھڑا تھا، اپنے پروردگار کا بے حد شکر گزار۔

ہمیشہ میں نے یہی چاہا کہ اپنے اخراجات اپنی آمدن تک محدود رکھوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اپنی ضرورت کے لیے کبھی کسی سے کوئی سوال نہ کیا۔ ہمارے معاشرے میں والدین سے طلب کرنے میں تامل نہیں ہوتا۔ مجھے مگر اپنے والد سے پیسے مانگنے پر الجھن محسوس ہوتی۔ اب ایک اور ہی مرحلہ تھا، مجھے اپنا اندازِ فکر بدلنا تھا۔ پیسے کم پڑے تو اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہ رہا کہ میں باہر نکلوں اور دستِ سوال دراز کروں۔ یہ میری زندگی کا مشکل ترین کام تھا۔ اس احساس کو میں لفظوں میں بیان کر ہی نہیں سکتا۔ میرے لیے وہ لمحات کس قدر اذیت ناک ہوتے جب کوئی مال دار مجھے انتظار میں بٹھائے رکھتا۔ ان میں ایسے بھی تھے جو مجھے متکبر جان کر دانستہ میری توہین کرتے۔ بہت سے دعوت نامے موصول ہوتے لیکن بہت سوچ سمجھ کر مجھے انتخاب کرنا ہوتا تھا۔ میں ایسے دعوت نامے اکثر مسترد کر دیتا جو مشہور شخصیات کی قربت حاصل کرنے کے آرزومند بھیجتے۔ عمر بھر انہوں نے دولت کمائی، اب وہ تحسین کے خواہش مند تھے۔ پھر ایسا وقت آن پڑا کہ اس طرح کی مخلوق سے بھی مجھے بات کرنا پڑی۔ میڈیا بھی ماضی کا حساب بے باق کرنے پر تلا تھا۔ کھلاڑی کی حیثیت سے پریس کو میری ضرورت تھی، مجھے اس کی نہیں۔ فیصلہ کرنے کے لیے میں آزاد تھا کہ کس سے بات کروں اور کس سے نہ کروں۔ اگر کوئی غیر ذمہ دار تھا یا جارحیت پر تلا ہوا تو نجات پانے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ اب میں ان سب کو راضی رکھنے پر مجبور تھا۔ میرے خلاف ایک کالم کا مطلب تھا، شوکت خانم ہسپتال کے لیے عطیات میں کچھ نہ کچھ کمی اور یہ بات مجھے گوارا نہ تھی۔ اپنے مقصد کے لیے بعض اخبار نویسوں کے ساتھ مجھے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنا پڑا۔ گاہے یہ اذیت ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔

نیک مقصد کے لیے میں بچوں کے پاس گیا۔ وہ آزاد روحیں جو تعصبات اور منفی جذبات سے پاک ہوتی ہیں۔ وہی میرے ساتھ سب سے زیادہ محبت سے پیش آئے۔ ایک مسئلہ بھی مگر درپیش تھا۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ بچوں کے ساتھ کیسا روّیہ اختیار کیا جائے۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جو بچوں کی قربت میں حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ جب بھی میں گھر پہ ہوتا تو لوگ اپنے بچوں کو مجھ سے ملوانے ہمارے ہاں آیا کرتے۔ ان کا سامنا کرنے سے میں اس قدر گھبراتا کہ کوئی حد ہی نہیں۔ اپنی بہن سے میں التجا کرتا ''ان سے کہہ دو عمران گھر پہ نہیں۔'' میری ماں بے چاری، بچوں سے بے پناہ پیار کرتی تھیں۔ میری اس حرکت سے وہ نالاں رہتیں اور مجھے ان سے ملنے کا حکم دیتیں۔ سب بدل گیا، اب وہ سب کچھ خیال وخواب ہے۔ اب میں دو بچوں کا باپ ہوں، ان کی رفاقت سے بڑھ کر کوئی چیز مجھے آسودہ نہیں کرتی۔ 1990ء میں، آغاز کار سے ڈیڑھ برس بعد عطیات جمع کرنے کی مہم غیر مؤثر ہونے لگی۔ اپنے تجربات اور مشاہدے سے میں نے یہ سیکھا ہے کہ اگر آپ سو روپے جمع کرنا چاہتے ہیں تو پہلے 10 روپے حاصل کرنا سب سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور آخری دس سب سے آسان۔ فنڈ حاصل کرنے کے لیے بار بار میں ان لوگوں کے پاس جاتا جو پہلے ہی اپنا حصہ ڈال چکے۔ اب حال یہ تھا کہ وہ ہسپتال کا نام سننے تک کے روادار نہ تھے، میں جیسے ایک بند گلی میں تھا۔ مناسب رقم کے بغیر ہم کام ہی شروع نہ کر سکتے تھے۔

اس بحران میں ایک دوست نے مشورہ دیا ''کیونکہ بچے تمھارے سب سے بڑے مدّاح ہیں لہٰذا سکولوں میں جا کر انہیں عطیات جمع کرنے پر آمادہ کرو۔'' اس خیال نے مجھے پریشان کیا۔ اس کے بالکل برعکس میری بہن علیمہ کو یہ بات بہت پسند آئی جو خود بھی اس خواب کا حصہ بن گئی تھی۔ ایک ماہ کے اندر اندر اس نے پاکستانی بچوں کے ذریعے عطیات کی مجوزہ مہم کو حتمی شکل دے دی۔ اب یہ تھا کہ ملک بھر کے سکولوں میں جا کر مجھے بچوں کو آمادہ کرنا تھا کہ وہ

عطیات جمع کرنے والی ٹیم کا حصہ بنیں۔ ہم نے انہیں ''عمران ٹائیگرز'' کا نام دیا۔ صرف میرے قریبی لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ میرے مزاج کے کس قدر خلاف تھا۔ فکر مجھے یہ لاحق تھی کہ میرا مذاق اڑے گا، بچے مجھ پر ہنسیں گے۔

وہ صبح میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا جب پہلی بار لاہور میں ایک سکول کے بچوں سے خطاب کیا۔ گھر سے جب میں روانہ ہوا تو تناؤ کا شکار تھا۔ راستے میں ایک ڈرائیور سے جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں نے اس روز اپنی زندگی میں شاید سب سے زیادہ برے طریقے سے گاڑی چلائی تھی۔ پسینے سے شرابور، بے ڈھنگے انداز میں شرمارہا تھا۔ بچے دبے دبے ہنسنے لگے۔ ہم نے اپنی مہم کا آغاز نجی سکولوں سے کیا تھا لیکن جلد ہی سرکاری ادارے بھی اس مہم میں شامل ہونے کا مطالبہ کرنے لگے۔ پورے دو مہینے، ہر روز پانچ چھ سکولوں میں جا کر میں بچوں سے بات کرتا۔ انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ ان کے وطن میں کینسر ہسپتال بنانے کی ضرورت کتنی شدید ہے۔ ہر بار سکول اسمبلی میں بچوں سے بات کرنے کے لیے مجھے اپنی ہمت بندھانا پڑتی۔ آغازِ کار یہ بات میرے لیے، تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرے سٹیڈیم میں، کسی برق رفتار باؤلر کا سامنے کرنے سے بھی کئی گنا زیادہ مشکل تھی۔ اس مہم کے نتیجے میں مگر ملک میں ایک چھوٹے سے انقلاب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بچوں نے تاریخ رقم کر دی۔ پاکستان میں ایسی کامیاب مہم کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ کم سن لڑکے اور لڑکیاں، والدین اور رشتے داروں کے پیچھے پڑے رہتے کہ ہسپتال کے لیے پیسے دو، پیسے دو۔ چوراہوں پر رکی گاڑیوں سے وہ چندہ جمع کرتے یا ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ جو بچہ ایک خاص حد تک زیادہ عطیات جمع کرتا، میرا دستخط شدہ بیٹ انعام کے طور پر اسے ملتا۔ پاکستانی معاشرہ وہ ہے جہاں بچوں سے بے پناہ محبت کی جاتی ہے۔ ہمارے لیڈر سمجھ ہی نہ پائے کہ یہ ایک زندہ معاشرہ ہے اور زندہ تر ہونے کے لیے بے تاب۔ عطیات کے لیے ہم نے ایک بالکل صحیح طریقے کا انتخاب کیا تھا۔

ایسا بھی ہوتا کہ میں کسی ریستوران میں کھانا کھا رہا ہوتا اور بچوں کی نظر مجھ پر پڑتی تو وہ اپنے والدین سے پیسوں کا تقاضا کرنے لگتے۔ ٹلتے ہی نہ تھے جب تک کچھ نہ کچھ وصول کر کے میرے حوالے نہ کر دیتے۔ یہ ایک مختلف معاشرہ ہے۔ برطانیہ اور امریکہ کے برعکس پاکستانی بچے ہر جگہ جاتے ہیں۔ ہوٹل، تقریبات اور شادی بیاہ میں، ہر کہیں۔ یہی اچھی زندگی ہے کہ تمام امور خاندان کے گرد گھوما کریں۔ بہت بڑی رقوم جمع ہوئیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ بچوں نے اپنی تگ و دو سے بیداری کی ایک لہر اٹھا دی۔ ان کے معصوم چہروں پر ایک سوال لکھا تھا ''اتنے بڑے ملک میں ایک بھی کینسر ہسپتال کیوں نہیں ہے؟'' اس تحریک کی کامیابی غیر معمولی تھی، اوّل اوّل جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتی۔ ہم اس قابل ہوئے کہ ہسپتال کی تعمیر کا آغاز کر سکیں۔ دُنیا بھر میں جہاں کہیں میں جاتا ہوں، کامیاب پاکستانی چہرے دیکھتا ہوں۔ پھر ان میں سے کوئی آگے بڑھتا اور فخر کے ساتھ مجھے بتاتا ہے کہ بچپن میں وہ ہسپتال کے لیے عطیات جمع کرنے کی مہم کا حصہ تھا۔ یہی زندگی ہے، یہی زندگی کا حسن ہے۔

اس مہم نے مجھے ایک اور بہت ہی اچھا تحفہ عطا کیا۔ آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ بچوں سے گریز کی عادت ختم ہوتی گئی۔ اب میں انہیں دیکھتا ہوں تو مسرت، امید، امکان اور سرخوشی کے ساتھ۔ مزید برآں ایک نتیجہ یہ نکلا کہ میرے پاس جو کچھ تھا اس میں سے زیادہ تر میں نے ہسپتال کو دینا شروع کیا۔ میری تربیت میں فضول خرچی کا عمل دخل کبھی نہ تھا۔ میرے والدین روپیہ خرچ کرنے کے معاملے میں محتاط تھے۔ اپنے بچوں میں یہ بات انہوں نے راسخ کر دی کہ ہمارے ارد گرد افلاس بہت ہے۔ نعمتوں کی ناقدری نہ کرنی چاہیے۔ زائد پیسے اور خوراک ان کے کام آنی چاہیے جن کے ہاتھ خالی ہیں، جن کے دامن اجڑے ہوئے ہیں۔

میرے والد نے ''پاکستان ایجوکیشن سوسائٹی'' کے نام سے ایک فلاحی ادارہ قائم کیا تھا جو غریب مگر باصلاحیت نوجوانوں کو یونیورسٹی کی تعلیم کے اخراجات مہیا کرتا۔ جب میری عمر

بائیس سال تھی تو میرے والد نے مجھے بھی اس ادارے کے بورڈ میں شامل کیا۔ اب وہ ماہ و سال گزر چکے لیکن یاد ضرور آتے ہیں، جب اپنی جیب سے کسی کو کچھ دینا مجھے مشکل لگتا۔ اب مگر یہ آسان ہے۔ جب میں نے دینا شروع کیا تو اوّل اوّل مجھے محسوس ہوتا کہ میں نے کسی پر احسان کیا ہے۔ اب مگر یہ فرض کی ادائیگی ہے۔ بڑی ہی تسکین اس سے ہوتی ہے۔ اب اپنے پورے سال کے اخراجات کا اندازہ میں لگاتا ہوں اس کے علاوہ جو کچھ ہوتا ہے ہسپتال کو دے دیتا ہوں یا میانوالی میں قائم کردہ نمل یونیورسٹی کو جو ایک جھیل کے کنارے سر اٹھائے کھڑی ہے۔ ایک بار جب آپ اس راہ پر چلنے لگتے ہیں تو وقت گزرنے کے ساتھ بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔ زندگی میں سادگی آ گئی۔ اپنی آمدن سے متعلق تفکرات سے میں آزاد ہو گیا۔ میرا ہاتھ کبھی تنگ نہ ہوا۔ کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ گاڑی چلتی رہتی ہے۔ دسمبر 1994ء میں ہسپتال کھلنے سے لے کر اب تک، جو کچھ بھی میرے پاس تھا، اس کا نصف میں ہسپتال کو دے چکا۔

ایک کے بعد ایک بحران سے یہ منصوبہ ڈوب ڈوب کر ابھرتا رہا۔ نواح میں بیس ایکڑ کا پلاٹ ہمیں مل گیا۔ اب یہ شہر کا وسط ہے، جہاں اپریل 1991ء میں تعمیر کا کام شروع ہوا۔ بینک میں صرف ایک کروڑ روپے موجود تھے جب ہم نے آغاز کار کیا۔ ستر کروڑ روپے خرچ ہونے تھے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہ تھی کہ ہر کوئی شکوک و شبہات میں مبتلا تھا۔ فطری طور پر وہ یہ سوچتے کہ اتنی تھوڑی سی رقم سے آپ اتنے بڑے منصوبے کی ابتدا کیسے کر سکتے ہیں؟ مسائل کا ایک لامتناہی سلسلہ۔ ملازمین کی بھرتی، تعمیر میں تاخیر، آلات کی خریداری کے مسائل اور اخراجات پورے کرنے کے لیے رقم کی مسلسل اور متواتر فراہمی درکار تھی۔ جب بھی خطرہ ہوا کہ فنڈز کی کمی سے کام اب رک جائے گا، آخری لمحے کوئی نہ کوئی، کچھ نہ کچھ لے کر آ پہنچتا۔ ہمارا پہلا چیف ایگزیکٹو ڈیوڈ وڈ (David Wood) کہا کرتا ''75 سے 80 فیصد لوگوں کے مفت علاج کی خواہش کو پورا کرنا ممکن ہی نہیں۔'' اپنے موقف کو درست ثابت کرنے کے لیے ایک روز

اعداد و شمار سے لیس ہو کر آیا اور کہا ''اگر تم نے 5 فیصد سے زائد مریضوں کا مفت علاج کرنے کی کوشش کی تو ہسپتال چند ہفتوں میں بند ہو جائے گا۔''

جس کام کا بیڑا ہم نے اٹھایا تھا، آج تک دنیا کا کوئی نجی کینسر ہسپتال کر نہ پایا تھا۔ قوم سے میں وعدہ کر چکا تھا کہ غریبوں کا علاج مفت ہوگا کہ انہوں نے ہسپتال کے لیے چندہ دیا تھا، اس لیے بھی مجھے اپنے وعدے پر قائم رہنا تھا۔ مجھ سے وہ پوچھتے ''کیا واقعی غریبوں کا علاج مفت ہوگا؟'' ان کی حیرت بجا تھی۔ ان گنت صدیاں گزر گئی ہیں کہ اس خطۂ ارض کے عوام اشرافیہ کے توہین آمیز روّیوں کا شکار ہیں۔ امریکی ڈیوڈ وڈ (David Wood) کا تجزیہ اپنی جگہ۔ صرف میں نہیں بلکہ بورڈ کے تمام ارکان نے اپنے عزم پر سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا۔ نہ صرف طے کردہ تناسب سے مفت علاج کی سہولت لازماً ہوگی بلکہ یہ بہترین عمارت، بہترین آلات اور بہترین سہولتوں کا حامل ہسپتال ہوگا اور تحقیقی مرکز بھی۔ میں نہ جانتا تھا کہ مفت علاج کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ پھر بھی وڈ کی بات ہم نے مسترد کر دی۔

عالمی کپ سے جنم لینے والے جوش و خروش کے باعث کام چلتا رہا لیکن 1994ء میں بالآخر بحران نے ہمیں آلیا۔ روپیہ تمام ہو رہا تھا۔ بیرون ملک پاکستانیوں سے مدد حاصل کرنے کے لیے میں ہمیشہ سفر میں رہتا۔ 1994ء میں اس مقصد کے لیے میں نے نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، سنگاپور، برطانیہ، جرمنی، ڈنمارک، ہالینڈ، امریکہ، کینیڈا، متحدہ عرب امارات، بحرین اور سعودی عرب کے دورے کیے۔

دُنیا میں جہاں کہیں پاکستانی آباد تھے، وہاں میں پہنچا اور ان سے فنڈ فراہم کرنے کی درخواست کی۔ اس برس موسمِ گرما تک حالات یہ ہو گئے کہ اہل خیر مجھے دیکھتے ہی چھپ جایا کرتے حالانکہ یہی وقت تھا جب پیسے کی زیادہ ضرورت آن پڑی تھی۔ تعمیر مکمل ہو گئی اور عملہ رکھ لیا گیا تھا، آلات کے لیے ادائیگی ہو چکی تھی، جاری اخراجات کے لیے روپیہ مگر موجود نہ تھا۔ اس

پر مستزاد یہ کہ میں 1994ء میں بال ٹمپرنگ کے تنازعے کا شکار ہو گیا۔ عطیات کا حصول اب اور بھی مشکل ہو گیا۔ پاکستان کے دو تیز ترین عظیم گیند باز/ باؤلر وسیم اکرم اور وقار یونس، میرے ہاتھوں کے سکھائے ہوئے تھے اور میں ان کی کامیابیوں پر فخر کرتا تھا۔ 1992ء میں انھوں نے انگلینڈ کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ برطانوی پریس اور کھلاڑیوں نے زچ ہو کر انھیں بال ٹمپرنگ کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ ریورس سوئنگ کی غیر معمولی اہلیت کو وہ سمجھ نہ پائے۔ ان دو باکمال کھلاڑیوں کے ساتھ یہ سلوک میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ایک اخبار نویس کو اس موضوع پر میں نے انٹرویو دیا چنانچہ مجھے اس تنازعے میں گھسیٹ لیا گیا۔ پھر یہ ہوا کہ انگلینڈ کے سابق آل راؤنڈر آئن بوتھم (Ian Botham) اور بلّے باز ایلن لیمب (Allan Lamb) مجھے عدالت میں لے گئے۔ تلخی بہت بڑھ گئی، عطیات کی وصولی پر منفی اثرات پڑنے لگے۔

ارادہ یہ تھا کہ 1994ء کے موسم گرما میں ہسپتال آغاز کرے گا۔ موسم بہار آنے والا تھا جب ٹھیکیدار نے ہمیں بتایا کہ ایک برس اور انتظار کرنا ہوگا، دسمبر سے پہلے عمارت مکمل نہ ہوگی۔ ہسپتال بروقت کھلنا چاہیے تھا۔ 1995ء کا رمضان المبارک فروری اور مارچ میں آنا تھا۔ رمضان کا مہینہ وہ ہے جب مسلمان دل کھول کر خیرات کرتے ہیں۔ اسی رقم کے ساتھ ہمیں غریبوں کو مفت علاج کی سہولت دینا تھی۔ 1996ء کے ماہ صوم تک انتظار کا مطلب یہ بھی ہوتا کہ ہم اپنے تمام طبی اور انتظامی عملے کے اخراجات برداشت کرتے رہیں جو 14 ماہ سے تنخواہ پا رہے تھے۔

معجزہ ایک عجیب انداز میں رونما ہوا۔ ٹی ایم خان اس شخص کا نام تھا جو اچانک سامنے آیا، تعمیرات کا ایک ٹھیکیدار، ایک غیر معمولی آدمی۔ اس نے ہم سے یہ کہا ''تمام تر اختیار مجھے دے کر معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجیے، میں بروقت کام مکمل کر دوں گا۔'' تمام تر مشکلات کے باوجود اس نے یہ کر دکھایا۔

اس کے باوجود اکتوبر میں پیسے ختم ہو گئے۔ ہسپتال شروع کرنے کے لیے مزید چالیس لاکھ ڈالر درکار تھے۔ سحر سے شام تک یہی فکر مجھے لاحق رہتی۔ کسی نے ان پاکستانیوں کی طرف توجہ مبذول کرائی جو ایک ہزار یا اس سے کم کا عطیہ دے سکتے۔ ان میں سے بعض میرے پاس آیا کرتے۔ ایسے تو بہت ہوں گے مگر ان بے شمار لوگوں سے رابطہ کیسے ہو؟ میرے دوست طاہر علی خان نے جو مارکیٹنگ کے شعبے میں ایک بہترین ماہر ہیں، صلاح دی کہ ایک بڑا ڈبا اٹھا کر پورے ملک کا چکر لگانا چاہیے۔ اس سے پہلے عوام سے اپیل کرنی چاہیے جو ہر ایک تک پہنچ جائے۔

مارکیٹنگ والے شکوک میں مبتلا تھے۔ آخر کار مگر وہ متفق ہو ہی گئے۔ اول ہم نے ایک تجرباتی دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس شہر کا نام ڈسکہ ہے جس پر اتفاق ہوا تھا۔ 15 اکتوبر کو ایک کھلے ٹرک میں سوار ہو کر اس مقام پر ہم جا پہنچے۔ پوسٹر پہلے ہی لگائے جا چکے تھے۔ آہستہ خرامی کے ساتھ ہم سڑک پر چلتے رہے اور چند گھنٹوں میں پانچ لاکھ روپے جمع ہو گئے۔

ملک کے 29 چھوٹے بڑے شہروں میں مہم کی منصوبہ بندی ہم کر چکے تھے۔ وسط نومبر سے دسمبر تک صبح سات بجے سے دوپہر ایک بجے تک میں طلبا سے خطاب کرتا جس کے بعد ہم سڑک پر ہوتے۔ میرے جانے سے پہلے ہماری ٹیم تاجر تنظیموں اور گروپوں سے ملتی۔ سکول کے بچوں کی طرح وہ بھی میرے اہم ترین عطیات دہندگان ثابت ہوئے۔ اس تجربے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ بہت سے دوسرے لوگوں پر بھی انکشاف ہوا کہ اس ملک کے لوگوں میں کتنی صلاحیت اور کس قدر خیر پوشیدہ ہے۔ اب بہت شدت کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ سیاست میں حصہ لینا ہی چاہیے۔ عام پاکستانیوں کی فیاضی نے مجھے ششدر کر دیا۔ عنایات کرنے والے دولت مندوں کے لیے ہم تقریبات کا اہتمام کرتے اور تفریح کا کچھ نہ کچھ اہتمام لیکن عوام کے لیے ایسا کچھ نہ کرنا پڑا۔ اس کے باوجود جو کچھ ان کے پاس تھا، انہوں نے میرے حوالے کر دیا۔

سیلاب کی طرح میری جیپ کی طرف وہ امنڈے چلے آتے، جہاں میں چندے کا ڈبا رکھے بیٹھا تھا۔ ان کی مہربان بے تابی مجھے حیران کیے رکھتی۔ مردوں نے اپنی گھڑیاں اتار دیں اور خواتین نے کھڑکیوں سے زیور مجھ پر پھینک دیے۔

عطیات دینے والوں کے لیے عشائیے سے فارغ ہو کر آدھی رات کو میں وہاں پہنچتا جہاں شب بسر کرنا ہوتی۔ عطیات دینے والے ہوٹل میں منتظر ہوتے۔ دیہات سے پیغام آتے کہ میں وہاں جا کر رقم لے آؤں جو انہوں نے جمع کر رکھی ہوتی۔ مہم سے پہلے ممتاز اخبارات کے مدیروں سے ملاقات کر کے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ میں یہ کہوں گا کہ ایک انگریزی اخبار کے علاوہ سب نے خوب تعاون کیا۔ شاندار خبروں کے ذریعے انھوں نے اسے عطیات دینے کا ایک مقابلہ بنا دیا۔ کس شہر اور کس محلے نے کتنی رقم دی؟ چھ ہفتوں پر محیط یہ ایک تھکا دینے والا سفر تھا لیکن جب لوٹ کر ہم آئے تو ہمارے پاس پچاس لاکھ ڈالر تھے۔ یہ ہمیں عام پاکستانیوں نے دیے تھے، جن سے کبھی کوئی امید نہ رکھی گئی تھی، جن پر کبھی کسی نے بھروسا نہ کیا تھا۔ ایک ایسے منصوبے کے لیے بے پناہ ایثار انہوں نے کیا تھا جو ان کے گھروں سے بہت دور لاہور شہر میں واقع تھا۔ میں ان سے پوچھتا ”تم کیوں عطیہ دے رہے ہو؟“ ہمیشہ مجھے ایک ہی جواب ملتا ”آپ پر میں احسان نہیں کر رہا، یہ میری آخرت کا سوال ہے۔“ مجھ پر اس بات کا بہت گہرا اثر ہوا۔ میرے دل میں ان سب لوگوں کے لیے محبت اور احترام کے جذبات جاگے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ماضی میں ان کے بارے میں ایسے احساسات میں ہرگز نہ رکھتا تھا۔ خاص طور پر ایک واقعہ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

مسلسل بارہ گھنٹے کی مہم کے بعد میں گھر پہنچا۔ سفر کی تکان سے بدن ٹوٹ رہا تھا۔ ہمت اب جواب دے گئی تھی لیکن گھر کے دروازے پر کچھ لوگ آئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ انہوں نے کچھ رقم جمع کی ہے اور میرے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ اندازہ لگایا کہ غریب لوگ ہیں، کچھ زیادہ

نہیں دے سکتے۔ میں نے ان سے کہا وہ فکر مند نہ ہوں، ہم کام چلا لیں گے۔ انہوں نے انکار کر دیا اور اصرار کرتے رہے کہ میں ان کے ساتھ چلوں چنانچہ میں ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ایسی خراب وخستہ گاڑی کہ بمشکل گڑھی شاہو کا سفر طے کر پائی جو زمان پارک میں میرے گھر کے پاس ہی واقع ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ مجھے ساتھ لیے گلی کے اندر داخل ہو گئے جن میں کھلی نالیوں کی بدبو چاروں طرف پھیلی تھی۔ دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے میں ان کے ساتھ چلتا رہا حتیٰ کہ ہم ایک مسجد میں پہنچ گئے۔ پتا چلا کہ رقم ابھی جمع نہیں کی گئی۔ ایک شخص نے مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان کیا کہ عمران خان یہاں موجود ہیں، لوگ آئیں اور عطیات دیں۔ غصے اور تھکاوٹ سے میرا برا حال تھا۔ جی میں یہ آنے لگا کہ جو شخص مجھے لے کر آیا ہے اسے ایک آدھ جڑ دینی چاہیے۔ کیا عجب ہے کہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ دیکھا کہ ہجوم کا ہجوم مسجد میں چلا آتا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے عبادت گاہ ان سے بھر گئی۔ ان میں سے بیشتر بہت ہی غریب تھے۔ وہ پانچ، دس یا پندرہ روپے دے سکتے اور دے رہے تھے۔ میرا غصہ بھاپ بن کر اڑا اور غائب ہو گیا۔ آنسو میری آنکھوں میں امنڈ آئے اور بہت مشکل سے میں ضبط کر پایا۔ اتنے غریب لوگ، میں نے سوچا، یہ تو اپنی ادنیٰ ضروریات بھی بسا اوقات پوری نہیں کر سکتے، ان سے روپیہ نہ لینا چاہیے اور میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں نہیں لے سکتا لیکن وہ ڈٹ گئے۔ انہوں نے کہا ''یہ ہمارا حق ہے کہ ہم اس مہم میں حصہ لیں۔ ہم بھی اپنی آخرت سنوارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' پہلے ایک، دوسرے اور پھر تیسرے نے اپنی دکھ بھری کہانی کہی کہ کس طرح ان کے پیارے علاج کے بغیر قبروں میں اتر گئے۔ ایک خاتون نے کہا کہ اس کا بیٹا ہسپتال کے کمرۂ انتظار ہی میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ رخصت ہونے سے پہلے اب مجھے اپنا وعدہ دہرانا اور ہمیشہ اسے یاد رکھنا تھا کہ غریبوں کا علاج مفت ہو گا۔ مجھے اس بات کا ادراک ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا تعلق ایمان سے ہوتا ہے، بینک بیلنس سے نہیں۔ میڈیا پر ہمارے سیاست دان اور دانش ور

بحث کرتے ہیں کہ ریاست کس حد تک اسلامی ہونی چاہیے۔ ادھر پاکستانی عوام مسلسل اپنے دین کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ یہ بات ان میں سے ہر ایک کو ولی اللہ تو نہیں بناتی لیکن ان کے اندر کچھ اچھے اوصاف ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اگر ہم اس جہان میں دیں گے تو اس کا اجر دوسری دنیا میں مل جائے گا۔ مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ لوگ بڑی سے بڑی قربانی دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اپنے آپ سے میں نے سوال کیا کہ ہم عوام کو مسلسل زوال کی طرف گامزن اپنے ملک کو سنبھالنے کے لیے متحرک نہیں کر سکتے؟ یقیناً ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک مخلص حکومت ہو جو پوری یکسوئی کے ساتھ معاشرے سے غربت اور ناانصافی ختم کرنے کا عزم کرے۔ لوگ ایسی حکومت کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے اور پھر پاکستان کو ہر چند ماہ بعد دوسرے ملکوں، عالمی بینک اور عالمی مالیاتی فنڈ (IMF) سے بھیک نہ مانگنی پڑے گی۔

جب میں نے ایک مرتبہ اس موضوع پر ممتاز دانش ور مرحوم ڈاکٹر اشفاق احمد سے بات کی تو انہوں نے چیئرمین ماؤ کے ساتھ اپنی ایک ملاقات کا حال بتایا۔ یہ 1960ء میں ہوئی تھی۔ چیئرمین ماؤ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اشفاق احمد کا تعلق پاکستان سے ہے، تو انہوں نے کہا ''آپ کے عوام میں بلا کی صلاحیت ہے۔'' ماؤ اس واقعہ سے متاثر تھے جو پاکستان میں متعین چین کے ایک سفیر نے انہیں سنایا تھا۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ چینی سفارت کار ایک پاکستانی دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ کراچی کی جھلسا دینے والی گرمی اور پاکستانی نے روزہ رکھا ہوا۔ بے چارہ گرمی کے باعث شدید تکلیف میں، ہر چند منٹ کے بعد چال چلنے سے پہلے سر میں پانی ڈالتا۔ چینی سفیر نے اس سے کہا: تھوڑا سا پانی پی کیوں نہیں لیتے؟ پاکستانی نے برا منایا اور کہا ''تم اللہ تعالیٰ کو کیسے دھوکا دے سکتے ہو؟'' چیئرمین ماؤ نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر ایک قوم ایسی قوتِ ارادی اور ضبطِ نفس کے ایسے اوصاف کی مالک ہے تو وہ عظیم کارنامے انجام

دے سکتی ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس قوم کی صلاحیت اور قوت کا ادراک کبھی نہ کیا گیا، کبھی وہ آزمائی نہ گئی، کبھی اس پر اعتماد نہ کیا گیا اور اسے کبھی کوئی موقع نہ دیا گیا۔

ہسپتال کی تعمیر میں ایک طرف سرکار کی طرف سے پیدا کردہ دشواریاں اور دوسری طرف عام پاکستانی کی حیران کن فیاضی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کرپشن اور پاکستان کی بگڑی ہوئی نوکر شاہی سے لڑتے ہوئے پاکستان میں کامیابی کا حصول کس قدر دشوار ہوتا ہے۔ 29 دسمبر 1994ء کو ہسپتال کے افتتاح سے قبل پچاس ہزار آدمی لاہور کے فورٹریس سٹیڈیم میں جشن منانے کے لیے جمع تھے۔ ٹھنڈ اس رات اپنے عروج پر تھی اور آدمی سے اس کا حال پوچھتی تھی۔ اگلے روز کینسر کی دس سالہ مریضہ سمیرہ نے ربن کاٹ کر ہسپتال کا باقاعدہ افتتاح کر دیا۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ میری زندگی کا بہترین لمحہ تھا۔

بے نظیر اور آصف علی زرداری چونکہ افتتاح کا اعزاز حاصل نہ کر پائے تھے لہٰذا انہوں نے مجھے معاف نہ کیا۔ سرکاری ٹیلی ویژن اور ریڈیو اب تک منصوبے کے ساتھ تھا۔ اب اچانک ہمیں نظر انداز کر دیا گیا۔ عطیات حاصل کرنے کا کام اور بھی مشکل ہو گیا۔ ستر کروڑ روپے سے شاندار عمارت مکمل ہو چکی تھی۔ یہ ایک بہت ہی مشکل کام تھا۔ دوسرا مرحلہ مگر اس سے زیادہ اہم تھا۔ مفت علاج کے لیے فنڈز مسلسل درکار تھے، جس طرح جینے کے لیے مسلسل پانی۔ سرکاری صحافیوں نے اچانک میرے خلاف شرمناک مہم شروع کر دی۔ ہسپتال کھلنے کے ایک ماہ بعد مجھ پر خرد برد کا الزام لگا دیا۔ لاہور ہائیکورٹ میں مجھے گھسیٹ لیا گیا۔ یہ محض اتفاق نہ تھا کہ میرے خلاف کیے جانے والے مقدمے کے لیے ٹھیک وہ وقت چنا گیا جب رمضان المبارک میں زکوٰۃ کی مہم شروع ہونے والی تھی۔ منصوبہ واضح تھا۔ اگر ہم مناسب رقم جمع ہونے سے پہلے مریضوں کا مفت علاج شروع کرتے تو دیوالیہ ہو جاتے۔ دوسری طرف ہم اگر ایسا نہ کرتے تو سرکاری میڈیا مجھے فراڈ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں عوام کو بار بار

اپنے ذاتی مفادات کے لیے برتا گیا، وہ بے انتہا شکی ہو چکے ہیں۔ وہ میرے بارے میں بری بات پر یقین کر لیتے۔ خوش قسمتی سے مقدمے کے غبارے سے جلد ہوا نکل گئی۔ غیر معمولی طور پر سخت مالی ڈسپلن ہم نے نافذ کیا تھا۔ ہر چیز شفاف تھی۔ ہمارے کھاتوں کی نگرانی ایک بہت ہی نیک نام فرم کے ذمے تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ اتفاق کہ تب ہسپتال کا سب سے بڑا عطیہ دینے والا بھی میں خود تھا۔

بے نظیر حکومت نے حالات کا ٹھیک اندازہ نہ لگایا تھا۔ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ کم از کم میرے بارے میں لوگ حکومت کی بات پر یقین نہ کرتے۔ وہ جانتے تھے کہ سرکار مجھ سے خوف زدہ ہے اور اس لیے میری کردار کشی کی جا رہی ہے۔ حکومت پہلے ہی غیر مقبول تھی۔ عوام کو اس پر اعتبار نہ رہا تھا لہٰذا میں سیاست میں آئے بغیر ہی سیاست میں آ گیا۔ حکومت نے مجھے ایک سیاسی مخالف سمجھنا شروع کر دیا۔ حکومت سیاسی ہو یا فوجی، پاکستان میں سیاسی مخالف کو رگڑا ضرور دیا جاتا ہے۔ پوری سرکاری مشینری آپ کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ جیسا کہ ترقی پذیر ملکوں میں ہوتا ہے، حکومت ہر کہیں اثر انداز ہوتی ہے۔ میرے فون ٹیپ کیے جاتے اور جہاں کہیں میں جاتا ایک کار میرا پیچھا کرتی۔ جو لوگ سرکاری مشینری کا حصہ تھے، وہ میرے ساتھ تعلقات کا اقرار کرنے سے گریزاں ہونے لگے کہ نوکری سے نکال نہ دیے جائیں۔

میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔ میں نواز شریف کے ساتھ مل کر ان کے تحفظ میں آ جاؤں یا پھر اسلام آباد کے بے نظیر شاہی دربار میں حاضری دوں، معافی مانگوں کہ افتتاح پر مدعو نہ کیا اور انہیں قائل کروں کہ وہ مجھے اپنا مخالف نہ سمجھیں۔ میرے دوست یوسف صلاح الدین نے جو بے نظیر اور زرداری کے قریب تھا، مجھے مشورہ دیا کہ مجھے دوسری راہ کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس نے خبردار کیا کہ بصورت دیگر زرداری ہسپتال کا بیڑا غرق کر دے گا۔ اس نے پیشکش کی کہ وہ حکومت کے ساتھ میری مصالحت کرانے کے لیے تیار ہے۔ منطقی طور پر یوسف کا

مشورہ موزوں ہی ہوگا لیکن مجھ پر اس کا الٹا اثر ہوا۔

عطیات کے لیے نت نئے طریقے سوچنے اور مختلف طرح کے مؤثر انداز اپنانے میں ہماری ٹیم کا جواب نہ تھا۔ بہت سے فلاحی ادارے ہمارے تجربات سے متاثر ہوکر ہمارے ہی طریقوں پر آج عمل پیرا ہیں۔ ابھی مزید چیلنج سامنے آنا تھے۔ طبی آلات اور مشینری کی بڑی تعداد کسٹم میں پھنسی تھی۔ میں رشوت دینے پر آمادہ نہ تھا چنانچہ اس مقصد کے لیے دوست احباب سے مدد لینا پڑی۔ عالمی بینک نے ہسپتال کا کوڑا کرکٹ ٹھکانے لگانے کے لیے ایک مشین خریدنے کی خاطر 10 لاکھ ڈالر کی مدد کا اعلان کیا تھا۔ انسنیریٹر (Incinerator) ایک بہت ہی کارگر چیز ہے جو کوڑے کو جلا کر ختم کر دیتی ہے۔ ہمیں یہ رقم نہ مل سکی۔ بے نظیر بھٹو کے فوراً بعد برسراقتدار آنے والے نواز شریف یہ سہولت کسی اور ہسپتال کو دینے پر بضد ہوگئے۔ ارجنٹائن کے صدر کارلوس نے ہسپتال کو بہت بڑی مقدار میں کینسر کی ادویات مفت فراہم کرنے کی پیشکش کی۔ اس کے لیے مگر ہمیں نواز شریف کے کٹھ پتلی صدر رفیق تارڑ کی طرف سے ایک سرکاری خط کی ضرورت تھی۔ صدر نے انکار کر دیا اور یہ عطیہ ہم حاصل نہ کر پائے۔ رفیق تارڑ ایک نہایت ہی نیک اور عبادت گزار آدمی تھے۔ لاہور میں سبکدوشی کے پندرہ برس بعد، اب لاہور میں وہ ضمیر کے کامل اطمینان کے ساتھ شادمان زندگی گزار رہے ہیں۔

سب سے بڑا دھچکا 1996ء میں ہسپتال میں ہونے والا بم دھماکا تھا۔ جن دنوں میں کھلے عام ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کا ارادہ کر رہا تھا، اس کے چند ہفتے بعد یہ المناک واقعہ رونما ہوا۔ اس میں دو مریض بچوں سمیت سات افراد جاں بحق ہوئے جب کہ 35 زخمی ہوگئے۔ ہسپتال کو کروڑوں روپے کا نقصان پہنچا۔ بم کمرۂ انتظار میں کرسی کے نیچے رکھا تھا۔ دھماکے سے اینڈوسکوپی (Endoscopy) اور بیرونی مریضوں کے شعبے تباہ ہوگئے۔ اگر کھڑکیاں غیر معمولی طور پر بڑی نہ ہوتیں تو پوری چھت نیچے آجاتی۔ جس وقت یہ دھماکا ہوا، مجھے بھی وہیں موجود ہونا

تھا۔ ممتاز کاروباری شخصیت جناب نسیم سہگل کو میرے ساتھ ہسپتال کا دورہ کرنا تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے میں گھر سے نکلنے والا تھا کہ نسیم سہگل نے پروگرام ملتوی کرنے کی اطلاع دی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں دھماکے کا نشانہ تھا تاہم انسانی جانوں کا ضیاع اور ہسپتال کو پہنچنے والے نقصان نے مجھے بہت دکھی کیا۔ اپنے مقصد کے لیے میرا عزم اور بھی پختہ ہوگیا۔ اس واقعے کے نتیجے میں جو دباؤ مجھ پر آیا اس سے نمٹنے کے لیے وہی انداز اختیار کیا جو کرکٹ کے بحرانوں میں میرے کام آیا تھا۔ ناکامی کے اندیشوں کو میں نے دل سے نکال باہر کیا۔ تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز کردی کہ کامیابی کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اگر یہ کاروباری منصوبہ ہوتا تو ان عظیم رکاوٹوں کے مقابل دم توڑ دیتا لیکن یہ تو مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ بالآخر اس نے پاکستان کے سب سے بڑے فلاحی ادارے کی حیثیت اختیار کرلی۔ ہسپتال کی کامیابی اس کے تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت بن گئی۔ اپنی اچھی کارکردگی سے اس ادارے نے بہت نیک نامی سمیٹی۔ 65 فیصد مریضوں کا علاج بالکل مفت جب کہ 10 فیصد کا معمولی معاوضہ پر علاج کیا جاتا ہے۔ 25 فیصد سے پورا معاوضہ لیکن مغرب کے مقابلے میں بالعموم 25,30 فیصد سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ ملک کا واحد ہسپتال ہے جس سے امیر اور غریب یکساں طور پر فیض پاتے ہیں۔ رائے عامہ پر اثر انداز ہونے والی شخصیات نے رفتہ رفتہ اس ادارے کا تاثر بہتر بنانے میں مدد دی۔ وہ جو علاج کے لیے آئے تھے یا اپنے جاننے والوں اور رشتے داروں سے ملاقات کی خاطر، وہ سب ایک ہی نتیجے پر پہنچے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہسپتال کے خلاف اس قسم کا پروپیگنڈا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا۔ شوکت خانم کی ایک منفرد خصوصیت اور بھی ہے کہ ہر مریض کو معالج ایک سی توجہ دیتے ہیں۔ اس بات کا انہیں علم ہوتا ہی نہیں کہ کون سا مریض ادائیگی کر رہا ہے اور کون سا نہیں۔

امیر ہو یا غریب سب انتظار کے ایک ہی کمرے میں بیٹھتے ہیں، سب کے لیے ایک جیسے کمرے ہیں، یہاں کسی سے امتیازی سلوک نہیں ہوتا، کسی کو قطار میں دھکے نہیں کھانا پڑتے،

کسی کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں یہ بہت ہی انوکھی بات ہے۔ صدیوں سے، حقیقت یہ ہے کہ پوری معلوم انسانی تاریخ میں یہ معاشرہ بندہ و آقا میں تقسیم چلا آیا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کے بعد معاملہ اور بھی بگڑتا گیا کہ قانون کی عمل داری تو تھی نہیں، امیر اور بااختیار لوگ خصوصی توجہ کے عادی ہو چکے۔ دوسری منشیات کی طرح یہ بھی ایک نشہ ہے، کم ہی جس سے کوئی نجات پا سکتا ہے۔ ہسپتال پر امسال تین ارب ساٹھ کروڑ کے اخراجات اٹھے۔ عوامی عطیات اور آمدن سے نہایت سہولت کے ساتھ بندوبست ہو گیا۔ نصف حصہ تو خدمات کے معاوضے سے مل جاتا ہے جب کہ باقی رقم دنیا بھر سے ملنے والے عطیات سے پوری کی جاتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر مقبول شخصیات کے علاوہ جن میں شہزادی ڈیانا (Princess Diana)، فلمی ستارے خاص طور پر عامر خان اور ایلزبتھ ہرلے (Elizabeth Hurley) شامل ہیں۔ عطیات جمع کرنے میں ان لوگوں نے بڑی مدد کی۔ 2006ء میں صحت کے شعبے میں غیر معمولی خدمات پر عالمی ادارہ صحت کا انعام شوکت خانم ہسپتال نے حاصل کیا۔ مجھ سمیت 84,000 سے زائد مریضوں کا علاج اب تک اس ادارے میں ہو چکا۔

2009ء میں میرا ہنگامی آپریشن کیا گیا۔ میرے والد نے اپنی زندگی کے آخری اڑھائی ماہ یہیں گزارے تھے۔ ہم کراچی اور پشاور میں بھی اسی قسم کے ہسپتال قائم کرنے کی منصوبہ بندی کر چکے ہیں۔ دونوں شہروں میں کینسر کی ابتدائی تشخیص کے مراکز پہلے ہی کام کر رہے ہیں۔ لاہور اور کراچی میں قائم تشخیصی مراکز اور پاکستان بھر میں موجود 67 کولیکشن سنٹرز نے ٹرسٹ کی خود کفالت کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ چھوٹی سی لڑکی سمیرہ، 1994ء میں جس نے فیتہ کاٹ کر ہسپتال کا افتتاح کیا تھا، 500 افراد پر مشتمل ہسپتال کے عملے کا حصہ ہے۔ وہ ہسپتال کی ایک گفٹ شاپ چلاتی ہے، تحفے جو مریضوں کو دیے جاتے ہیں۔ کوئی بچہ جو مایوسی اور خوف کے عالم میں لایا گیا تھا کل اپنے قدموں پر چلتا ہوا زندگی کے کارواں میں شامل ہو جائے گا یا

کوئی دوسرا جو اس طرح دنیا سے رخصت ہوا کہ پوری محبت اور توجہ کے ساتھ اس کی دیکھ بھال ہوئی۔ انسانوں کے جنگل میں اسے تنہا نہ چھوڑ دیا گیا۔ میرے مخالف سیاست دان اس قدر خوف زدہ تھے کہ وہ ہسپتال کو نقصان پہنچانے پر تلے رہتے۔ ذاتی سطح پر ہسپتال نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ اتنا کچھ کہ شکر گزاری کے احساس سے میرا سر جھک جاتا۔ مجھے پتا چلا کہ کسی ادارے کو کیسے بنایا اور چلایا جاتا ہے۔ سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ لیڈر اگر قوانین کی پاسداری کرے گا تو دوسرے بھی ایسا ہی کریں گے۔ کرکٹ ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے ابتدائی طور پر یہی بات میں نے سیکھی تھی۔ اپنی ٹیم میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے میں صرف یہ کرتا تھا کہ سینئر کھلاڑی کبھی کسی حال میں قانون نہ توڑیں۔ نئے کھلاڑی خودبخود پابند ہو جاتے۔ دوسری بات یہ کہ کسی ادارے کے سربراہ کی پیشہ ورانہ لیاقت سے زیادہ اہم دیانت ہوتی ہے۔ دیانت سب سے زیادہ ناگزیر ہے۔ کوئی خواہ کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو، اگر وہ بددیانت ہوگا تو ادارے کو برباد کر کے رکھ دے گا۔ میں کرکٹ میں یہ دیکھ چکا ہوں۔ کام کی لگن اور جوش ایک کم اہلیت رکھنے والے کھلاڑی میں ایسی ترنگ پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ زیادہ اہلیت رکھنے والے کھلاڑیوں سے بھی زیادہ نتیجہ خیز ہو جاتا ہے۔ اس بات پر مجھے فخر ہے کہ آج پورے ملک میں یہ ہسپتال مثالی ادارے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ پورے ملک سے ڈاکٹر اور نرسیں اس کا مشاہدہ کرنے آتے ہیں۔ آغا خان ہسپتال کراچی کی طرح اس نے بھی ملک کے طبی معیار کو بلند ترین سطح پر پہنچانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

ان تجربات نے مجھے پاکستانی عوام کو بہتر طور پر سمجھنا سکھایا۔ عظیم المیے چھوٹے چھوٹے معجزے اور ان لوگوں کا سچا سادہ یقین، یہ سب کچھ میں نے ہسپتال کے کمروں، انتظار گاہوں اور وارڈوں میں دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ موت کا سامنا کس طرح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی رضا ہے۔ سب سے متاثر کن سوات کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اسے ایک روز میں

نے خصوصی نگہداشت کے وارڈ میں دیکھا۔ اس کے پیکر پر نالیوں اور ٹیوبوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود چہرے پر ایک عجب اطمینان تھا۔ زندہ رہنے کے لیے امید اور امنگ سے سرشار اس نوجوان نے مجھے چونکا دیا۔ میں اس میں خاص طور پر دلچسپی لینے لگا۔ میں اس کے والد سے ملا کرتا اور ڈاکٹروں سے علاج پر ہونے والی پیش رفت کا پوچھا کرتا۔

تب تک میرا بیٹا سلیمان پیدا ہو چکا تھا۔ باپ بن جانے کے بعد میری زندگی سب سے بڑی تبدیلی سے دوچار ہوئی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ ماں باپ اولاد کے معاملے میں کتنے کمزور ہوتے ہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ سواتی لڑکے کا باپ کیسی دل فگار کش مکش سے دوچار ہے۔ ایک دن جب میں لڑکے کی خبر لینے گیا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ اللہ کو پیارا ہو چکا۔ اس کے بعد میں نے اس کے باپ کو تلاش کیا۔ میں نے سوچا کہ دکھ سے وہ ٹوٹ گیا ہوگا جبکہ برعکس، بالکل برعکس میں نے اسے راضی بہ رضا پایا۔ اس نے بس اتنا کہا کہ اللہ کی یہی مرضی تھی اور خاموش ہو رہا۔ میں ششدر رہ گیا کہ کس قدر تیزی کے ساتھ زندگی کی سچائی سے اس نے سمجھوتا کر لیا تھا۔ میرا اپنا حال یہ تھا کہ اس روز میں کام ہی نہ کر سکا، دل ٹوٹ گیا اور میں گھر واپس چلا آیا۔

جب تعمیر کا کام جاری تھا تو میاں بشیر باقاعدگی سے ہمارے دفتر آیا کرتے۔ ان کے گھر کے یہ قریب ہی واقع تھا۔ وہ حوصلہ افزائی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھے۔ بعض اوقات قبل از وقت وہ ہمیں مستقبل میں پیش آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا کرتے۔ سب سے بڑھ کر ان کی وہ حکمت و دانائی جو ہمیشہ مجھے حیران کیے رکھتی۔ ایک دن دفتر میں ہم دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ میں پریشان تھا کہ ہسپتال کی تعمیراتی کمیٹی نے ایئر کنڈیشنر نصب کرنے کا ٹھیکا سب سے کم بولی دینے والی فرم کو نہیں دیا۔ اتفاق سے یہ ایک دوست ارشاد خان نے دی تھی۔ کھانے کے دوران ارشاد نے مجھے فون کیا۔ بہت غصے میں، اس نے مجھ سے کہا کہ اس معاملے میں کچھ نہ کچھ گھپلا ضرور ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ فرم دو ٹھیکوں کو ادھورا چھوڑ چکی اور شہرت اس کی

اچھی نہیں۔ میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا، وہ میرا دوست تھا لیکن میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ میں اسے فائدہ پہنچانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں میاں بشیر کو بتاتا، اچانک وہ بولے: جس شخص کو ٹھیکا دیا گیا ہے، تمہاری کنسٹرکشن کمپنی کے ایک شخص نے اس سے ساز باز کی ہے۔ اتنی اہلیت یہ آدمی نہیں رکھتا کہ کام مکمل کر سکے۔ میں بہت فکر مند ہوا لیکن میاں بشیر بولے ”بالکل فکر نہ کرو، معاملات درست ہو جائیں گے۔“ دو ماہ کے بعد یہ کمپنی مالی بحران کا شکار ہو گئی؛ چنانچہ ٹھیکا دوبارہ دینا پڑا۔ اس بار بالکل موزوں اور معقول لوگوں کو۔ کام بروقت مکمل ہوا اور بالکل ڈھنگ سے ہوا، اللہ بڑا کارساز ہے۔
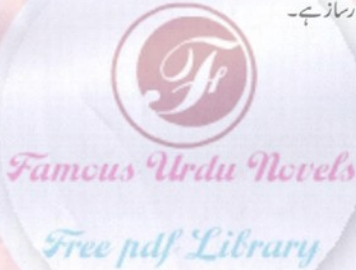
باب ششم

شادی خانہ آبادی

میں اٹھارہ برس کا تھا جب پہلی بار انگلینڈ گیا۔ میری ماں کے آخری الفاظ یہ تھے "واپسی پر اپنے ساتھ کوئی میم نہ لیتے آنا۔" ماں کا خیال تھا کہ ایک مغربی لڑکی ہمارے مذہبی اور ثقافتی ماحول کے ساتھ ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتی۔ اپنے اکثر فیصلے میں نے محض منطق کی بجائے اپنے جذبات اور امنگوں کی بنیاد پر کیے۔ خاص طور پر شادی اور کرکٹ کی زندگی کے اقدامات تو روایات سے یکسر انحراف پر مبنی تھے۔ شادی نے مجھے اُس 'عزت' سے روشناس کرایا جو فقط گھریلو زندگی سے جنم لے سکتی ہے۔ دوسری طرف سیاست نے مجھے بتایا کہ ملک میں طاری جمود کے خلاف آواز اٹھانے کی کتنی بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔ حکومت اکثر بے ضمیر ہوتی ہے۔ کرپشن کے الزامات کا آزمودہ ہتھیار کارگر نہ ہوا تو مخالفین نے میری ذاتی زندگی، خاص طور پر جمائما کے حوالے سے، کردار کشی اور توہین کی مہم شروع کر دی۔ پاکستانی سیاست کے بارے میں سمجھنے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارے سیاستدان اقتدار کی ہر قیمت ادا کرنے کو تیار رہے۔ اختیار کھو جانے کے خوف سے انہیں اور بہت کچھ چھن جانے کی فکر دامن گیر ہونے لگتی ہے۔

سیاست ذاتی طور پر مجھے کچھ نہیں دے سکتی۔ آصف علی زرداری اور نواز شریف کے لیے اقتدار لٹ جانے کا مطلب ہر چیز سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے۔ دولت، محل، مرتبہ، اختیارات، استثنیٰ اور شاید آزادی بھی۔ سیاستدانوں میں بیشتر ایسے ہیں کہ انہیں جیل میں ہونا چاہیے۔ جمائما اور مجھ پر یہ بات آشکار ہونا تھی کہ ہمارا سیاسی مافیا کس حد تک سفاک ہوسکتا ہے۔ کسی "میم" سے شادی کے بارے میں میری والدہ کی نصیحت کو بہت طویل عرصہ گزر گیا تھا، جب میں نے بیاہ کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ میرے اندر راسخ ہوتے روحانی تصورات نے مجھے احساس دلایا کہ میں اب وہ زندگی نہیں گزار سکتا جو اب تک جیتا آیا ہوں۔ روزے رکھنا، نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا آسان ہے مگر یہ مرحلہ مشکل تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ شادی کے ادارے پر میرا یقین ہی متزلزل تھا۔ اپنے آبائی گھر زمان پارک میں پلتے بڑھتے، اپنی بہنوں اور رشتے کے بھائیوں کی طرح میں بھی شادی کو معمول کی بات سمجھا کرتا تھا: ایک دن گھر والوں کی مرضی سے میری بھی سگائی ہوجائے گی۔ جوں جوں بڑا ہوتا گیا، ویسے ویسے اس بارے میں میرے تصورات بدلتے گئے۔ انگلینڈ میں میرے ساتھ کاؤنٹی کرکٹ کھیلنے والے، پھر قومی ٹیم میں میرے ساتھی کہا کرتے تھے کہ شادی شدہ زندگی میں انہیں مشکل ہی مشکل رہی۔ ان میں سے اکثریت کے لیے گھر ایک بوجھ تھا۔ بعض کا خیال تھا کہ بین الاقوامی کھلاڑی کو جن ترغیبات سے واسطہ پڑتا ہے، ان سے بچ نکلنا ممکن ہی نہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ شادی شدہ مردوں کی اکثریت مجھ سے حسد کرتی۔ جب صورتحال ایسی ہو تو شادی سے میرا بیزار ہو جانا کوئی ایسی عجیب بات نہ تھی۔

میں نے اپنی زندگی میں جن شادیوں کو کامیاب دیکھا ہے، وہ میرے وسیع خاندان میں ہونے والی میری بہنوں اور رشتے کے بھائیوں کے بیاہ ہیں۔ تب میری چار میں سے تین بہنیں شادی شدہ تھیں۔ یہ سب شادیاں خاندان کے اندر ہوئیں۔ پنجاب اور برصغیر کے دوسرے

حصوں میں آباد پشتون قبیلوں میں ہمیشہ سے یہی معمول ہے۔ میری تینوں بہنوں نے اپنی شادیوں کے بعد اونچ نیچ دیکھی۔ خاص طور پر شادی کے آغاز میں، جب میاں بیوی ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔ خاندان کی مرضی سے ہونے والی شادیوں میں بھی میاں بیوی کو بالکل ویسی ہی الجھنوں کا سامنا ہوتا ہے، جیسے اپنی پسند کی شادی میں۔ مگر خاندانی شادیوں میں توقعات نسبتاً کم ہوتی ہیں۔ دونوں قسم کی شادیوں میں اہم ترین فرق یہ ہے کہ خاندانی رشتہ دو گھرانوں کو باہم قریب لے آتا ہے۔ میاں بیوی کا ایک دوسرے سے دور ہو جانا مشکل اور طلاق کی نوبت محال ہوتی ہے۔ تعلق اگر الجھ جائے تو دونوں خاندان خاص طور پر میاں بیوی کے والدین، بندھن کو برقرار رکھنے کے لیے متحرک ہو جاتے ہیں۔ از روئے اسلام کسی ٹوٹتی ہوئی شادی کو بچانا بڑا ہی نیک کام ہے۔

ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں زیادہ تر شادیاں والدین کی مرضی سے ہوتی ہیں۔ بیٹی کے لیے لڑکے کی تلاش میں اُس کی مالی حالت، اُس کے خاندان کی شہرت اور دونوں کی شخصیات میں ہم آہنگی کا امکان ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ لڑکا یا لڑکی انکار کر سکتے ہیں لیکن ایسی آزادی کی سطح، مختلف علاقوں اور مختلف معاشرتی طبقات میں، مختلف ہوتی ہے۔ شمال میں نوجوانوں، خاص طور پر لڑکیوں کو اس بات کی آزادی کم ہی دی جاتی ہے۔ شہری علاقوں میں اشرافیہ کے نوجوان اپنے ساتھی خود چنتے ہیں۔ دیہات میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے ایک ساتھ جوان ہوتے ہیں اور اکثر ایک دوسرے سے آشنا؛ چنانچہ والدین کے لیے انتخاب کا مرحلہ آسان ہو جاتا ہے۔

مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب گاؤں میں مطلوبہ معیار کا بَر میسر نہ ہو۔ ایسی صورت میں اردگرد کے علاقوں سے رشتہ ڈھونڈا جاتا ہے۔ تب ممکن ہے کہ لڑکا اور لڑکی شادی کے دن ہی پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھیں۔ روایتی خاندان دولہا کے پس منظر سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ والدین بیٹی کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ کسی ایسے لڑکے سے شادی کرلے، برے حالات میں

جس کا خاندان شادی برقرار رکھنے پر اسے مجبور نہ کر سکے۔ یہ رشتہ نہ صرف خاندانوں کو آپس میں جوڑتا ہے بلکہ پوری سماجی زندگی پر محیط خاندانی ڈھانچے کے گرد گھومتا ہے۔ کوئی خاندان جتنا تگڑا ہوگا اس کی کسی لڑکی کو طلاق دینا اتنا ہی مشکل ہوگا۔ خاندان کی مرضی سے ہونے والی شادیوں میں بدترین صورتحال اس وقت سامنے آتی ہے جب لڑکے اور لڑکی کے مزاج میں ہم آہنگی نہ ہونے کے باوجود مالی حالت کی بنیاد پر بندھن مسلط کر دیا جائے۔ مسائل جو بھی ہوں، والدین کی مرضی سے ہونے والی شادیوں میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے بچوں کے لیے آپ کو قربانی دینا ہوگی۔

سالہا سال سے میں والدین کی مرضی سے ہونے والی بے جوڑ شادیاں دیکھتا آیا ہوں۔ جنہیں میاں بیوی، بچوں کے مستقبل اور خاندانوں کی عزت کے لیے نبھاتے چلے آرہے ہیں۔ خواتین، ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ کمزور حیثیت رکھتی ہیں، اپنے شوہروں کے برے سلوک کو اپنے بچوں کی خاطر برداشت کرتی ہیں۔ دوسری جانب بہت سے شوہر بھی ازدواجی مسائل کے باوجود ہر طرح کی اذیت سہتے ہیں۔ میاں بشیر کی اہلیہ کو پاگل پن کے دورے پڑا کرتے۔ اس کے باوجود چودہ برس تک اپنی بیوی کو وہ خود سنبھالتے رہے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اسے پاگل خانے میں داخل کرا دیا جائے۔ ذہنی امراض کے اداروں کے دگرگوں حالات کے باعث یہ بات انہوں نے گوارا نہ کی۔ دورہ پڑتا تو خاتون بے قابو ہو جاتی۔ اس پاک طینت آدمی کے چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔

میری بہنوں کی ازدواجی زندگی میں اونچ نیچ آتی رہی۔ میں دیکھتا کہ وہ اپنے بچوں میں کیسی روح افزا شادمانی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔ ایک وقت تھا، جب اپنے خاندانوں سمیت وہ میرے والد کے ساتھ رہا کرتیں۔ یہ ہرگز کوئی بوجھ نہ تھا۔ میرے والد کے لیے یہ بڑی پرلطف بات تھی۔ ان سب کے بچے ایک گھر میں ایک خاندان کی طرح رہتے۔ میری تینوں بہنیں

سب کے ساتھ ایسا یکساں برتاؤ کرتیں، جیسے ان میں سے ہر ایک اس کی اپنی ہی اولاد ہو۔

یہ وہ حالات تھے کہ شادی کے بارے میں میرے احساسات بدلنے لگے۔ یہ بات میں خاص طور پر محسوس کرتا کہ ان کے شوہر اپنے بچوں کے پاس آنے کے لیے کس بے صبری کے ساتھ گھر کی طرف دوڑے چلے آرہے ہیں۔ اب میں بھی اپنا زیادہ وقت گھر پہ ہی گزارنے لگا تاکہ بچوں کے ساتھ کھیل سکوں۔ جب کبھی میرا کوئی بھانجا یا بھانجی سکول میں اچھی کارکردگی دکھاتے، ہم سب اور تمام بچے اس کامیابی کو پورے خاندان کا جشن بنا دیتے۔ جب میری دو بہنیں اپنے مکانوں میں منتقل ہو گئیں تو گھر خالی خالی سا ہو گیا۔ ایک سناٹا سا، جیسے در و دیوار اپنے جدا ہونے والے مکینوں کو یاد کرتے ہوں۔ خوش قسمتی سے ان کے گھر ہمارے مکان سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھے۔ اس لیے سب بچوں کی اکثر شامیں ہمارے ہی گھر پہ گزرتیں۔

شادی کا فیصلہ ایک بات تھی مگر ایک پاکستانی بیوی کی تلاش، ایک بالکل دوسری بات۔ میری عمر 35 سے اوپر تھی۔ خاندان کی جن لڑکیوں میں سے انتخاب کیا جا سکتا، وہ تیس، چوبیس برس کی عمر میں بیاہی جا چکی تھیں۔

25 برس سے کم عمر خاتون میرے حساب سے کم عمر ہوتی۔ زندگی کا اسے بہت کم تجربہ ہوتا۔ ایک اور بات کا مجھے خیال رکھنا تھا۔ میرا خاندان رشتہ ڈھونڈنے کے معاملے میں انتہائی قدامت پسند واقع ہوا ہے۔ دلہن منتخب کرنے کے لیے لڑکی اور اس کے والدین کے ساتھ چند مختصر ملاقاتوں کے بعد مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ ہوتا یوں ہے کہ مائیں اور بہنیں اپنے جاننے اور ملنے ملانے والوں کا جائزہ لیتی ہیں۔ چند لڑکیوں کو قطعی انتخاب کے لیے چُن لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد شادی بیاہ اور تقریبات کے دوسرے موقع پر لڑکی دکھا کر رائے معلوم کی جاتی ہے۔ لڑکا اور لڑکی اگر دلچسپی کا اظہار کریں تو پھر اُن کا آمنا سامنا کرانے کے لیے چائے پر بلا لیا جاتا ہے۔ زیادہ تر خاندانوں کی طرح ہمارے ہاں بھی شادیوں میں خواتین اور مردوں کے لیے الگ الگ

انتظام کیا جاتا ہے۔ میری عمر اور حیثیت کے پیش نظر خواتین والے حصے میں جا کر لڑکی دیکھنے کا طریق مجھے مضحکہ خیز سا لگتا۔ ہاں! اگر میں چوبیس، پچیس سال کا ہوتا تو دوسری بات تھی۔ اب میری عمر تجاوز کر گئی تھی؛ چنانچہ یہ ایک فضول سی بات ہوتی۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ گھر کے دوسرے افراد کی طرح میرے والد کی قوتِ برداشت بھی جواب دے گئی۔ اب انہوں نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا۔ اپنے ایک دوست کے ہاں انہوں نے چائے کا بندوبست کرایا تاکہ میں اُن کی دخترِ نیک اختر سے مل سکوں۔ اس صورتحال سے بچنے کے لیے میں نے وہ سب کچھ کیا جو کر سکتا تھا مگر آخر میں اپنے والد کی خاطر، انہیں شرمندگی سے بچانے کے لیے اُن کے ساتھ چلا گیا۔ وہاں پہنچنے پر جو کچھ ہوا، وہ سب کے لیے پریشانی کا باعث بنا۔ لڑکی جب کمرے میں آئی تو میں اس قدر گھبراہٹ کا شکار ہوا کہ نظریں اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ اس کی والدہ میرے ساتھ یوں بات کر رہی تھی جیسے ادھیڑ عمری کی دہلیز پہ کھڑے کسی شخص کی بجائے میں 25 برس کا نوجوان ہوں۔ حتیٰ کہ یونیورسٹی میں گزرے دنوں کے بارے میں انہوں نے پوچھا۔ یہ سوال تو کسی نوجوان ہی سے مناسب تھا۔ بالآخر عذاب ٹلا جب ہم نے اجازت طلب کی۔ واپسی پر والد کو یہ پوچھنے کی زحمت تک نہ کرنا پڑی کہ خاتون کے بارے میں میرا خیال کیا ہے۔

اُنہیں احساس ہوا کہ یہ تو ایک تماشا ہو گیا۔ بس انہوں نے اتنا کہا: تمہاری ماں اب اس دنیا میں نہیں، اس لیے میں نے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کی۔ ہم دونوں بہت ہنسے۔ بہت ادب کے ساتھ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میرے لیے دلہن ڈھونڈنے کی مزید کوئی کوشش نہ کریں۔ میں کرکٹ میں بے حد مصروف تھا اور لاہور میں میرا قیام ایسا طویل نہ ہوتا کہ خاندان والے میری کچھ زیادہ مدد کر پاتے۔ کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد شادی کی آرزو کے لیے میں جن لڑکیوں سے ملا، وہ مجھے مغرب زدہ لگیں۔ مجھے نہ لگتا تھا کہ میرے قدامت پسند

خاندان کے ساتھ وہ ہم آہنگ ہو سکتی ہیں۔ میری بہنیں بہت مضبوط کردار کی مالک ہیں۔ وہ کسی ایسی لڑکی کو برداشت نہ کر سکتیں جو خاندانی روایات کو ملحوظ نہ رکھے۔ آخری بات یہ تھی کہ مجھے شادی کر کے الگ رہنا چاہیے۔ میرے پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی قدامت پسند خاندان کی پڑھی لکھی لڑکی ہی میرے معیار پر پورا اتر سکتی۔ پاکستان میں ایسا ہونا لاٹری نکل آنے سے بھی بڑی بات تھی۔ ”دولہا“ عمر کے جس حصے میں تھا، وہاں یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ کسی کے ساتھ چند روز کی گپ شپ اور محدود سی شناسائی کے بعد شادی کر لے۔ چائے کی ایسی دعوتوں میں شرکت کا خیال جیسی کہ میں نے اپنے والد کے ساتھ بھگتی، میرے لیے انتہائی ہولناک تھا۔ آخر مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ خاندان کے ذریعے طے ہونے والی شادی کے لیے میری عمر بہت زیادہ ہے؛ اگرچہ میں اب بھی کسی پاکستانی خاندان میں شادی کا ارادہ رکھتا تھا۔ انہی دنوں اپنی ایک ایرانی دوست شاریا (Sharia) کی جانب سے لندن میں دیے گئے ایک ڈنر پر میری ملاقات جمائما (Jemima) سے ہوئی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے وہ پرکشش اور ذہین لگی۔ اس بات نے مجھے متاثر کیا کہ اس میں ایک رکھ رکھاؤ تھا اور وہ اپنی اقدار پر بہت یقین رکھتی تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی وہ روحانیت میں دلچسپی رکھتی تھی۔ گو کہ میں جمائما کے بہن بھائیوں اور کئی رشتہ داروں سے مل چکا تھا۔ اس کے والدین سے میری ملاقات ہماری شادی سے کچھ ہی دن پہلے ہوئی۔

مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ میں جمائما کے والدین کو راضی نہ کر پاؤں گا۔ اس کی وجہ محض عمروں کا فرق نہ تھا۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شادی کے بعد جمائما کو پاکستان میں سکونت اختیار کرنا ہوگی۔ مجھے اس بات نے حیرت زدہ کر کے رکھ دیا کہ اس کی ماں لیڈی اینابل (Annabel) اور والد جمی گولڈ اسمتھ (Jimmy Goldsmith) نے اپنی بیٹی کے فیصلے کی کھل کر حمایت کی۔ گو ہمیں مختلف ثقافتوں سے تعلق رکھنے کے باعث شادی کے بعد پیدا ہونے والے مسائل سے خبردار کیا گیا مگر ان میں سے کسی نے بھی جمائما کے قبولِ اسلام پر ناگواری کا

اظہار نہ کیا۔ مغربی دنیا میں اسلام سے تعصب کے تناظر میں، ان کا یہ روّیہ میرے لیے خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ وسط مئی 1995ء میں جب ہماری شادی کے فیصلے کا انکشاف ہوا تو پاکستان اور برطانیہ میں میڈیا نے طوفان کھڑا کر دیا۔ جمائما کے قبول اسلام کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔ برطانوی اخبارات کے پاس جمائما کو سنانے کے لیے بہت سے قصے اور کہانیاں تھیں۔ انہوں نے اسے بتایا کہ پاکستان میں زندگی کس قدر ہولناک ہوگی۔ سنسنی خیز صحافت کے لیے معروف وہاں کے اخبارات کا اسلام کے بارے میں تعصب بالکل واضح تھا۔ انہوں نے جمائما سے کہا کہ اسے پاکستان میں کار چلانے کی اجازت نہ ہوگی۔ اسے سر سے پاؤں تک پردے میں رہنا ہوگا۔

چکرا دینے والے ان اخباری تبصروں کا ایک مثبت پہلو بھی سامنے آیا، غصے میں بھرے مسلمانوں نے ردّعمل میں اسلامی نقطہ نظر واضح کر دیا، مغربی میڈیا جس سے واقف ہی نہ تھا۔ برطانیہ میں جمائما کو ان خبروں سے احساس دلانے کی جو کوشش ہوئی، ان کا لب لباب یہ تھا: تم بہت ہی کم عمر اور معصوم ہو۔ اس بات کو تم سمجھ نہیں پا رہی کہ ایک ادھیڑ عمر شخص تمہیں دولت کی خاطر ورغلا کر اس ملک میں لے جائے گا، خواتین کو جہاں لونڈیاں بنا کر رکھا جاتا ہے۔ اس بات پر مجھے کوئی حیرت نہ تھی کہ شادی کا سبب گولڈ سمتھ خاندان کی دولت کو قرار دیا گیا۔ یہی الزام قائداعظم پر بھی لگایا گیا۔ انہوں نے خود سے 20 برس کم عمر پارسی لڑکی سے شادی کی (رتی بائی نے اسلام قبول کر لیا تھا) مادی ذہنیت رکھنے والے اس کے سوا سوچ بھی کیا سکتے تھے۔

میرے خیال میں جمائما کے ساتھ یہ بہت بڑی زیادتی تھی۔ یہ اس کی ذہانت کے ساتھ کھلی ناانصافی اور پرلے درجے کی بدتمیزی تھی۔ ایسی گھٹیا اخباری مہم کا سامنا کرنے کے لیے کردار کی غیر معمولی قوت درکار ہوتی ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جب وہ اس طرح کی دخل اندازی سے پاک زندگی گزارتی آئی تھی۔ اُس کے لیے یہ ایک کڑی آزمائش تھی۔ اس امتحان میں وہ سرخرو رہی۔ میں نے جمائما کی مدد کی۔ اسلام کے بارے میں کتابوں کا انتخاب

کرنے میں اس کے ساتھ مل کر غور و فکر کرتا رہا۔ میں نے کبھی اپنے نظریات اُس پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کی۔ مجھے وہ وقت یاد آتا جب ماں مجھے باعمل مسلمان بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کرتیں۔ اُن سے شدید محبت کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ یہ کام بعد میں میاں بشیر نے کیا۔ اُن کے حلم نے مجھے فتح کر لیا۔ انہوں نے کبھی کسی چیز کے لیے پابند نہ کیا۔ خود اپنے بل بوتے پر سچائی تک پہنچنے کے لیے وہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

پاکستان پہنچنے پر جمائما کا شاندار استقبال ہوا۔ غیر ملکی پاکستان میں مقامی رسم و رواج کو ملحوظ رکھیں تو انہیں بہت عزت اور پیار ملتا ہے۔ اس کے برعکس تو صرف نائن الیون کے بعد ہوا جب خیبر پختونخوا میں ڈرون حملے شروع ہوئے۔ پھر امریکہ کے علاوہ مغربی ممالک کے خلاف بھی جذبات بھڑک اٹھے۔

ہماری مغرب زدہ اشرافیہ کے بعض لوگوں نے ہماری شادی کے فوراً بعد جمائما کے ساتھ سردمہری کا رویہ اپنایا لیکن جب انہوں نے اُسے سمجھ لیا تو اُن کا طرز عمل بھی خوشگوار ہوتا گیا۔ سردمہری کا سبب یہ تھا کہ وہ مغرب کے بہت ہی ممتاز خاندان سے آئی تھی۔ اس کے سامنے بعض لوگ خود کو کم تر محسوس کرتے۔ اب پاکستانی معاشرے میں ان کا احساس برتری اسی ایک بات کا مرہون منت تو تھا کہ لوگوں میں مغرب زدہ کے طور پر پہچانے جائیں۔ وہ اس ممتاز مغربی لڑکی کے سامنے ابتدا میں ایک پریشان کن صورتحال سے دوچار رہے۔ جمائما کے لیے ایک بات سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ یہ سیاسی پارٹیوں کے ایما پر اس کے خلاف پاکستانی اخبارات کا بے بنیاد پراپیگنڈا تھا۔ کم از کم میرے ساتھ آج بھی بعض اخبار نویسوں اور نام نہاد دانشوروں اور لیڈروں کا طرزِ عمل یہی ہے۔ کبھی وہ میرے مکان کی قیمت 120 ارب بتاتے ہیں۔ کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں نے پرویز مشرف سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ کبھی وہ مجھے پاکستانی فوج کا خفیہ حامی بنا کر پیش کرتے ہیں، جس کے سوات اور وزیرستان میں اقدامات کی مجھ سے بڑھ کر کسی

لیڈر نے مخالفت نہ کی اور اب بھی کر رہا ہوں۔ لیکن پھر بھی انہی الزامات کی یلغار ہے۔ ان کردار کشی کرنے والوں میں سے بعض مخالف سیاسی پارٹیوں کے تنخواہ دار ہیں۔

ابھی میں سیاست میں آیا نہیں تھا۔ اس کے باوجود کینسر ہسپتال سے حاصل مقبولیت کے باعث سیاستدان مجھے ایک خطرہ سمجھتے۔ میڈیا میں موجود حکومت کے پروردہ لوگوں نے میری شادی کو صیہونیوں کی سازش قرار دیا کہ وہ جمائما کے ذریعے پاکستان پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حقیقت میں وہ یہودی نہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اسے بپتسما دیا گیا اور اس طرح ایک پروٹسٹنٹ عیسائی کے طور پر اس کی توثیق کی گئی۔ جمائما کے والد جمی گولڈسمتھ کا باپ ایک یہودی تھا اور ماں فرانس کی کیتھولک عیسائی تھی لیکن اس کی تربیت ایک غیر مذہبی، سیکولر اور بے خدا ماحول میں ہوئی۔ اس معاندانہ مہم نے اس وقت اور زور پکڑا جب اپنی شادی کے ایک برس بعد میں نے سیاسی پارٹی کا اعلان کر دیا۔ جب میں نے جمائما سے شادی کی، تب مجھے سیاسی پارٹی بنانے کا خیال دور دور تک نہ تھا۔

تیزی سے روبہ زوال پاکستان کو دیکھ کر مجھے تشویش گھیر لیتی؛ چنانچہ میں کسی طرح کی سیاسی تحریک کا حصہ بننے کے امکان پر سنجیدگی سے غور و فکر کرتا رہتا۔ ایک عرصے تک مجھے یہ امید رہی کہ میرے جاننے والے لوگ شاید کوئی پارٹی بنا لیں۔ تو میں سوچتا کہ تب میں اس کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاؤں گا۔ آخر کار یہ واضح ہوا کہ ان لوگوں کے پاس نہ تو اتنے مالی وسائل ہیں اور نہ ہی انہیں ملکی سطح پر عوامی حمایت حاصل۔ ان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ پہلے سے موجود اور مضبوط سیاسی پارٹیوں مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کو چیلنج کر سکیں۔

معلوم ہوا کہ میرے لیے یہ راستہ بند پڑا ہے۔ میں نے ملک کی مذہبی جماعتوں میں سے کسی کی حمایت کے امکان کا جائزہ بھی لیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ فلاں جماعت کے لوگوں کا دین کے بارے میں وہی نقطہ نظر ہوگا جو میرا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ آشکار ہوا کہ

ان جماعتوں میں بعض لوگ ایسے ضرور ہیں جو ایمان کی حقیقت پر قائم ہیں لیکن ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے کہ اُس نے اسلام کی محض ملمع کاری کر رکھی ہے۔ ان میں زیادہ تر ایسے تھے جو نسلی اور علاقائی بنیادوں پر سیاست کرنے والوں کی طرح مذہب کو زینہ بنا کر اقتدار حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔ یہ لوگ بھی اتنے ہی مادہ پرست ہیں جتنا کوئی دوسرا سیاستدان۔ جوں جوں سیاسی جماعتوں خاص طور پر مذہبی پارٹیوں کو میں زیادہ گہرائی سے جاننے لگا، مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ علم اور حکمت سے خالی ایمان، صرف متعصب افراد پیدا کرتا ہے۔ وہ رحم دلی اور برداشت کے اوصاف سے خالی ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو رسول خدا ﷺ نے عالم کے قلم کی سیاہی کو شہید کے خون سے افضل کہا تھا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ عوام الیکشن میں مذہبی جماعتوں کو مسترد کر دیتے ہیں۔ وہ 19 فیصد سے زیادہ سیٹیں کبھی نہ جیت پائے۔ اب ان کے ووٹوں کی شرح اور بھی کم ہو چکی۔ غیر ملکیوں کے لیے یہ ایک چکرا کر رکھ دینے والی حقیقت ہے کہ پاکستان کے لوگ اسلام کے لیے جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں لیکن وہ ملک کی باگ ڈور مذہبی جماعتوں کے سپرد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ شادی سے اٹھنے والے ہنگامے کی گرد چھٹی تو پھر ایک مرتبہ میں نے سیاسی لوگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا۔

اُن لوگوں کے ساتھ میں نے اس موضوع پر طویل بحث کی کہ پاکستان کو سیاسی مافیا سے نجات کس طرح دلائی جا سکتی ہے۔ مافیا کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ یہ دونوں بڑی پارٹیاں جمہوریت کے لبادے میں اپنی اپنی باری پر ملک کو لوٹنے میں مصروف رہیں۔ مجھے اس حقیقت نے دہلا کر رکھ دیا کہ حکمران طبقات نے اس ملک کی دولت اور وسائل کو کس بے دردی سے نوچ کھایا ہے، ہوس کی کوئی انتہا نہیں۔ دوسری جانب پاکستانی عوام کی زندہ دلی اور سخاوت نے مجھے متاثر کیا۔ ان اوصاف کا مظاہرہ میں نے شوکت خانم ہسپتال میں بھی دیکھا۔ خوشگوار تعجب کے ساتھ میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ سمندر پار پاکستانی کس قدر باصلاحیت ہیں۔

مشکل ترین کام کو آسان بنا لینے کی کیسی قابلیت اُن میں پائی جاتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں کہ مواقع میسر آ سکیں تو اپنے منتخب کردہ میدان میں وہ بڑی سے بڑی کامیابی حاصل کر کے رہتے ہیں۔ میں یہ پوچھتا ''اگر ہم نے ملک میں ایک ایسا نظام نافذ کیا ہوتا جس میں صلاحیت کا صلہ ملتا تو پاکستان نے کیا کچھ نہ حاصل کر لیا ہوتا؟''

آخر کار میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس نظام کو بدلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ میں اب خود سیاست میں حصہ لوں۔ مگر ایک مسئلہ پریشان کن تھا۔ اگر میں سیاسی جماعت قائم کروں تو پارٹی کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ پاکستان کی سیاست اسی لیے تو چند گھرانوں کی لونڈی بن کر رہ گئی ہے۔ اکثریت کے پاس سیاست میں حصہ لینے کے لیے پیسہ ہے اور نہ ہی وقت۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو 1970ء کے الیکشن میں ایک تحریک پیدا کر کے عوامی امنگوں کے مرکز بن گئے تھے۔ بڑے بڑے سیاسی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے امیدوار ایسے معمولی لوگوں سے شکست کھا گئے، جن کا سیاسی پس منظر کوئی نہ تھا۔ اس اعتبار سے بھٹو خوش قسمت رہے کہ اس دور میں سیاست پیسے کا کھیل نہ تھی۔ جنرل ضیاء الحق کے غیر جماعتی انتخابات کے بعد ہماری سیاست میں روپے کا عمل دخل بہت زیادہ ہو گیا۔ بھٹو کو تین اور آسانیاں بھی حاصل تھیں۔ پہلی بات یہ کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کی فوجی آمریت میں آٹھ برس تک وہ وزیر رہے۔ اس طرح ملک کے سیاسی کھیل سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ ثانیاً ملک میں ایک بڑا سیاسی خلا موجود تھا کہ ایوب خان نے مغربی پاکستان میں تمام سیاسی جماعتوں کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ ثالثاً انتہائی منظم بائیں بازو نے بھٹو کا ساتھ دیا۔ میرا مسئلہ یہ تھا: ایسے صاف ستھرے لوگوں پر مشتمل ایک پارٹی کس طرح قائم کروں جن کے پاس سیاسی جدوجہد کے لیے وقت ہو اور سرمایہ بھی۔

مجھے ایک اور مسئلے کا بھی سامنا تھا۔ اب میں ایک شادی شدہ شخص تھا اور جمائما خود ایک

ایسے ماحول اور ثقافت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی جدوجہد کر رہی تھی جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ اگر میں اپنا تمام وقت سیاست اور ہسپتال کو چلانے پر صرف کر دیتا تو میں اپنی ازدواجی ذمہ داریوں سے کس طرح انصاف کر پاتا؟ ہم نے اس موضوع پر طویل بحث مباحثہ کیا۔ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ پاکستان کے سنجیدہ لوگ سیاست میں مؤثر کردار ادا کریں۔ بصورت دیگر ہمارے سیاستدان اس ملک کا بیڑہ غرق کر ڈالیں گے۔

قائداعظم کے بعد ہماری سیاسی قیادت اخلاقی زوال کی جانب گامزن رہی۔ پوری دنیا میں پیشہ ور سیاستدانوں کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ مگر پاکستان میں دوسرے ترقی پذیر ملکوں کی طرح وہ مجرم جانے جاتے ہیں۔ اس کی ٹھوس وجوہات ہیں۔ میرے لیے یہ بات بڑی حیران کن تھی کہ اس ملک میں کھانے کی میز پر ہونے والی ہر گفتگو میں پاکستان کو برباد کرنے والے ان لیڈروں کو برا بھلا تو کہا جاتا ہے مگر کوئی بھی اس حوالے سے عملی اقدامات پر تیار نہیں۔ متمول طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگ کینیڈا کا پاسپورٹ یا امریکی گرین کارڈ حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اُن کے اندر غیرت اور جرأت نہیں ہے کہ وہ اپنی آرام دہ زندگیاں تیاگ کر کرپٹ سیاستدانوں کا مقابلہ کریں۔ اسلام آباد میں یہ مناظر عام ہیں کہ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ نجی محفلوں میں سیاستدانوں پر لعن طعن کرتے ہیں لیکن اُن کی موجودگی میں عوامی تقریبات میں اُن کے تلوے چاٹنے لگتے ہیں۔

جب 25اپریل 1996ء کو میں نے اپنی جماعت، تحریک انصاف کے قیام کا اعلان کیا تو اسی دن میرے دل سے موت کا خوف نکل گیا۔ میں اس بات سے آگاہ تھا کہ سیاست میں مجھے کیا کرنا ہے۔ جس کسی نے سیاسی مافیا پر ہاتھ ڈالا، پہلے ہی اسے تیار پایا۔ ان کا نظریہ اس بارے میں یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے لیے خطرہ بنے تو اسے خرید لو یا ختم کر دو۔ میں اور میری پارٹی کے بانی ارکان نے ایک ایسی وسیع البنیاد تحریک برپا کی جو ملک میں تبدیلی لانے پر تلی تھی۔ ہمارا

مقصد ایک آزاد معاشرے کی تشکیل ہے جس میں خودمختار عدلیہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔
اسلام آباد میں اپنی ایک پریس کانفرنس کے دوران کسی نے سیاست میں میری ناتجربہ کاری کا
سوال اٹھایا۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا۔ مگر ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے ملکی وسائل کی لوٹ مار
کا بھی کوئی تجربہ نہیں۔ میں نے ہمیشہ بڑے مقاصد کو ذہن میں رکھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بے سرو
سامانی کا مجھے سامنا تھا۔ اس میدان میں میری آمد بالکل ویسی ہے جیسے میں نے پہلی مرتبہ
دوسروں کو تیراکی کرتے دیکھا ہو۔ موسم گرما میں چھٹی کے ایک دن میرے کزن مجھے اپنے ساتھ
ایچی سن کالج کے سوئمنگ پول(Swimming Pool) پر لے گئے۔ میری عمر اس وقت چار
سال تھی اور میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ نہانے کا تالاب دیکھا تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ لوگ
پانی میں اِدھر سے اُدھر تیر رہے ہیں۔ میں نے سوچا یقیناً پانی زیادہ گہرا نہیں۔ اپنے کپڑے اُتار
کر سیدھا پانی میں کود گیا۔ گرتے ہی میں سیدھا تالاب کی تہہ میں جا پہنچا۔ چند ہی دنوں میں میں
تیراکی سیکھ چکا تھا۔ سیاست بھی بالکل ایسا ہی تجربہ ہے، گو میرے لیے سیکھنے کا عرصہ کافی طویل
رہا۔ مجھے سکھانے والا کوئی نہ تھا، کسی تجربہ کار استاد کی رہنمائی مجھے حاصل نہ تھی اور میں نے بہت
سی غلطیاں کر ڈالیں۔

نہ جمائما اور نہ ہی میں خود پوری طرح سمجھ پارہے تھے کہ میری وجہ سے ہم کیسی صورتحال
سے دوچار ہوئے۔ اس موضوع پر ہمارے درمیان بحث کے باوجود ہمیں اس بات کا کوئی اندازہ
نہ تھا کہ ہماری نجی زندگی کس قدر دباؤ کا شکار ہونے والی ہے۔ میرے پاس اپنے خاندان کے
لیے ذرا سا وقت بھی باقی نہ بچا تھا۔ اگلے ڈیڑھ مہینے تک مجھے دن رات بے شمار لوگوں سے
ملاقاتیں کرنا پڑیں۔ پھر مجھے ملک کے تمام صوبوں میں پارٹی رہنماؤں کی تقرری کے لیے مسلسل
سفر کرنا پڑا۔ ہم جہاں پہنچے ہمیں مثبت جواب ملا۔ مگر ہمیں اس بات کی کوئی سمجھ نہ تھی کہ حالات کو
اپنے حق میں کس طرح استعمال کیا جائے۔ پارٹی کے بانی ارکان بھی سیاست میں اتنے ہی

ناتجربہ کار تھے، جتنا کہ میں خود۔ کسی لگی لپٹی کے بغیر میں یہ بات کہوں گا اگر ہمیں یہ پتہ بھی ہوتا
کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، پھر بھی ہم اُن اوصاف سے لیس نہ تھے جو اس کام کے لیے درکار
تھے۔ ہم موصول ہونے والی ای میلز کے جواب بھی ٹھیک سے نہ دے پاتے۔ نہ ہی ہمارے
لاہور دفتر میں آنے والے لوگوں کو پوری توجہ مل پاتی۔ میری بڑی کمزوریوں میں سے ایک یہ تھی
کہ میں لوگوں کی جانچ پرکھ میں ناکام ثابت ہوا۔ بہت سے لوگ ہمارا ساتھ دینے کے لیے
میرے پاس آئے لیکن میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہا کہ آیا وہ حقیقت میں مخلص تھے یا نہیں۔
میری بہنوں کا خیال تھا کہ میری شخصیت کی یہی سب سے بڑی خامی ہے کہ میں لوگوں پر اندھا
اعتماد کر لیتا ہوں۔ میں پارٹی کے لیے کام کرنے کے خواہش مند افراد کو خوش آمدید کہتا مگر چند
گھنٹوں، چند ہفتوں یا پھر چند مہینوں کے بعد یہ بات واضح ہوتی کہ یہ تو محض مفاد پرست تھے۔
میرے مقاصد سے ان کا دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ ہمارا سیاسی میدان دھوکے بازوں سے بھرا پڑا
ہے۔ ان کا اصل مقصد ذاتی مفادات کے لیے اقتدار کا حصول ہے۔ سیاسی میدان کے کھرے
اور کھوٹے کی پہچان میں پورا ایک عشرہ صرف ہو گیا۔ اس دوران میں ہزار ہا لوگوں سے ملا اور
اب میں اس قابل ہوں کہ اکثر مخلص اور غیر مخلص کو چند منٹ میں پہچان لیتا ہوں۔ انسان کی
پرکھ کا فن سیکھنے کا کوئی آسان طریقہ نہیں۔ حکومت کے ایماء پر ہمارے خلاف یہ پروپیگنڈا زور و
شور سے جاری تھا کہ میں صہیونی سازش کا ایک کردار ہوں۔ یہودیوں نے میرے ذریعے
پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ بے شمار لوگ محض اس لیے پارٹی میں شامل
ہونے کو دوڑ پڑے کہ انہیں اس پارٹی میں پیسہ بنانے کے مواقع میسر ہوں گے۔ اس کی وجہ اُن کا
یہ خیال تھا کہ یقیناً یہودی ہمیں کروڑوں ڈالر دے رہے ہوں گے۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ سرد جنگ
کے دنوں میں پاکستان کی بعض سوشلسٹ تنظیموں کو سوویت سفارت خانے سے رقوم ملا کرتیں،
اس غلط فہمی میں بہت سے مضحکہ خیز واقعات ہوئے۔ لوگ ہمارے پاس اس امید پر آتے کہ

انہیں آسانی کے ساتھ پیسہ بنانے کا موقع ملے گا۔ جب الٹا ہم ان سے چندہ مانگ لیتے تو انہیں صدمہ پہنچتا۔ ایک روز جب میں دفتر گیا تو سینکڑوں کاریں وہاں موجود تھیں۔ میں بڑی مشکل سے لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے اپنے دفتر میں داخل ہوا۔ معلوم ہوا، کسی اخبار میں یہ خبر چھپی ہے کہ امریکی صدر بل کلنٹن نے مجھے اپنی حمایت کا یقین دلا دیا ہے۔ اس خبر سے ان ابن الوقتوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ امریکہ نے مجھے پاکستان میں برسراقتدار لانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ملکی میڈیا کے ساتھ میرے تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھے۔ ایک کھلاڑی کی حیثیت سے مجھے کبھی اس بات کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ میں صحافیوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، میری کارکردگی ہی کافی ہوتی۔ مگر سیاست کا معاملہ بالکل مختلف ہے، اس میدان میں میڈیا بنانے اور بگاڑنے کی قوت رکھتا ہے۔ اس چیز کا تجربہ مجھے ہسپتال کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم کے دوران ہوا۔ افراتفری کے عروج میں مجھے ایلن لیمب (Allan Lamb) اور ایان بوتھم (Ian Botham) کے دائر کردہ مقدمے کی خاطر اپنے دفاع کے لیے لندن جانا پڑا۔ اس مقدمے کی بنیاد میری اس رائے کو بنایا گیا جو میں نے 1994ء میں بال ٹمپرنگ کے حوالے سے قائم کر کے بیان کی تھی۔ اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں تھا کہ میں عدالت کا سامنا کروں۔

اس مقدمے کو لڑنے کے لیے میں نے انتہائی منجھے ہوئے وکیل جارج کارمن کیوسی (George Carman QC) کی خدمات حاصل کیں۔ ان کا خیال تھا کہ میرے جیتنے کا امکان نہ ہونے کے برابر یعنی 10 فیصد سے زیادہ نہیں کہ آئن بوتھم برطانیہ کا قومی ہیرو ہے۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ عدالت سے باہر تصفیے کی کوشش کروں۔ ہار جانے کی صورت میں بہت بھاری رقم سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ مقدمے کے آغاز میں، میں بہت ہی پراعتماد تھا۔ اس نامور وکیل کی بات ماننے سے میں نے انکار کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ میں بے گناہ ہوں اور مجھ

سے منسوب کیا جانے والا بیان غلط ہے۔ کارروائی آگے بڑھی تو محسوس ہوا کہ حالات میرے خلاف ہیں۔ اب مجھے فکر ہونے لگی۔ مقدمہ ہارا تو دیوالیہ ہو جاؤں گا۔ خاندان کی کفالت کیسے کروں گا؟ اس سے بڑی ذلت کی بات اور کیا ہوتی کہ ادھار لوں یا بیوی کے پیسوں پر زندہ رہوں۔ یہ میری نوتشکیل پارٹی کے لیے بھی سخت ترین دھچکا ثابت ہوتا جسے قائم ہوئے صرف دو ماہ گزرے تھے۔ مقدمے کی آدھی کارروائی مکمل ہو چکی تھی جب میں نے میاں بشیر کو فون کر کے دعا کی درخواست کی۔ وہ مایوس تھے اور کہا ''جج تمہارے خلاف ہے۔'' بات تھی بھی درست۔ مقدمے کی کارروائی ختم ہونے کو آئی تو میرے وکیل جارج کارمن نے جیوری سے باہر جانے کی درخواست کی۔ جج سے انہوں نے کہا: اپنے 40 سالہ قانونی اور عدالتی تجربے کے دوران پہلی مرتبہ میں یہ شکایت کر رہا ہوں کہ آپ نے مقدمے کی کارروائی کو سمیٹتے ہوئے، میرے مؤکل کے ساتھ تعصب برتا ہے۔ کرکٹ کیریئر کے دوران شدید تناؤ کے بیسیوں مراحل سے گزرنے کے باوجود، وہ چھ گھنٹے مجھ پر سب سے زیادہ بھاری تھے۔ جیوری اپنی رائے مرتب کر رہی تھی۔ اس دوران جارج کارمن شکست کے لیے مجھے ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔ اس نے اپیل تیار کرنے کا کام فوراً ہی شروع کر دیا۔ اسی دوران مجھے اپنے ایک دوست کا پیغام ملا کہ میاں بشیر مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں فون کیا تو وہ بہت خوش تھے، انہوں نے کہا، ''اللہ جیوری کے خیالات بدل رہا ہے۔'' بالآخر اسی جیوری نے 10-2 کی اکثریت سے میرے حق میں فیصلہ دے دیا۔

چند ماہ بعد جب میں وطن واپس پہنچا تو پارٹی کے حوالے سے پیدا ہونے والا جوش و خروش ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب کچھ اور نہیں تو کم از کم سکون کا کچھ عرصہ میسر ہے جس میں ہم خود کو منظم کر سکتے ہیں۔ پارٹی کی تنظیم کے لیے میں نے ملک کے مختلف شہروں کے دورے کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ٹھہراؤ کا یہ عرصہ زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ 5 نومبر 1996ء کو

صدر فاروق لغاری نے بینظیر بھٹو کی حکومت تحلیل کر کے تین ماہ کے اندر الیکشن کا اعلان کر دیا۔

جب میں صدر فاروق لغاری سے ملا تو انہوں نے بتایا: بینظیر بھٹو اور نواز شریف نے ڈیڑھ، ڈیڑھ ارب ڈالر بیرون ملک منتقل کیے ہیں۔ انہوں نے عزم ظاہر کیا کہ ان دونوں کا احتساب ہوگا۔ اس وقت میری پارٹی کی عمر صرف چھ ماہ تھی۔ کرکٹ والے مقدمے کی وجہ سے دو ماہ انگلینڈ میں ضائع ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے انتخابی مہم میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے نزدیک اپنی پارٹی کو ایک قومی جماعت کے طور پر منظم اور متعارف کرانے کا یہ بہترین موقع تھا۔ اس کے علاوہ میرے نزدیک انتخابی مہم کے ذریعے کرپشن کے مسئلے کو عوامی سطح پر اٹھانے کا یہ ایک سنہری پلیٹ فارم ہوتا۔ مجھے احساس تھا کہ جہاں تک ووٹوں کا تعلق ہے، ہم کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ نچلی سطح پر ہمارا تنظیمی ڈھانچہ موجود ہی نہ تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ ہم پورے ملک میں مہم چلائیں گے۔ پھر ایک ہفتہ قبل الیکشن میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر دیں گے۔ ہم نے انتخابی مہم کا آغاز کیا تو ہر کوئی میرے جلوسوں میں ہزاروں افراد کی شرکت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ نوجوان گروہ در گروہ ریلیوں میں آتے۔ ملک کا یہی وہ طبقہ ہے جو پوری شدت کے ساتھ تبدیلی کا خواہش مند ہے۔ جب تحریک انصاف کی ریلیاں ٹی وی پر دکھائی گئیں جو نواز شریف اور بینظیر کے جلوسوں سے یقیناً بڑی تھیں، تو تحریک انصاف کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے خواہش مندوں کا تانتا بندھ گیا۔ امیدواروں کا انتخاب کرنے کے لیے ہم نے ایک بورڈ تشکیل دیا۔

جنون کی حد تک ہم اس عہد پہ کاربند تھے کہ کسی ایسے شخص کو پارٹی ٹکٹ نہ دیا جائے گا جس کے کردار پر کوئی معمولی سا داغ بھی ہو۔ اس لیے بہت سے اچھے امیدواروں سے ہمیں محروم ہونا پڑا۔ جو لوگ ماضی میں بھی سیاسی وابستگیوں کے حامل تھے، ان کے معاملے میں اور بھی زیادہ سختی روا رکھی گئی۔

نواز شریف کو میں نے شدت کے ساتھ نشانہ بنایا۔ یہ دیکھتے ہوئے اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور ایک سے ایک اچھی پیشکش کرنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے مجھے اپنی جماعت میں، اپنے بعد سب سے اہم عہدہ قبول کرنے کی دعوت دی، پھر اس نے پیغام بر کو بھیجا کہ انتخابی اتحاد کی صورت میں میری پارٹی کو قومی اسمبلی کی 20 سیٹیں دے دی جائیں گی۔ اس مرحلے پہ ہر کوئی جانتا تھا کہ نواز شریف جیت جائے گا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ پیپلز پارٹی، جس کی ساکھ بری طرح مجروح تھی اور اس کے سوا کوئی قومی پارٹی اس کے مقابل تھی ہی نہیں۔

ہمارے لیے یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ ایک ایسی پارٹی جسے قائم ہوئے چند مہینے گزرے تھے، ایک طاقتور حریف جان کر ایسی پیشکش سے اس کو رجھانے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن ٹھکرا دینے میں مجھے ذرا سی ہچکچاہٹ نہ ہوئی۔ میرے نزدیک نواز شریف بھی اتنا ہی کرپٹ تھا جتنی کہ بینظیر بھٹو۔ نواز شریف سے اتحاد کرنا اپنے اصولوں کو پامال کرنے کے مترادف تھا۔ میں تو سیاست میں آیا ہی اس لیے تھا کہ ایسے بدعنوان اور بے اصول لیڈروں کے خلاف جدوجہد کروں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں نواز شریف سے اتحاد کر لیتا؟ ہم سب کو اپنی زندگی میں سمجھوتے کرنا پڑتے ہیں لیکن یہ سمجھوتے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہوتے ہیں، اپنے مقصد پر نہیں۔ میں اس اعتبار سے خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ پیشہ ور سیاستدانوں کے برعکس میرا سیاست میں آنے کا مقصد رعایات پانا یا پیسہ بنانا ہرگز نہ تھا۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں کبھی کوئی ابہام نہ تھا۔ اگر میں اپنا پروگرام نافذ نہیں کر سکتا تو پھر سیاست میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے پاس پہلے ہی وہ سب کچھ موجود ہے جس کی میں خواہش کر سکتا۔ میرا خیال تھا کہ اقتدار میں شامل ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں بندھوا لینے سے یہ کہیں بہتر ہوگا کہ اپوزیشن میں رہ کر حکومت کے غلط کاموں کی مزاحمت کی جائے۔ مسلم لیگ کے ساتھ مل جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ میں بھی تبدیلی روکنے والی قوتوں کا حصہ بن چکا ہوں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مجھ پر عوام کا اعتماد خاک میں مل جاتا۔

ملک کے سیاسی منظر نامے میں ایک اور نئی تبدیلی یہ آئی کہ بینظیر نے صدر لغاری کو نشانے پہ رکھ لیا۔ وہ اسے پیپلز پارٹی کا غدار کہنے لگی۔ لغاری پر بینظیر کی تنقید اتنی شدید تھی کہ اس نے صدر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فاروق لغاری کا جھکاؤ نواز شریف کی طرف ہو گیا۔ انہوں نے اپنے عہد کو فراموش کر دیا کہ نواز شریف اور بینظیر کو الیکشن میں اُس وقت تک حصہ لینے کی اجازت نہ ہوگی جب تک کہ وہ کرپشن کے الزامات سے بری نہ ہو جائیں۔ الیکشن سے ایک ماہ قبل یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ صدر لغاری نے انتظامیہ کی غیر جانبداری کے اصول پر سمجھوتا کرتے ہوئے در پردہ نواز شریف سے پیمان کر لیا ہے۔ ملک کی ساری افسر شاہی اب نواز شریف کی اپنی ٹیم کی طرح بیٹنگ کر رہی تھی۔ خاص طور پر پنجاب میں نواز شریف کی پسند کے افسروں کو اہم عہدوں پر مسلط کر دیا گیا۔

اب ظاہر ہے کہ جس پارٹی کو اسٹیبلشمنٹ کی ایسی حمایت حاصل ہو کیونکر وہ شکست سے دوچار کی جا سکتی۔ اسٹیبلشمنٹ کسی پارٹی پہ ہاتھ رکھ دیتی ہے تو تمام اختیارات کی مالک و مختار ضلعی انتظامیہ میدان میں اتر آتی ہے۔ پھر انتخابات پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھنے والی مقامی شخصیات اوپر کے اشاروں پر نظر رکھتیں اور ہر فرمان بجا لاتی ہیں۔ وہ لوگ ہر جیتنے والی پارٹی کا ساتھ دیتے ہیں کہ اس طرح نوکر شاہی میں رسوخ حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی رسوخ کی بدولت وہ اپنی چوہدراہٹ قائم رکھ سکتے اور قریبی لوگوں کو فائدے پہنچا سکتے ہیں۔

اقتدار میں آنے والی پارٹی کا حصہ بننے کے لیے کئی قوتوں میں دھکم پیل شروع ہو گئی۔ ان میں بڑے جاگیردار خاندان، سمگلر اور منشیات کا کاروبار کرنے والے بھی شامل تھے۔ ہر علاقے، ضلع اور تحصیل میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے ہاتھ میں 500 سے لے کر دو تین ہزار تک ووٹ ہوتے ہیں۔ جرائم پیشہ مافیا کو ہر صورت جیتنے والی جماعت کے ساتھ رہنا پڑتا ہے تاکہ انہیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے حکمرانوں کی خاموش سرپرستی حاصل رہے۔

مدتوں سے معاشرے کی حالت ایسی ہو گئی کہ ایک عام آدمی کو بھی خواہ وہ نوکر شاہی کا حصہ ہو، دکاندار، پولیس آفیسر ہو یا ٹیکسی ڈرائیور زندگی میں سہارے تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ میں نے ایک کھلا خط لکھا جس میں صدر فاروق لغاری اور نواز شریف کے درمیان ہونے والی ساز باز کے تمام نکات کا پردہ چاک کر دیا۔ میرے خیال میں اس کے بعد ہمارے لیے بہترین یہی تھا کہ ہم الیکشن سے فوراً الگ ہو جاتے۔ اپنے مقاصد ہم نے حاصل کر لیے تھے۔ حالات سے مجبور صدر فاروق لغاری کی حکومت پر سخت تنقید کرتے ہوئے میں نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے وعدوں پر عمل کریں۔ اب میں نے خود کو ایک تیسرے محاذ پر نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ الیکشن سے ایک ہفتہ قبل میں نے اپنی جماعت کے اہم ارکان کا اجلاس طلب کیا اور انہیں صورتحال سے آگاہ کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم زیادہ سے زیادہ تین نشستیں جیت سکتے ہیں۔ اندیشہ یہ بھی ہے کہ ہم ایک بھی سیٹ نہ لے سکیں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری نوزائیدہ پارٹی ایسی مکمل ناکامی کی متحمل نہیں پھر یہ بھی کہ ناکامی کی صورت میں ہمیں ملنے والا چندہ ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں پارٹی کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟ مزید یہ کہ ہمارے پاس نہ تو وسائل ہیں اور نہ ہمارا تنظیمی ڈھانچہ ہی اس قابل۔ ووٹروں کو پولنگ سٹیشن تک لانے کے لیے ٹرانسپورٹ کا بندوبست کرنا پڑتا ہے، سٹاف کا انتظام اس کے علاوہ۔ مرد اور خواتین پولنگ سٹیشنوں پر الگ الگ ایجنٹ مقرر کرنا ہوتے ہیں۔ رسل و رسائل کے حوالے سے یہ ایک بہت بڑا تنظیمی کام ہوتا ہے۔ ان سب دلائل کے باوجود میری جماعت کے اہم ارکان کی اکثریت الیکشن لڑنے کے حق میں تھی۔ ان میں سے کچھ تو ہماری ریلیوں میں شامل ہونے والے لوگوں کی تعداد کے سبب پُراعتماد تھے اس قدر سرشار کہ بہت سیٹیں حاصل کرنے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ سیاست میں لوگ کس طرح خود فریبی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ حریف کی طاقت کا غلط اندازہ لگاتے اور اپنی قوت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید شاید

اسی لیے آدمی کو "ظلوماً جھولاً" کہتا ہے۔ اپنی صلاحیت اور شخصیت کے امکانات کو حقیقت سے زیادہ اور اپنے فرض کے تقاضوں کو کمتر سمجھنے والا۔

کرکٹ میں برعکس رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ میں ہمیشہ اپنی ٹیم پر زور دیتا کہ وہ مخالف ٹیم کو سر پر سوار نہ کریں اور اس سے دب کر نہ رہیں۔ میں نے پارٹی کے کچھ لوگوں کا موقف سنا کہ اگر وہ الیکشن سے بھاگ گئے تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ آخر میں جس شخص نے مجھے قائل کیا وہ ہماری پارٹی کے انتہائی سینئر رکن اور معتبر وکیل حامد خان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ الیکشن لڑ کر ہم جو تجربہ حاصل کریں گے، اس کا کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کا کہنا تھا کہ انتخابی شکست سے ہم جو سبق سیکھیں گے، وہ تب کام آئے گا جب ہمارا وقت آئے گا۔

الیکشن کے میدان میں اترنے کا فیصلہ کر کے، ہم نے مشکل ترین راستے کا انتخاب کیا۔ یہ سمجھ لیجیے کہ گھوڑوں اور تلواروں کے ساتھ ہم توپوں سے بھڑنے جا رہے تھے۔ کوئی بھی پارٹی خواہ وہ کتنی ہی مقبول کیوں نہ ہو، نچلی سطح تک سیاسی تنظیم کے بغیر الیکشن نہیں جیت سکتی۔ ہمارے مالی وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ دونوں بڑی پارٹیوں سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ ان لوگوں نے اپنے دور اقتدار میں خوب پیسہ جمع کر لیا تھا۔ میڈیا پر کوریج کے حوالے سے بھی مسائل کا سامنا تھا۔ اس وقت ملک میں صرف ایک ٹیلی ویژن چینل تھا اور وہ حکومت کے کنٹرول میں۔ 90 دن کی انتخابی مہم کے لیے ہر پارٹی کو صرف 30 منٹ کا وقت دیا گیا۔ اس مختصر سے وقت میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ہم لوگوں کو متحرک کر کے انہیں پولنگ سٹیشن پر آنے کے لیے آمادہ کر سکتے۔ پریس کے ساتھ معاملات چلانے میں میری ناتجربہ کاری اور اہلیت کا فقدان بھی آڑے آ رہا تھا؛ میں اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا نہیں پا رہا تھا۔ میں جو بیان دیتا، اگلے روز اسے توڑ مروڑ کر چھاپ دیا جاتا۔ بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ اخبارات میں بدعنوان سیاستدانوں کے بعض تنخواہ دار صحافی موجود ہیں۔ مخالف رہنماؤں کے بیانات کو بے معنی بنانے اور مسخ کرنے کی وہ تربیت

رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی سمجھ آئی کہ آزادئ صحافت محض خواب وخیال کی باتیں ہیں۔ کئی مالکان اپنے اخبارات کو ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آزادئ صحافت کی اہمیت محض یہ ہے کہ ان کے مفادات پہ زد نہ پڑے۔ میری ناتجربہ کاری کی ایک اور مثال میرا وہ بیان تھا جو الیکشن سے چند روز قبل پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ جنگ میں شائع ہوا، ''ہم مثبت طور پر پُرامید ہیں لیکن ممکن ہے کہ ہم الیکشن میں ایک بھی سیٹ حاصل نہ کر سکیں۔'' یقیناً کسی سیاسی رہنما کو کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالنی چاہیے، خواہ یہ درست ہو یا غلط۔ آپ کے کارکن حوصلہ ہار دیتے ہیں، سب امکانات اور سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

ہمارے خلاف نون لیگ کی مہم نے ہماری مشکلات اور بھی بڑھا دیں جو انتہائی کامیاب ثابت ہوئی۔ اُن کے تابڑ توڑ حملوں کے مقابل ہم بالکل نہتے کھڑے تھے۔ ان حملوں کا حدف میری نجی زندگی تھی۔ وہ اس حد تک گر گئے کہ انہوں نے سیتا وائٹ (Sita White) کے ساتھ رابطہ کر کے میرے حوالے سے سنسنی خیز انٹرویو چھپوانا شروع کر دیے۔ کہیں زیادہ گمراہ کرنے والا پروپیگنڈا وہ تھا، جس کا ابھی میں نے ذکر کیا تھا۔ صیہونیوں کی حمایت سے پاکستان پر قبضہ کرنے کا منصوبہ۔ اس حد تک وہ چلے گئے کہ انہوں نے ایک اخبار میں چار کروڑ پاؤنڈ کے ایک جعلی اور جھوٹے چیک کی نقل چھپوا دی۔ لکھا تھا: یہ وہ چیک ہے جو جمائما کے والد نے انتخابی مہم چلانے کے لیے عمران خان کو دیا ہے۔ پھر سیاسی اور مذہبی لیڈروں کی جانب سے ایسے بیانات شائع ہونے لگے کہ ہم یہودیوں کو پاکستان پر غلبہ پانے کی اجازت نہ دیں گے۔ قرآن کریم کے مشہور مفسر ڈاکٹر اسرار احمد ان میں شامل تھے۔ معلوم نہیں کس نے انہیں قائل اور آمادہ کیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ مالی معاملات میں بعض دوسرے مولوی صاحبان جیسے ہرگز نہ تھے۔ ایک خطاب میں بہرحال انہوں نے یہ کہا: معلوم نہیں عمران خان کی ڈور کون ہلا رہا ہے؟ اس پر

میرے اخبار نویس دوست ہارون الرشید نے لکھا: ڈاکٹر صاحب! یہ تو فرمائیے کہ آپ کی ڈور کس نے ہلائی ہے؟ مگر جس اخبار میں اس کا کالم چھپا، وہی تو میرے خلاف شور شرابے میں پیش پیش تھا۔

جس اخبار نے اس چیک کی تصویر چھاپی تھی، بعدازاں اس نے اندر کے صفحات پر چند سطروں میں تردید چھاپ دی جس میں اعتراف تھا کہ مذکورہ چیک جعلی تھا لیکن نقصان تو ہو چکا تھا اور پہلے سے مشکلات میں گھرے ہمارے میڈیا آفس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ لوگوں کے تاثر کو بدل سکے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: 'سیاست میں تاثر کی اہمیت، سچائی سے زیادہ ہوتی ہے۔'

تمام تر کمزوریوں کے باوصف ہماری واحد امید یہ تھی کہ رائے دہندگان کی غیر معمولی اکثریت گھروں سے نکل آئے گی۔ بدقسمتی سے الیکشن کے روز پولنگ سٹیشن ویران پڑے تھے۔ خاص طور پر شہروں میں۔ ظاہر ہے، پاکستانیوں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ ووٹ ڈالنے سے ان کی زندگیوں میں تبدیلی کا ہرگز کوئی امکان نہیں۔ یہ بات واضح تھی کہ نواز شریف جیت جائے گا اور پیپلز پارٹی کا حال پتلا رہے گا۔ مگر نون لیگ کی کامیابی کے تناسب نے تمام اندازے غلط ثابت کر دیے۔ نواز شریف دو تہائی اکثریت لے گیا۔ ڈالے گئے ووٹوں کے تناسب پر شکوک کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ صدر نے اسی شام اخبار نویسوں کو بتایا: 25 فیصد ووٹ پڑے ہیں۔ بی بی سی کا کہنا تھا کہ 18 فیصد سے بھی کم۔ اگلی صبح قوم کو یہ خبر سنائی گئی کہ 38 فیصد نے رائے دہی کا حق استعمال کیا۔

1999ء میں نواز شریف حکومت کا بستر گول کر دیا گیا تو الیکشن کمیشن کے ایک سینئر رکن نے مجھے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ الیکشن میں دھاندلی کیسے ہوئی۔ اس کام کے لیے مخصوص انتخابی حلقوں کا انتخاب ہوا۔

ان حلقوں میں جن پولنگ سٹیشنوں پر دھاندلی آسان تھی انہیں ''ریڈ پولنگ بوتھس'' کا

خفیہ نام دیا گیا۔ الیکشن ماہ رمضان میں تھے؛ لہٰذا جیسے ہی پولنگ کا وقت ختم ہوا بوتھوں میں موجود پولنگ ایجنٹوں کو افطاری کے بہانے تھوڑا دور لے جایا گیا۔ کسی نے ٹھہر جانے پر اصرار کیا تو نگرانی پر مامور فوجیوں نے اسے چلے جانے کا حکم دیا۔ 40 منٹ سے لے کر ایک گھنٹے تک انہیں واپس نہ آنے دیا گیا۔ عملے نے بیلٹ باکس نون لیگ کے نامزد امیدوار کے ووٹوں سے بھر دیے۔ اپنی کارستانی چھپانے کے لیے بڑی چالاکی کے ساتھ انہوں نے دوسرے نمبر پر آنے والے امیدوار کے ووٹوں کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا۔ جیتنے والے اور باقی امیدواروں میں اب غیر معمولی فرق نہ تھا۔ بینظیر بھٹو کا سب سے بڑا ناقد ہونے کے باوجود، اس بیچاری کے ساتھ جو سلوک ہوا، مجھے اس پر افسوس تھا۔ نگران حکومت اپنی تمام تر قوت کے ساتھ نواز شریف کے ساتھ تھی۔ بینظیر کے جیتنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اندازوں کے عین مطابق وہ بدترین شکست سے دوچار ہو گئی۔ جہاں تک تحریک انصاف کا تعلق ہے تو اسے ایک سیٹ بھی نہ ملی۔ صفایا ہو گیا، مکمل صفایا۔

بہت مدت گزر گئی تھی، 2008ء کا الیکشن بیت جانے کے بعد الیکشن کمیشن کو معلوم ہوا کہ 8 کروڑ رجسٹرڈ ووٹروں میں سے 3 کروڑ 70 لاکھ جعلی ہیں۔ یہ سب دوہرے اندراج، دوسے زائد اندراج یا پھر جعلی اندراج کے ذریعے تخلیق کیے گئے۔ جون 2011ء میں میری طرف سے دائر کی گئی درخواست پر سپریم کورٹ نے جعلی ووٹ مسترد کر کے ساڑھے تین کروڑ نوجوانوں کے نئے ووٹ رجسٹر کرنے کا حکم دیا۔

میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ 21 برسوں پر محیط اپنے کرکٹ میں رزم آرائیوں کے دوران مجھے بدترین ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی بنا پر میرے اندر ناکامی کے سامنے خود کو مجتمع رکھنے کا ایک دفاعی نظام تشکیل پا گیا۔ اس طرح میں خود کو اپنے پاؤں پر کھڑا رکھنے اور شکست کے بدترین اثرات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوا۔ اس حوالے سے میری سب

سے زیادہ تکلیف دہ یادوں میں سے ایک، 80-1979ء کے دورۂ بھارت میں پاکستانی ٹیم کی تباہ کن ناکامی ہے۔ حالت یہ تھی کہ ہمیں چوری چھپے رات کی تاریکی میں پاکستان آنا پڑا۔ خوف تھا کہ غصے میں بھرے عوام بے عزتی کریں گے۔ کسٹم کے عملے نے ہم سے ہر وہ چیز لے کر ضبط کر لی جو انہیں ملی۔ انہوں نے ہماری جیبوں تک کی تلاشی لی اور ہمیں دو گھنٹے تک ہوائی اڈے پر روکے رکھا۔ لوگوں کے غیض وغضب سے بچنے کے لیے جس کا ہمیں سو فیصد یقین تھا، ہم کئی دن تک گھروں سے باہر نہ نکلے۔ سات برس بعد بھارت کو شکست دے کر ہم اسی لاہور ایرپورٹ پر اترے تو ہمیں کسٹم کی جانچ کے مراحل سے گزارا ہی نہ گیا۔ ہوائی اڈے کا عملہ ہمیں کندھوں پر اٹھا کر باہر لایا، جہاں ہزاروں لوگ ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ایرپورٹ سے شہر کے مرکز تک، پانچ کلومیٹر طویل راستے کے دونوں طرف لوگوں کے ہجوم ہمارے لیے نعرہ زن تھے۔ دوسری مرتبہ خوشی اور جشن کا ایسا سماں تب دیکھنے کو ملا جب ہم 1992ء کا عالمی کپ جیت کر لاہور آئے۔ کرکٹ سے وابستگی کے اختتام تک مجھے فتح اور شکست کی تمام جہات کے بارے میں کافی آگہی حاصل ہو چکی تھی۔ میں نے یہ سیکھا کہ جیت کر آپے سے باہر نہ ہونا چاہیے۔ امتحان اور آزمائش آ پڑے تو قوت برداشت کو بروئے کار لانا اور صبر کرنا چاہیے۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ آپ عوامی غیظ وغضب کا نشانہ ہوتے ہیں، حتیٰ کہ بعض اوقات تو آپ کے قریبی دوست بھی آپ سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

ناکامی کے حوالے سے سمجھنے کی سب سے پہلی بات یہ ہے کہ عذر ڈھونڈنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ نہ ہی کوئی آپ کے دلائل سننے پر آمادہ ہوگا۔ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ ناکامی یتیم کی طرح ہوتی ہے اور آپ بالکل تنہا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ پورے وقار کے ساتھ شکست قبول کریں اور جیتنے والے کو مبارکباد دیں۔ اس کے بعد آپ کو تجزیہ کرنے کی صلاحیت بروئے کار لانی چاہیے، طے کریں کہ آپ سے کون کون سی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ کامیاب لوگوں کی

سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ خود ہی اپنے بہترین نقاد ہوتے ہیں۔ جب میں اس بات کا موازنہ کرتا ہوں کہ میں خود سے زیادہ باصلاحیت کھلاڑیوں کی نسبت کہیں زیادہ کامیاب کیونکر ہوا تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ نے جو بڑا ہی مہربان ہے مجھے اپنی خامیوں کا درست اندازہ لگانے کی کچھ نہ کچھ صلاحیت عطا کر رکھی ہے۔

بائیں پنڈلی پر چوٹ کے باوجود، دو برس کی غیر حاضری کے بعد اکتوبر 1984ء میں جب میں نے دوبارہ باؤلنگ شروع کی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے باؤلنگ ایکشن میں ایک بڑی خامی پیدا ہو چکی ہے۔ تین ماہ تک میں نے ہر حربہ آزما کر اس خامی کو دور کرنے کی کوشش کی مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میرے ذہنی ارتکاز کا یہ عالم تھا کہ ایک رات میں نے خواب میں خود کو باؤلنگ کرتے دیکھا۔ نیند کے دوران مجھے معلوم ہو گیا کہ خامی کیسے دور ہوگی۔ فوراً میں نے اپنا ایکشن درست کر لیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ کرکٹ کے کتنے ہی کھلاڑی، غلط تجزیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ان کا کردار ختم ہو گیا۔ حیات کی کشمکش میں آدمی کے لیے سب سے بڑا خطرہ مایوسی سے جنم لیتا ہے۔ ناکامی حوصلے توڑ دیتی ہے۔ ایسی نفسیاتی حالت میں انسان غلط تجزیہ کرتا ہے، جو مزید ناکامیوں کی بنیاد بن جاتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ظہیر عباس سے زیادہ یکسو بلے باز آج تک نہ دیکھا، وہ جسے انگریزی میں Timing کا فہم و ادراک کہتے ہیں، میرے اس دوست کو اس فن میں صاحب کمال سمجھا جاتا تھا۔ اس میں یہ صلاحیت قدرتی طور پر موجود تھی۔ 1978ء میں اس نے پاکستان کا دورہ کرنے والی بھارتی ٹیم کا باؤلنگ اٹیک تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ محض ایک برس بعد جب ہم بھارت کے دورے پر گئے تو شائقین نے اس سے بے پناہ امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ان امیدوں کے بوجھ تلے وہ دبا جا رہا ہے۔ ناکامی کے خوف کا تدارک کر کے اپنے کھیل کو بہتر انداز میں آگے بڑھانے کی بجائے، اس نے دوسری سمت دیکھنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو

اس نے اپنی بلّے بازی کی تکنیک کے ساتھ غیر ضروری چھیڑ چھاڑ کی۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ اسی تکنیک کی بدولت ایک برس پہلے وہ ریکارڈ بنانے میں کامیاب رہا تھا۔ کچھ روز بعد وہ اپنی آنکھوں کا معائنہ کرا رہا تھا کہ شاید کوئی خرابی پیدا ہو چکی ہو مزید دو ہفتے گزرنے پر اس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ اس کے خیال میں کسی نے اس پر کالا جادو کر دیا تھا۔ آخر کار اس عظیم بلّے باز کو ٹیم سے الگ ہونا پڑا۔ سالہا سال کے مشاہدے سے میں نے سیکھا ہے: بہت سے لوگ محض اس لیے نامرادی کی بھینٹ چڑھتے ہیں کہ اپنی ناکامی کا درست تجزیہ کرنے کی صلاحیت سے وہ محروم ہوتے ہیں۔

الیکشن میں نامرادی کے بعد مجھے تنہائی درکار تھی تا کہ میں خوب سوچ سمجھ کر تجزیہ کر سکوں۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اخبارات پڑھنے کا ہرگز کوئی فائدہ نہیں۔ ایسے نقادوں کے کالم پڑھ کر خود کو اذیت دینے سے کیا حاصل جو کبھی بے تعصب نہیں ہوتے۔ جو دشمنی پر ادھار کھائے بیٹھے ہوں۔ جو کینہ اور عناد کی بنیاد پر تجزیے کرتے ہوں۔ میں نے لوگوں سے میل ملاپ بھی ختم کر دیا کیونکہ آپ جتنے زیادہ لوگوں سے ملتے ہیں، اسی قدر زیادہ مشورے وہ آپ کو دیتے ہیں۔ لوگوں کے پاس مفت مشوروں کی کبھی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اس کا نتیجہ طبیعت میں تلخی گھلنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کسی بھی ناکامی کے بعد میدان میں واپس آنے کے لیے جب مجھے غلطیوں کا تجزیہ کر کے حکمت عملی ترتیب دینا ہوتی ہے تو میں ہمیشہ تنہائی اختیار کر لیتا ہوں۔ اب کچھ وقت نکال کر اپنے خاندان کے ساتھ پوٹھوہار میں زیر زمین نمک کے خزانوں سے متصل پہاڑوں کی طرف چلا گیا، جسے سالٹ رینج کہا جاتا ہے۔ یہاں کتنے ہی برس، میں نے اس سطح مرتفع میں شکار کھیلتے ہوئے گزارے تھے۔ بعض اعتبار سے یہ پاکستان کے بہترین علاقوں میں سے ایک ہے۔ یہیں کلر کہار میں وہ جھیل ہے، جہاں قدرتی نظاروں پر فریفتہ ہو جانے والے مغل سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر نے پڑاؤ کیا تھا۔ اس مقام کو تخت بابری کہا جاتا ہے۔ بلندیوں پہ چشمے

ابلتے ہیں ان میں سے کچھ جھیل میں اتر جاتے ہیں۔ کچھ دوسرے جھرنے سامنے سڑک کے اس پار گلاب کے باغوں کو سیراب کرتے ہیں۔ یہاں صدیوں سے برصغیر کا بہترین عرق گلاب ملتا ہے۔ بائیں ہاتھ ایک قدرے ہموار پہاڑی پر، صدیوں سے ایک مزار کی عمارت سر اٹھائے کھڑی ہے۔ اردگرد نظر نواز درختوں کے جھنڈ ہیں، جن میں مور ناچتے ہیں میں نے وہاں تمام تفکرات سے دور سکون اور مسرت سے بھرپور چند ایام گزارے۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران شاید ہی مجھے جمائما اور سلیمان سے، آسودگی کے ساتھ ملاقات کا موقع ملا تھا۔ اپنے پہلے بچے کے ساتھ وقت گزارنے سے جو خوشی حاصل ہوئی، ناکامی کی تمام کلفت اس نے کافور کر دی۔

اس ہار کو تسلیم کرنا میرے لیے بہت آسان رہا۔ پہلے سے ذہنی طور پر میں تیار تھا۔ الیکشن لڑنے کے قابل ہم بالکل نہ تھے اور نہ ہمارے پاس کوئی ٹیم تھی جس کی مدد سے ہم حکومت قائم کر کے اپنا پروگرام نافذ کر سکتے۔ میں نے سوچا کہ اس الیکشن نے کم از کم یہ موقع تو ہمیں فراہم کیا کہ ہم کرپشن اور احتساب ایسے معاملات کو اجاگر کرنے میں کامیاب رہے۔ مزید یہ کہ انتخابی مہم نے قومی سطح پر ہمیں اپنی پارٹی کی تنظیم کا موقع فراہم کر دیا۔ دوسری طرف شکست کے نتیجے میں نو تشکیل شدہ پارٹی پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ جمائما، میری بہنوں اور قریبی دوستوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ سوچتے کہ لوگوں کی جلی کٹی باتوں اور اخباری کالموں میں چھپنے والے طنز کا سامنا کیسے کیا جائے؟ بے چاری جمائما پہلے ہی یہودی سازش والے قصے کو برداشت کیے بیٹھی تھی، اب آئے دن ایسے مضامین پڑھا کرتی جن میں اس کے رفیق حیات پر تنقید کی جاتی، گاہے اس کی تضحیک بھی کی جاتی، اس کا تمسخر اڑایا جاتا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ میڈیا نے مجھے بھون کر رکھ دیا۔ دائیں اور بائیں بازو والے سبھی میرے درپے تھے۔ بے ایمان سیاستدانوں نے الگ مجھ پر یلغار کر رکھی تھی۔ وہ خاص طور پر میری جان کے دشمن تھے۔ میں اس بات کا حامی تھا کہ جن لوگوں کی کرپشن ایک خاص حد سے متجاوز ہو، انہیں موت کی سزا ملنی چاہیے۔ وہ کیونکر مجھے معاف کرتے۔

1983ء کے بعد جب میری ٹانگ ٹوٹی اور ایک برس تک مجھے گھر بیٹھنا پڑا، میں نے کرکٹ کے میدان اور ہسپتال کے قیام کی صورت بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ الیکشن میں میری تباہ کن شکست نے حاسدین کو بدلہ لینے کا موقع دیا۔ حسد کا مکروہ جذبہ ازل سے آدمی کے ساتھ ہے۔ ایک جلنے اور جلانے والی جبلت انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ لوگ کامیاب شخصیات کا زوال چاہتے ہیں۔ بدترین شکست سے ہم دوچار ہوئے تھے، ہمارا صفایا ہو گیا تھا۔ یہ محض ایک ہار نہ تھی بلکہ ہم بکھر گئے تھے۔ مجھ پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ہم جمود کے حامی سیاستدانوں کو اُن کے اپنے میدان میں شکست نہیں دے سکتے۔ صرف ایک صورت میں ہم کامیاب ہو سکتے ہیں، جب ذوالفقار علی بھٹو کی 1970ء ایسی تحریک پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں جس میں لوگ امیدوار کی بجائے پارٹی کو ووٹ دیتے ہیں۔

الیکشن کے چند ہفتے بعد اظہار ہمدردی کے لیے میاں بشیر ہمارے گھر آئے۔ جمائما نے ان سے کہا: ''میں چاہتی ہوں کہ عمران سیاست میں حصہ نہ لے۔'' اس نے انہیں بتایا کہ کرکٹ اور کینسر ہسپتال کی بدولت پاکستان میں میری کس قدر عزت تھی لیکن اب میں تمسخر کا نشانہ ہوں۔ مجھ پر لطیفہ گوئی ہوتی ہے اور ہماری نجی زندگی کے حوالے سے گڑے مردے اکھاڑے جاتے ہیں۔ اُس نے کہا: ''میری دلی خواہش ہے کہ عمران صرف سماج سدھار کے کام کرے اور ہر قسم کے تنازعات سے دور رہے۔'' وہ جمائما کی باتیں سن کر مسکراتے رہے اور بولے: ''زندگی کا مقصد حصولِ شہرت نہیں ہوتا۔ اپنی ذات کی تشہیر کو جو لوگ زندگی کا مقصد بناتے ہیں، آئے دن ان کی آراء بدلتی رہتی ہیں۔ وہ مضبوط کردار کے حامل کبھی نہیں ہوتے۔'' جمائما کو انہوں نے اس باعزت اور کامیاب تاجر کی کہانی سنائی جو صبر و شکر کے ساتھ خوش و خرم جی رہے تھے۔ جب وہ چالیس برس کی عمر کو پہنچے تو اللہ کی وحدانیت کا اعلان کیا۔ جب انہوں نے اپنا پیغام پھیلانے کی کوشش کی تو شہر کے لوگ اُن کے دشمن ہو گئے۔ یہ پیغام اُن کے آبائی عقائد کے خلاف تھا۔ وہ

پتھر سے بنائے گئے خداؤں کو پوجتے تھے اس کے علاوہ ہر سال بہت سے لوگ بتوں کی پوجا کرنے وہاں اکٹھے ہوتے جس سے مقامی تاجروں کا مال خوب بکتا۔ ان کے اس معاشی مفاد کو اس نئے پیغام سے خطرات لاحق تھے۔

جب وہ اپنی بات سے پیچھے نہ ہٹے تو ہر انداز سے انہیں برا بھلا کہا گیا، ان کا تمسخر اڑایا گیا۔ وہ بے انتہا باعزت اور بہت حساس تھے اس لیے لوگوں کے رویے پر دلبرداشتہ ہوئے۔ ایک روز ان کے ایک چچا نے انہیں اتنا برا بھلا کہا اور اس قدر تمسخر اڑایا کہ وہ گھر آ کر اپنی اہلیہ کے سامنے رو دیے جو ظاہر ہے کہ انہیں خوب جانتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ صادق اور امین ہیں۔ ان پر وہ مکمل ایمان رکھتی تھیں لہٰذا وہ ان کے ساتھ کھڑی ہو گئیں اور ان سے کہا کہ وہ اپنی دعوت کو جاری رکھیں۔ یہ شخصیت حضرت محمد ﷺ کی تھی جو بالآخر انسانی تاریخ کی عظیم ترین تہذیب کے بانی قرار پائے، آدمی کے سب سے بڑے نجات دہندہ۔ اللہ نے انہیں رحمۃ اللعالمینؐ کہا، چمکتا ہوا سورج قرار دیا۔ فرمان صادر ہوا کہ ہم نے آپ کا ذکر ہمیشہ کے لیے بلند کر دیا ہے۔ اللہ کی کتاب میں لکھا گیا کہ آسمانوں پر فرشتے اور ان کا پروردگار بھی اس ہستیؐ پر درود بھیجتے ہیں، پھر یہ درود ابدالآباد کے لیے لازم قرار پایا۔ دنیا کا کوئی خطہ، زندگی کی کوئی ساعت ایسی نہیں، جب ان پر درود نہ پڑھا جاتا ہو، جب زمین ان کے ذکر سے آباد نہ رہتی ہو۔

میاں بشیر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا'' یہ تکالیف وقتی ہیں۔ اگر صاف ستھرے لوگ سیاست میں نہ آئیں گے تو بددیانت ملک کو لوٹتے رہیں گے۔ پھر یہ ملک اس قابل نہ رہے گا کہ بھلے آدمی یہاں آباد رہ سکیں۔'' جمائما کو ان باتوں سے کچھ تسلی تو ہوئی۔ وہ اس بات پہ مگر مصر تھی کہ میں اپنی مصروفیات کو دوسرے انداز سے ترتیب دوں تاکہ خاندان کو بھی مناسب وقت مل سکے۔ اس کی بات میں نے مان لی۔ اپنی مصروفیات کو زیادہ سختی کے ساتھ منظم کیا تاکہ میں اہلِ خانہ کے ساتھ چند گھنٹے روزانہ بتا سکوں۔ حقیقت مگر یہ تھی کہ میری مشکلات کا ابھی آغاز ہوا تھا۔

پارٹی شدید مالی مشکلات کا شکار تھی۔ بہت بڑی رقم الیکشن کے ہنگامے پر رائیگاں رہی تھی۔ ہم مقروض تھے اور یہ قرض بہرحال ادا کیا جانا تھا۔ ایک ایسی پارٹی کو کون چندہ دیتا جو بدترین تباہی کا شکار تھی۔ جب میں ٹیم کا کپتان تھا تو شکست کی صورت میں، میں چندروز ٹیم کے اجلاسوں میں شریک نہ ہوا کرتا۔ فائدے کی بجائے الٹا اس طرح نقصان ہوتا۔ ایسے اجلاسوں میں ہمیشہ ایک دوسرے پر الزام تراشی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ٹیم انتشار اور مایوسی کا شکار ہو جاتی۔ سیاست اور کرکٹ میں فرق ہے۔ ٹیم کے پاس موقع ضرور ہوتا ہے کہ ازسرِ نو خود کو منظم کر کے اگلے میچ کے لیے تیار ہو جائے۔ پارٹی کو آئندہ الیکشن کے لیے پانچ سال انتظار کرنا تھا۔ اس اثنا میں سفاک اور بے رحم شریف برادران کا مقابلہ کون کرے گا؟ نواز شریف کا بھائی شہباز بھی تو ایک پرجوش سیاستدان ہے۔ یہ دونوں اپنے مخالفین کے خلاف اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے میں بلا کی مہارت رکھتے ہیں۔ ہاری ہوئی کرکٹ ٹیم کی طرح میری پارٹی کے لوگ بھی قربانی کے بکروں کی تلاش میں تھے۔ جو لوگ الیکشن میں حصہ نہ لینے کے حق میں تھے، انہوں نے شرکت کے حامیوں کو سولی پر چڑھا رکھا تھا۔ جو باقی تھے وہ میری قیادت پر اعتماد کھو چکے تھے۔ کبھی لوگوں کو یقین تھا کہ میں جس بھی میدان میں اتروں، کامیاب رہتا ہوں۔ اس ہار نے ان کا اعتماد متزلزل کر دیا۔ لوگ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ جب میں کرکٹ میں آیا تھا تب بھی اوّل اوّل مجھے کامیابی نہ ملی تھی۔ اپنے پہلے ہی ٹیسٹ میچ کے بعد مجھے ٹیم سے نکال دیا گیا۔ اسی ٹیم میں جگہ بنانے کے لیے مجھے پورے پانچ سال لگے تھے۔ کرکٹ کے پہلے دورے کے بعد بہت سے اخبارات مجھے عمران خانٹ (Imran Khan't) لکھا کرتے تھے یعنی (Imran Can't) وہ عمران جو کچھ نہیں کرسکتا۔ ہسپتال کا منصوبہ بھی آغاز میں ہچکیاں لیتا رہا۔ ہمارے دانش ور، مفکرین اور لیڈران کرام ابتدا میں سمجھتے تھے کہ یہ ادارہ کبھی نہ بن پائے گا، بن کر رہا۔ انہیں یقین تھا کہ اسے چلانا ممکن نہ ہو گا، کیسا چلا؟

پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے ارکان میں جو اختلافات اندر ہی اندر پنپ رہے تھے، اب کھل کر سامنے آئے۔ بعض سینئر لیڈر مایوسی کی شدید کیفیت سے دوچار تھے۔ کچھ نے پارٹی چھوڑ دی۔ وہ لوگ جو محض اس لیے میرے ساتھ آملے تھے کہ اقتدار میں آنے کا شاید یہ آسان ترین ذریعہ ہے۔ کچھ ایسے بھی تھے آئندہ الیکشن تک جنہوں نے میرے ساتھ رفاقت کو وقت ضائع کرنے کے مترادف جانا۔ پھر ایسے بھی تھے جو سیاسی انتقام کا نشانہ بننے سے گھبراتے تھے۔ ہماری سیاست میں یہ بہرحال معمول کی ایک بات ہے کہ جیتنے والا اپنے مخالفین کو نشانہ بنانے کے لیے پولیس اور دوسرے سرکاری افسروں کو استعمال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اچانک انکم ٹیکس افسر آپ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بدمعاش گھر آ کر آپ کی ٹھکائی کر دیتے ہیں۔ 30 اکتوبر 2011ء کے تاریخ ساز جلسے کے بعد لاہور میں تحریک انصاف کے رہنما محمود الرشید کے خاندان کو ایک بے ہودہ مقدمے کا سامنا کرنا پڑا۔ دو ہفتے بعد ہمارے لاہور دفتر پر تالا لگا دیا گیا اور یہ تو بارہا ہوا کہ رکنیت سازی کی مہم کے ہنگام میں ہمارے پرچم، بینر اور پوسٹر رات کی تاریکی میں نوچ ڈالے گئے۔

میرا ایک کزن اسد جہانگیر اوکسفرڈ سے تعلیم پانے کے بعد 1969ء میں پولیس میں بھرتی ہوا۔ اس نے مجھے 1977ء میں منعقد ہونے والے الیکشن کے بعد پیش آنے والے واقعے سے متعلق بتایا۔ وہ سندھ میں تعینات تھا اور مثالیت پسندی کا اس پر غلبہ تھا۔ ایک مقامی زمیندار حال ہی میں رکن اسمبلی منتخب ہوا تھا۔ ملاقات کے لیے وہ اس کے دفتر میں آیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد اس نے حیران و پریشان اسد سے بڑی نرمی کے ساتھ درخواست کی کہ چند سپاہی وہ اس کے سیاسی مخالف کے گھر بھیجے تا کہ وہ اس کی پٹائی کریں۔ جاگیردارانہ کلچر میں جیتنے والا اس چیز کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے کہ وہ ہارنے والے کی مزید توہین کرے۔ عدلیہ بھی حزب اختلاف کو تحفظ فراہم نہیں کرتی۔ ہمیشہ وہ انتظامیہ کے تابع رہ کر کام کرتی ہے۔ قانون کی

حکمرانی کے اس مکمل فقدان نے بے چارگی کا ماحول پیدا کیا بلکہ غلامی کا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک امیدوار پرلے درجے کا بددیانت ہے، بہت لوگ انتقامی کارروائی کے خوف سے اس شخص کو ووٹ دے ڈالتے ہیں۔ انہیں اس کی سرپرستی درکار ہوتی ہے۔ بے زمین کسانوں کا تو کوئی پرسان حال ہی نہیں، اس معاملے میں وہ سب سے زیادہ کمزور ہیں۔ اگر وہ زمیندار یا اس کے پسندیدہ امیدوار کو ووٹ نہ دیں تو اندیشہ رہے گا کہ مار پیٹ کر انہیں گاؤں سے باہر نکال دیا جائے گا، خدا کی بستی میں بے یارومددگار بھٹکنے اور نیلے آسمان تلے بھیک کا ہاتھ پھیلانے کے لیے۔

ناکامی نے صرف پارٹی کے لیے ہی عطیات کا حصول مشکل نہ بنایا، بلکہ کینسر ہسپتال بھی اس سے متاثر ہوا۔ بڑی تعداد میں مریضوں کا مفت علاج ہوتا ہے چنانچہ خسارہ بڑھنے لگا۔ ان دنوں ادارہ صرف 30 فیصد آمدن اپنے ذرائع سے پیدا کرتا تھا، باقی تمام اخراجات چندے سے پورے ہوا کرتے۔ الیکشن کے ہنگام میں سیاسی مخالفین نے میری ذاتی زندگی کو تو نشانہ بنایا ہی تھا، یہ الزامات بھی لگائے کہ کینسر ہسپتال میں غریبوں کو مفت علاج کی سہولت میسر نہیں اور یہ کہ میں نے ہسپتال کو ملنے والے عطیات اپنی انتخابی مہم پر اڑا دیے۔ اس بات سے یقیناً ہسپتال کو چندہ دینے والے کچھ لوگ شک کا شکار ہوئے اور ترسیل رک گئی۔ بورڈ کے دو اہم ارکان رزاق داؤد اور ڈاکٹر پرویز حسن نے مجھ سے کہا کہ میں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لوں۔ ان کے مطابق خدشہ یہ تھا کہ ہسپتال ناکام اور برباد ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ اس کرپٹ سیاسی کلچر میں میری کامیابی کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔

ساری زندگی مجھے عملیت پسندی کا درس دیا جاتا رہا۔ اپنے کرکٹ کیریئر میں اور بعدازاں ہسپتال کی تعمیر کے دوران بھی ہمیشہ مجھ سے یہی ایک تقاضا تھا۔ میں مگر ہمیشہ سے ایک خواب پرست ہی رہا۔ میرے نزدیک آج پاکستان میں ایک خاص حد سے زیادہ عملیت پسند ہونے کا

مطلب کرپٹ اور جابرانہ جمود قبول کر لینا ہے۔ جب بھی میری زندگی میں ایسے مراحل آتے ہیں اور مایوسی انتہا کو چھونے لگتی ہے تو میں پیچھے مڑ کر اپنے کرکٹ کیریئر اور ہسپتال کے لیے جدوجہد کے یہ مواقع یاد کیا کرتا ہوں اور اپنے مالک کو جو مہربان ہے اور نہایت رحم کرنے والا، اس سے امید رکھنے والا کبھی نامراد نہ ہو گا۔ جو اس سے ناامید ہے، اس کی کوئی امید بر نہ آئے گی۔ ہر چند کہ چاندنی کی طرح اس کی رحمت کے بعض پہلو سبھی پر برستے ہیں۔ کھیتوں اور کھلیانوں میں، پہاڑوں اور بستیوں پر، دریاؤں اور ریگ زاروں پر، گھروں، ان کے دامنوں اور چھتوں پر لیکن اگر کوئی خود کو تنگ و تاریک کمرے میں بند کر کے کنڈی چڑھا لے تو چمکتا ہوا چاند اسے کیونکر دکھائی دے گا؟

1997ء میری خواب پرستی کے امتحان کا سال تھا۔ میرے لیے وہ انتہائی مشکل ثابت ہوا۔ سیاسی مشکلات اور ہسپتال کے لیے رقوم کی قلت ایک طرف تو ذاتی طور پر شدید مالی بحران کا سامنا الگ۔ بوتھم اور لیمب کے دائر کردہ انگلینڈ میں مقدمے نے مالی اعتبار سے مجھے نچوڑ کر رکھ دیا۔ میرے حق میں فیصلے کے خلاف وہ اپیل میں چلے گئے اس لیے مقدمے پر اٹھنے والے اخراجات بھی واپس نہ مل سکے۔ الیکشن پہ ایک خطیر رقم صرف ہوئی تھی۔ اپیل کے خلاف مقدمے کی پیروی کرنا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ جمائما کے والد جمی گولڈ سمتھ کینسر کے عارضے میں مبتلا ہو کر بستر مرگ پر تھے چنانچہ وہ شدید ذہنی کرب سے گزر رہی تھی۔ جولائی 1997ء میں اپنے خاندان اور دوستوں کو سوگوار چھوڑ کر وہ دنیا سے چلے گئے۔ چند ہفتے بعد شہزادی ڈیانا بھی رخصت ہو گئی۔ غم کے اس سال میں اس نے کینسر ہسپتال کا دورہ کیا تھا۔ ہمیں فنڈز ملے اور موقع مل گیا کہ مزید رقوم کے لیے لوگوں کو منظم کر سکیں شاید کہ معاملات قدرے سنبھل جائیں۔ شہزادی ڈیانا نے اس برس کے آخر میں عطیات جمع کرنے کے لیے سعودی عرب جانے کا وعدہ کیا تھا۔ 1985ء میں اپنی ماں کی وفات کے بعد اس برس کے بدترین بارہ مہینوں کا اختتام شہزادی ڈیانا کی موت پر

ہوا۔ جب میں پیچھے مڑ کر اس زمانے کو دیکھتا ہوں تو ایک بات مجھے مسرت سے سرشار کرتی ہے، اپنے بیٹے سلیمان کو پھلتے بڑھتے ہوئے دیکھنا۔ میری زندگی میں بچوں سے بڑھ کر کوئی مسرت نہیں۔ اگر مجھے اس بات کا علم ہوتا کہ بچے انسان کے لیے ایسی شادمانی لے کر آتے ہیں تو میں نوجوانی میں ہی شادی کرتا۔

اللہ پر ایمان اور اپنے خاندان کے علاوہ جس چیز نے اس دوران میری مدد کی وہ کھیل کے دوران حاصل ہونے والے تجربات تھے۔ یہ ادراک کہ زندگی میں مختصر اور آسان راستوں کا ہرگز کوئی وجود نہیں۔ کچھ بھی آپ حاصل کرنے کے آرزومند ہوں تو آپ کو جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔ ہاں! آپ کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اللہ اپنے بندوں کی ریاضت کبھی ضائع نہیں فرماتا۔ یہ اس کا قانون ہے اور پروردگار کا قانون کبھی نہیں بدل سکتا۔ اگر مقصد کے لیے جنون کارفرما ہو تو سخت محنت سے بے زاری ہوتی ہے نہ آدمی کبھی اکتا سکتا ہے۔ آپ اس وقت ناکام ہوتے ہیں جب حوصلہ ہار دیتے ہیں۔ میں نے یہ بھی سیکھا کہ حالات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ اگر محسوس یہ ہوتا ہو کہ ہم شکست کی جانب بڑھ رہے ہیں تو اس صورت میں بھی ہمیں ہرگز کبھی ہمت نہ ہارنی چاہیے۔ میرا تجربہ ہے ٹیسٹ میچ کے آغاز پر یہ پیشین گوئی کبھی نہیں کی جا سکتی کہ ان پانچ دنوں کے اندر میچ کی صورت حال کیسی رہے گی۔ انحصار بہت سی باتوں پر ہوتا ہے۔ ٹیم میں شامل قنوطی پہلے دن کے اختتام پر ہی یہ تجزیہ کر لیتے ہیں کہ ہم ہار جائیں گے۔ ذہنی طور پر وہ شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔ ایک رجائیت پسند کی طرح میں صورت حال کو اکثر ایک مختلف زاویے سے دیکھتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض اوقات غیر متوقع صورت حال پیدا ہو جاتی ہے اور آپ کو اچانک کھیل میں واپس آنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر موسم بدل سکتا ہے، پچ کا انداز تبدیل ہو سکتا ہے یا پھر مخالف ٹیم کوئی غلطی کر سکتی ہے۔ آپ اس سے فائدہ اٹھا کر پانسا پلٹ دیتے ہیں۔ اگر آپ حوصلہ نہ ہار چکے ہوں تو پھر ہی اونچ نیچ سے فیض

یاب ہو سکتے ہیں۔ زندگی بھر گہری مایوسی میں اور یقین توڑنے والے حالات کے باوجود یہی رویہ اللہ کے فضل سے میں نے اپنائے رکھا۔ یہ تجربات کا ثمر ہے اور ان سعید صحبتوں کا نتیجہ جو اللہ کے کرم سے حاصل ہوئیں۔

میری اپنی پارٹی کے کچھ لوگوں نے اور بڑی تعداد میں سیاسی تجزیہ نگاروں نے نواز شریف کے بھاری مینڈیٹ کی بنیاد پر پیشین گوئی کر دی تھی کہ اب آنے والے دس برس تک نواز حکومت کو ہلانا کسی کے بس کی بات نہ ہو گی۔ میری جماعت کو ہر ایک نے فراموش کر دیا۔ نواز شریف دو تہائی اکثریت کے بعد زعم میں اس قدر مبتلا تھے کہ اگلے 20 سال تک حکومت کرنے کی منصوبہ بندی فرما رہے تھے۔ ان کے ایک مفکر نے تو وژن 2010ء کے نام سے ایک خیرہ کن منصوبہ بھی قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ بالکل مختلف زاویۂ نظر سے میں سوچ رہا تھا اور اللہ کے کرم سے میرے نقطۂ نظر کو درست ثابت ہونا تھا۔

دائمی رجائیت کے زیر اثر میں مختلف معاملات سے نمٹنے میں جت گیا۔ سب سے پہلے میں ہسپتال کی طرف متوجہ ہوا۔ لیڈی ڈیانا کے دورے کے بعد ہم نے ایک مہم کا آغاز کیا جس کے تحت ایک کے بعد ایک، رائے عامہ ہموار کرنے والی شخصیات، صحافیوں، کالم نگاروں اور اخبارات کے ایڈیٹروں کو ہسپتال کا دورہ کرنے کی دعوت دی جانے لگی۔ 1998ء کے آغاز تک ہسپتال کی مالی حالت سدھر گئی۔ 1999ء تک ہسپتال کے عطیات الیکشن سے پہلے والی حالت میں جا پہنچے۔ اسی دوران میری اپنی مالی حالت بھی سنبھلنے لگی۔ میں نے کرکٹ کے حوالے سے لکھنے اور مبصر کے طور پر خدمات انجام دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ نہ صرف میرے ذاتی اخراجات بلکہ پارٹی کے مصارف کا بندوبست بھی ہونے لگا۔ 1999ء میں بوتھم اور لیمب نے اپنی اپیل واپس لے لی چنانچہ اضافی رقوم کی مجھے ضرورت نہ رہی۔ معاملات کو مزید بہتر انداز میں منظم کر کے مجھے اپنے خاندان کی خوشیوں میں شریک ہونے کا زیادہ وقت ملنے لگا۔ میں سمجھتا ہوں

کہ سیاست میں آکر میں نے جو سب سے بڑی قربانی دی، وہ یہی تھی کہ جو وقت میں اپنے خاندان کے ساتھ گزارنا چاہتا، وہ سیاست کی نذر ہو جاتا۔ اپریل 1999ء میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دوسرے بیٹے قاسم سے نوازا۔ سیاسی میدان میں درپیش مشکلات کم نہ ہوئیں۔ میں نے ایک سال کے اندر اندر پارٹی کے قرضے اتار دیے مگر عطیات میں اضافہ ناممکن ہوگیا۔ پارٹی عہدہ داران کے پاس مالی وسائل نہ تھے کہ وہ کل وقتی سیاسی کارکن کے طور پر کام کرتے پھر ہاری ہوئی جماعت کی مدد کون کرتا؟

ملک کی معاشی حالت بگڑ چکی تھی۔ ہمارے بہت سے عہدہ داران اب دیوالیہ تھے۔ باقیوں کو اتنا ہی کمانے کے لیے دگنا کام کرنا پڑتا۔ میرا زیادہ تر وقت پارٹی کے جھگڑے نمٹانے میں صرف ہو جاتا۔ اکثر کسی مخصوص علاقے کے کارکن اپنے عہدہ دار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے کہ وہ پارٹی کو مناسب وقت نہیں دے رہا۔ اگر پارٹی کا ضلعی سربراہ کام نہ کرے تو پورا ضلع عضوِ معطل بن کے رہ جاتا۔ ہم جاگیرداروں اور پیشہ ور سیاستدانوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان کے تو آبائی انتخابی حلقے ہوا کرتے ہیں۔ ایک مستقل تنظیمی ڈھانچا مسلسل بروئے کار رہتا ہے۔ اتنے وسائل ان کے پاس ہوتے ہیں کہ وہ کل وقتی سیاست کر سکیں۔ جماعت کے لیے قیادت کی تلاش کا دردِ سر بھی درپیش تھا۔ یہ پاکستانی سیاست کا ایک عام مسئلہ ہے۔ اپنے کرکٹ کیریئر کے دوران میں ہمیشہ اس بات پر حیران ہوا کرتا کہ آخر پاکستانی ٹیم میں اتنی زیادہ سازشیں کیوں ہوتی رہتی ہیں؟ انگلینڈ میں کئی فرسٹ کلاس ٹیموں کی نمائندگی کرنے کا موقع ملا جن میں اوکسفرڈ (Oxford)، وورسیسٹر (Worcester) اور سوسیکس (Sussex) شامل ہیں۔ میں آسٹریلیا کے شفیلڈ شیلڈ (Sheffield Shield) مقابلوں میں نیو ساؤتھ ویلز کی نمائندگی بھی کرتا رہا۔ اس کے باوجود کہ بعض ٹیموں کی قیادت نااہل کپتانوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی، میں نے کبھی بھی کھلاڑیوں کو کپتان کے خلاف سازش کرتے نہ پایا۔

ادھر پاکستانی ٹیم میں ہمیشہ دھڑے بندی ہوا کرتی۔ شکست کی صورت میں کھلاڑی کپتان کو ناکام بنانے پر تل جاتے۔ 1982ء میں جب مجھے ٹیم کا کپتان بنایا گیا تو صورت حال ایسی ہی تھی۔ پوری ٹیم نے مسلّط سابق کپتان کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ 1992ء میں میری ریٹائرمنٹ کے بعد بار بار کپتان تبدیل ہوئے۔ 1992ء سے 2010ء کے دوران پاکستان کے قریب قریب 30 کپتان بدلے ہوں گے۔ اسی عرصے میں آسٹریلیا میں صرف 4 کپتان آئے۔ ہسپتال کے لیے عطیات جمع کرنے کی خاطر مجھے بیرونی ممالک میں قائم کمیٹیوں کے اندر کشمکش کا سامنا بھی رہا۔ بہت تحقیق کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ قائدانہ صلاحیتوں کے فقدان کا ایک سبب ہمارا تعلیمی نظام بھی ہے۔ ہمارے سبھی ٹیسٹ کرکٹرز اور سیاسی کارکن سرکاری سکولوں سے تعلیم یافتہ ہیں۔ انتہائی افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چالیس برس کے دوران ہمارا تعلیمی نظام ڈرامائی انداز میں بدترین انحطاط کا شکار ہوا۔ ہمارے اکثر سکولوں میں طالب علموں کی قائدانہ صلاحیتیں اُجاگر کرنے کا کوئی نظام موجود ہی نہیں۔ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا فن سکھانے والا کوئی نہیں۔ ایچی سن کالج کا معاملہ یکسر مختلف ہے جہاں پری فیکٹس (Prefects)، ہیڈ بوائز اور ٹیم کپتانز پر مشتمل پورا نظام موجود ہے۔ سب سے بڑھ کر فوجی تربیت کا انتظام تاکہ ہم ایک ٹیم کی صورت میں کام کرنا سیکھ لیں اور ہم میں وہ اوصاف پیدا ہوں، ایک لیڈر کو حکم منوانے کے لیے جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے نجی سکولوں کی اکثریت اور تمام کے تمام سرکاری سکولوں میں کھیلوں کی سہولتیں موجود نہیں۔ وہاں غیر نصابی سرگرمیوں کا بندوبست بھی نہیں۔ سکولوں کے طلبہ کو یہ سیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا کہ اختیار کے ساتھ احساسِ ذمہ داری بھی لازمی اور بنیادی شرط ہے۔ مزید یہ کہ یہ کوئی اگر اختیار کا غلط استعمال کرے تو اپنے ماتحتوں کی طرف سے ملنے والی عزت سے محروم ہو جایا کرتا ہے۔

موزوں افراد کی تلاش میں بے تحاشا سفر اور اس سے جنم لینے والی بے زاری کے باوجود

ملک کے طول وعرض میں گھومتے پھرتے رہنے کے دوران مجھے بہت کچھ جان لینے کا موقع ملا۔ بعض انکشافات حیران کن تھے۔ ان لوگوں نے مجھے خاص طور پر بے حد متاثر کیا جن کے پاس وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وہ محض اپنے جنون کے بل پر پاکستان کے لیے ہر خدمت انجام دینے پر تلے رہتے ہیں، جتنی بھی سکت ہو، جتنا بھی بس چلے۔ اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ مجھے اپنے لوگوں کا شکوک سے لبریز رویہ لگا۔ بار بار ماضی میں لوگوں کو سبز باغ دکھائے گئے، دھوکا دیا گیا چنانچہ وہ ہر ایک کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ عوام اس بات پر کیسے یقین کرتے کہ میں ماضی میں انقلاب کا وعدہ کرنے والے سیاستدانوں سے مختلف ہوں؟ الیکشن میں ناکامی کے بعد چار سال کے دوران ہمیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ بڑی تعداد میں لوگوں سے ملنا ملانا بذاتِ خود اعلیٰ تربیت کی بہترین اقسام میں سے ایک ہے۔ شاید میں اب اس قابل ہو چکا ہوں کہ لوگوں کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھ سکوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں کسی قدر سرعت کے ساتھ اپنے ملاقاتی کے ذہنی میلان کا اندازہ لگانے کے قابل ہوا۔ نواز شریف نے سیاست کو اس قدر گندا کر دیا کہ لوگوں کی اکثریت سیاست کو پیسہ کمانے کا ذریعہ سمجھنے لگی ہے۔ ایسے لوگوں سے بات کرنا میرے لیے سیاست کا سب سے زیادہ تکلیف دہ سبق ہوتا ہے۔ میں نے اپنے اندر وقت ضائع کیے بغیر اہم ترین نکتے پر پہنچنے کی صلاحیت کو بھی جنم دیا۔ سب سے اہم...... اولین ترجیح کا ادراک!

اہم اور معمولی بات میں تمیز کرنے کی صلاحیت نے مجھے اپنا وقت بہتر طور تقسیم کرنے کے قابل بنایا۔ اپنے تباہ کن انتخابی نقصان اور پارٹی کے اندر ابھرنے والے ایک کے بعد ایک بحران سے نمٹنے کے بعد مجھے اپنے لوگوں کی قدر و قیمت کا درست اندازہ ہوا۔ پتا چلا کہ پارٹی کے کن ارکان پہ انحصار کرنا ہے۔ کرکٹ نے مجھے یہ سکھایا کہ کھلاڑی کی صلاحیت کا پتا اس وقت چلتا ہے جب اسے شدید دباؤ میں کھیلنا پڑے۔

میں پیشین گوئی کر چکا تھا کہ نواز شریف زیادہ دیر اقتدار میں نہ رہ پائے گا۔ حکومت کی معاشی بدانتظامی اور ریاستی اداروں کی بڑھتی ہوئی بے توقیری کے باعث شریف مخالف جذبات میں شدت آنے لگی۔ ستمبر 1999ء میں تمام اپوزیشن پارٹیوں نے گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس (جی ڈی اے) کے نام سے ایک اتحاد قائم کر لیا جس کا ایک نکاتی ایجنڈا نواز شریف سے نجات کی مہم چلانا تھا۔ پارلیمنٹ میں اپنی فیصلہ کن اکثریت کے بل پر اسی برس نواز شریف نے 15ویں آئینی ترمیم منظور کرانے کی کوشش کی۔ اگر یہ مان لی جاتی تو وہ ''امیر المومنین'' بن جاتا، آمرانہ اختیارات بھی اسے مل جاتے اور وہ زیادہ سخت گیری اور من مانی کے ساتھ فیصلے فرمایا کرتا۔

13ویں ترمیم میں ایک شق شامل تھی کہ پارٹی سربراہ کی حکم عدولی پر پارلیمنٹ کا ممبر اپنی رکنیت سے محروم ہو جائے گا۔ نواز شریف پہلے ہی مغل بادشاہ کی طرح تھا، 15ویں ترمیم کی منظوری کے بعد وزیر اعظم کے بے لگام اختیارات ہر قسم کی روک ٹوک سے ماورا ہو جاتے۔ خطرہ تھا کہ مارچ 2000ء میں سینٹ الیکشن کے بعد نواز شریف کو مطلوب اکثریت مل جائے گی اور وہ 15ویں ترمیم کو قانونی شکل دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ حضرت نواز شریف اور ان کی پارٹی نے پہلے بھی ایک ''کارنامہ'' انجام دیا جو ہماری تاریخ کے سب سے زیادہ ذلت آمیز واقعات میں سے ایک ہے۔ 1997ء میں ان کے پارٹی لیڈروں نے اپنے کارکنوں کو ساتھ لے کر سپریم کورٹ پر ہلا بول دیا۔ چیف جسٹس نے جرأت سے کام لے کر نواز شریف کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی کا آغاز کیا تھا۔ اب عدالت سے انہیں جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ جی ڈی اے نے ملک کے مختلف شہروں میں جلوس نکالے۔ صاف ظاہر تھا کہ رائے عامہ نواز شریف کے خلاف ہو چکی ہے۔ گو کہ پاکستان کے عام آدمی کو 15ویں ترمیم سے کوئی سروکار نہ تھا۔ معاشی حالات دگرگوں تھے اور عام لوگ ایک طرف بے روزگاری تو دوسری طرف مہنگائی خاص طور پر بجلی، پانی اور گیس کے بلوں میں اضافے کی چکی میں پس رہے تھے۔ عوام کا جینا دوبھر ہو گیا۔

عاقبت نااندیشی کے نتیجے میں کیے جانے والے تباہ کن کارگل آپریشن کے بعد آرمی چیف جنرل مشرف کے ساتھ بڑھتے ہوئے تناؤ نے نواز شریف کو مزید کمزور کر دیا۔ مئی 1999ء میں بھارت کو پتا چلا کہ پاک فوج اور کشمیری حریت پسند مقبوضہ کشمیر میں کارگل کی چوٹیوں پہ براجمان ہیں۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ یہ واقعہ بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کے تاریخی دورۂ لاہور کے تین ماہ بعد پیش آیا۔

مشرقی پاکستان میں بھارتی مداخلت کے بعد جو بنگلہ دیش کے قیام پر منتج ہوئی، یہ پہلی بار تھا کہ قیام امن کے لیے دونوں ملکوں کے سربراہ رسمی طور پر ایک مشترکہ اعلامیہ پر دستخط کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ فریقین قیام امن کے پابند تھے۔ نواز شریف کے مطابق پرویز مشرف نے اس سے مشورہ کیے بغیر کارگل اقدام کیا اور اسے دھوکا دیا۔ دوسری طرف مشرف کا اصرار ہے کہ وزیراعظم ہر بات سے آگاہ تھے۔ حقیقت جو بھی ہو اس صورت حال نے نواز شریف کو مشکل میں ڈال دیا۔ بین الاقوامی برادری نے پاکستان کو خوب لتاڑا۔ بھارت نے بھی اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ پاکستان خطرات سے دوچار ہے، نواز شریف مجبور ہو گیا کہ وہ بل کلنٹن کی منت سماجت کر کے جنگ بند کرائے۔ اس نے پاک فوج کو رکنے کا حکم دیا جس پر لوگ حیران رہ گئے۔ بتایا یہ گیا تھا کہ کارگل کی چوٹیوں پر قبضہ حریت پسندوں نے کیا ہے۔ حکومتِ پاکستان کا ان پر کوئی کنٹرول نہیں۔

اس واقعہ کے بعد سے نواز شریف اور پرویز مشرف کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہوا۔ نواز شریف کی جگہ اگر کوئی حقیقی لیڈر ہوتا تو وہ آرمی چیف کو گریبان سے پکڑ کر سامنے لاتا۔ اس کے کورٹ مارشل کا حکم دیتا، سب سے بڑی ہزیمت کا اسے ذمہ دار ٹھہراتا جس کے باعث نہ صرف بڑے پیمانے پر فوج کا جانی و مالی نقصان ہوا بلکہ دنیا میں ہماری شہرت بھی داغ دار ہوئی اور سب سے بڑھ کر تحریک آزادیٔ کشمیر کے مقاصد کو نقصان پہنچا۔ یہ سب کرنے کی بجائے

نواز شریف کئی ماہ تک تو خوف کی حالت میں رہا، گومگو کی کیفیت میں جلتا، کڑھتا اور کراہتا ہوا۔ بالآخر مشرف کو ہٹانے کی کوشش بھی کی تو نہایت بھونڈے انداز میں۔ دورۂ سری لنکا سے واپسی پر وزیراعظم صاحب نے اسے برطرف کیا۔ آنجناب نے وقت حاصل کرنے کے لیے مشرف کے طیارے کو کسی اور سمت موڑنے کی کوشش کی۔ اسی دوران مشرف کے وفادار جرنیلوں نے نواز شریف سے بغاوت کر کے مارشل لا لگا دیا۔ فتح یاب مشرف نے نواز شریف اور اس کے قریبی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ ملک میں پھر سے فوج حکمران ہو گئی۔ نواز شریف جیسے سول آمر کی بجائے اب ایک باوردی حکمران ملک پر مسلط تھا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ جی ڈی اے میں شامل سیاسی رہنماؤں نے جو شد و مد کے ساتھ فوج سے نواز شریف کو ہٹانے کا مطالبہ کر رہے تھے، فوراً ہی اپنا موقف بدل لیا۔ بعد میں انہی لیڈروں نے مشرف کو ہٹانے کے لیے نواز شریف کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ جب بینظیر نے یہ دیکھا کہ اسے حکومت میں شامل کرنے کی بجائے فوجی حکومت اس کے خلاف کرپشن کے مقدمات کی پیروی کر رہی ہے تو اس نے بھی نواز شریف سے ہاتھ ملا لیا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا کہ یہ مفاد پرست سیاستدان پاکستانی عوام کی اس قدر توہین کریں گے۔ محض چند ماہ پہلے یہی رہنما عوام کو بتانے میں مصروف تھے کہ نواز شریف جمہوریت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اب انہوں نے اپنی ''جمہوریت'' کی خاطر اسی نواز شریف سے پیمان کیا۔

بینظیر اور نواز شریف گیارہ برسوں سے ایک دوسرے کی کرپشن کو بے نقاب کرتے آئے تھے۔ نواز حکومت نے پاکستانی ٹیکس دہندگان کا مال خرچ کر کے اپنی سی پوری کوشش کی کہ بینظیر کو سزا ملے۔ زرداری کو انہوں نے جیل میں رکھا۔ اب انہوں نے دیکھ لیا کہ مشرف ان دونوں کے خلاف ہے تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے۔ 1988ء سے لے کر 1999ء تک کی پاکستانی سیاست کا یہی خلاصہ تھا کہ گیلپ سروے کے مطابق ملک کے 70 فیصد لوگوں نے

بلاشبہ مشرف کے مارشل لا کی حمایت کی۔ نواز شریف پر مقدمہ چلا۔ دہشت گردی اور اغوا کے الزامات پر ان صاحب کو سزا سنا دی گئی۔ نواز شریف نے عمر قید کی سزا پر مشرف سے سودے بازی کی اور خاندان سمیت 2000ء میں سعودی عرب جلاوطن ہو گیا۔

میں نے مشرف کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے عمل کا خیر مقدم کیا۔ محسوس یہ ہوتا تھا کہ نواز شریف اور بینظیر اب باری باری اقتدار کے مزے نہ لوٹ سکیں گے۔ پاکستانی عوام پر اب نجات کا کوئی دروازہ کھلے گا۔ شادی کے دن سے ہی جمائما پاکستان کا طرزِ زندگی اپنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اسلام قبول کیا بلکہ اردو بھی سیکھ لی۔ اس نے میری انتخابی مہم میں کئی تقریریں اردو میں کی تھیں۔ ہسپتال کے لیے چندہ اکٹھا کرنے میں بھی اس نے میری مدد کی۔ جن پروگراموں میں وہ شریک ہوتی وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوتے۔ اس نے ملبوسات کا کاروبار بھی شروع کیا۔ پاکستانی کڑھائی اور کشیدہ کاری والے ملبوسات وہ مغربی ممالک کو بھیجتی۔ اس سے حاصل ہونے والی تمام رقم ہسپتال کو ملتی۔ اس کاروبار کی وجہ سے سینکڑوں خواتین کو روزگار میسر آیا۔ جب اس نے جلوزئی کیمپ میں غیر انسانی حالات میں پناہ گزین افغان مہاجرین کی مدد کا فیصلہ کیا تو میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ اس نے ایک مضمون پڑھا جس میں لکھا تھا کہ کس طرح کچھ افغان بچے ٹھنڈ سے مر گئے۔ وہ ایک ماں تھی چنانچہ مضمون نے اس کے دل پر ایسا اثر کیا کہ اس نے ایک خیراتی مہم شروع کر کے کروڑوں روپے جمع کیے۔ اس کیمپ میں خیموں اور طبی سہولتوں کا انتظام اسی روپے سے ہوا۔

دو مختلف ثقافتوں سے تعلق کے باوجود ہم اپنی شادی کو کامیاب بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ دوسری طرف کچھ قوتیں اس ازدواجی زندگی کو تباہ کرنے پر تلی تھیں۔ ہم پر یہ بات آشکار ہوئی کہ پاکستان کا سیاسی مافیا کس قدر بدطینت ہو سکتا ہے۔ دسمبر 1998ء میں مجھے شرمندگی سے دوچار کرنے کے لیے نواز شریف حکومت نے جمائما پر نوادرات کی سمگلنگ کا

الزام عائد کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ جمائما نے جو ٹائلیں اپنی ماں کو تحفے میں بھیجی ہیں، وہ قدیم نوادرات میں شمار ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ ٹائلیں ایک عام دکان سے خریدی گئی تھیں۔

تاریخی نوادرات کی برآمد کے حوالے سے ہمارے قوانین بہت ہی سخت ہیں اور ظاہر ہے کہ ہونے بھی چاہییں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اول ان پر عمل کیا جائے ثانیاً ان کا غلط استعمال ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ مقدمہ درج ہوا تو جمائما نے ٹائلوں کا لندن کے تین عجائب گھروں سے تجزیہ کرایا۔ انہیں عمر کا تعین کرنے والی جانچ (Thermoluminescence) سے گزارا گیا۔ تمام نے اس بات کی تصدیق کی کہ ٹائلیں پرانی نہیں چہ جائیکہ نوادرات۔ حکومت جمائما کو ملوث کرنے پر تلی تھی۔ کسی چیز کو قدیم تاریخی حیثیت کا حامل قرار دینے کے لیے محکمہ آثارِ قدیمہ، کسٹمز حکام اور ملزم پر مشتمل ایک 9 رکنی کمیٹی کی تشکیل ضروری ہوتی ہے۔ اس کی بجائے محکمہ آثارِ قدیمہ کے صرف ایک ملازم نے انہیں نوادرات قرار دینے کا فتویٰ صادر کیا۔ عدالت کو یہ مقدمہ اٹھا کر پھینک دینا چاہیے تھا لیکن متعلقہ جج کیس مسلسل ملتوی کر کے حکومت کو مزید وقت دیتا رہا۔ سمگلنگ پاکستان میں ناقابلِ ضمانت جرم ہے جس میں سات برس تک قید کی سزا ہو سکتی ہے لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک مقدمہ ختم نہیں ہو جاتا جمائما انگلینڈ ہی میں قیام کرے۔ یوں ہماری خاندانی زندگی میں ایک نئی بدمزگی نے جنم لیا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی حکومت کے اشاروں پر چلنے والی عدلیہ پر اعتبار کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ خاص طور پر جب ایک دو سالہ اور دوسرا شیرخوار بچہ ہماری ذمہ داری تھے۔ مارشل لا کی آمد کے ساتھ ہی جمائما کے خلاف مقدمہ ہوا ہو گیا تاہم گیارہ ماہ تک اسے ملک سے باہر رہنا پڑا۔

اس بڑی مصیبت سے جان چھوٹنے کے باوجود سیاست ہماری خاندانی زندگی میں مزید انتشار پیدا کرنے والی تھی۔ اگر 1997ء کے انتخابات ہماری شادی پر شاق گزرے تو 2002ء کے الیکشن اس سے بھی زیادہ بھاری ثابت ہوئے۔ 1997ء میں کم از کم اتنا تو تھا کہ الیکشن میں

جمائما شریکِ حال تھی جبکہ اس بار وہ دور تھی۔ میری قوت میں اضافے کی بجائے سیاسی مخالفین نے اسے میری کمزوری میں تبدیل کر دیا۔ اس قابل تو وہ تھے نہیں کہ مجھ پر بددیانتی کا الزام دھر سکتے، لہٰذا انہوں نے جمائما کے ذریعے مجھے نشانہ بنایا۔ جمائما کے لیے الگ تھلگ رہنا آسان نہ تھا کیونکہ وہ بنیادی طور پر سیاسی رجحان رکھنے والی خاتون ہے۔ ہماری شادی کے لیے یہ غیر معمولی دھچکا ثابت ہوا۔ دو ثقافتوں کے درمیان شادی کا بندھن تبھی قائم رہ سکتا ہے جب آپ کے مقاصد اور امنگیں ایک ہوں۔ جمائما کو منظر سے مگر دور رہنا تھا۔ اس سب کے باوجود بھی انہوں نے اُسے بخشا نہیں۔ اخبارات میں اس کے بارے میں من گھڑت کہانیاں متواتر چھپتی رہیں۔ جمائما نے کہیں یہ کہا تھا کہ اس نے ''ادب بعد از نو آبادیاتی نظام'' (Post-Colonial Literature) کے موضوع پر اپنی یونیورسٹی کے مقالے کی تیاری کے دوران سلمان رشدی کی ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس پر اخبارات میں یہ بے ہودہ، من گھڑت داستان چھپوائی گئی کہ جمائما سلمان رشدی کو اپنا رہنما سمجھتی ہے۔ اس کی پاکستانی شہریت منسوخ کرنے کے لیے مظاہروں کا اہتمام ہوا۔ ایسا سلوک مضبوط سے مضبوط اعصاب کے مالک کسی شخص کو بھی اذیت میں مبتلا کر سکتا ہے۔ پھر جمائما جیسی خاتون کے لیے جو فطری اعتبار سے حساس اور شرمیلی ہے، یہ سب کس قدر تکلیف دہ رہا ہوگا؟ انتخابی مہم کے لیے میں مسلسل پانچ ماہ گھر سے دور رہا۔ یوں ہمارے مسائل گھمبیر ہوتے گئے۔ میں تن تنہا انتخابی مہم چلا رہا تھا۔ میرے بہترین امیدوار مقابلے کے میدان سے نکال دیے گئے تھے۔ میں اس دوران بہت کم بیوی بچوں سے مل پایا۔ آخر ہماری پارٹی کو صرف ایک نشست ملی، میانوالی سے۔ ایسے حالات میں جب آزادیاں سلب ہوں، ساری حکومتی مشینری نہ صرف میرے مخالفین کی مدد بلکہ انہیں متحد اور طاقت ور بنا کر بروئے کار لانے پر مامور ہو، ایک سیٹ حاصل کرنا بھی بہت بڑی کامیابی تھی۔

بہرحال ذاتی طور پر مجھے اس کی بہت بھاری قیمت چکانا پڑی۔ جب میں گھر لوٹا تو جمائما مکمل طور پر مایوسی میں ڈوب چکی تھی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ اس نے حوصلہ ہار دیا

ہے۔ احساسِ جرم نے مجھے کچوکے لگانے شروع کیے کہ جمائما کو دکھی کرنے کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ اس نے جان توڑ کوشش کی تھی لیکن میری سیاسی مصروفیات اور اس کے خلاف جاری مہم کو جھیلنا بہت مشکل تھا۔ میں احساسِ جرم میں مبتلا تھا۔ عمر میں بڑا ہونے کے ناتے شادی کو کامیابی سے چلانے کی زیادہ ذمہ داری مجھ پر تھی۔ شادی کے فوراً بعد جب ہم نے سیاسی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا تو وہ کم عمر تھی۔ وہ اس بات کا کس طرح اندازہ کر سکتی تھی کہ ایک اجنبی دیس میں اس کی زندگی کیسی دشوار ہوگی۔ مجھے تو مگر آمدہ حالات کے بارے میں غور و فکر کرنا چاہیے تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے سوچا کہ شاید میں نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں تو گزرے ماہ وسال میں جدوجہد کی بھٹی سے ہو کر نکلا ہوں، سب سرد و گرم جھیل سکتا ہوں، مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اپنی بیوی کو پاکستانی سیاست کے ہنگامہ خیز اکھاڑے ہی میں دھکیل دیتا۔ خود کو ایک بالکل اجنبی ثقافت میں ڈھالنا بجائے خود ایک بڑا چیلنج تھا۔ لوگوں پر خاندان، خاص طور پر بیویوں کے حوالے سے حملے پاکستانی ثقافت میں ناپسندیدہ ہیں۔ ایسی باتیں کم ہی سننے کو ملتی ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا کبھی نہ دیکھا تھا کہ لوگ اس درجہ گھٹیا پن پر اتر آئیں۔ ایک غیر ملکی خاتون کو محض اس لیے نشانے پر رکھ لیں کہ اس کا شوہر ایک سیاستدان ہے۔

جمائما نے مجھ سے کہا کہ اب وہ انگلینڈ جا کر لندن کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز (London School of Oriental and African Studies) میں ایک سال تعلیم حاصل کرنے کی آرزومند ہے۔ اس نے کہا کہ بچوں کو بھی وہ ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔ یہ خبر میرے اعصاب پہ بجلی بن کر گری۔ میں نے اس تجویز کی مخالفت نہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ہمیشہ کی طرح مجھے اس بات پر اب بھی یقین تھا کہ شاید حالات بہتری کی جانب لوٹ آئیں۔ امید تھی کہ اگر ملک کے سیاسی حالات بہتر ہو جائیں تو میں اسے منا کر واپس لے آؤں گا۔ شاید وہ خود اس بات کو سمجھ جائے کہ ہم دونوں نے پاکستان میں جس زندگی کا آغاز کیا تھا، وہ

جاری رکھنے کے قابل ہے۔ میرے دل نے مگر مجھ سے یہ کہا کہ اب یہ اختتام کا آغاز ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ دو ایسے لوگ جو ثقافتی اعتبار سے دو مختلف براعظموں میں بستے ہوں، ان کی شادی آسانی سے کامیاب نہیں ہو سکتی۔ میں نے ایک سال کے دوران محسوس کر لیا کہ لندن میں اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ ایک مرتبہ پھر وہ خوش و خرم زندگی میں مگن ہے۔ طلاق کے مختلف مراحل والے چھ مہینے ملا کر میری زندگی کا سب سے زیادہ کرب ناک سال بالآخر مکمل ہوا۔ بچوں کی تکلیف کا احساس میری اذیت میں اور اضافہ کر دیتا۔ طلاق کی صورت میں سب سے زیادہ امتحان بچوں کو درپیش ہوتا ہے۔ بڑا ہونے کی بنا پر سلیمان اس صورت حال کو زیادہ شدت سے محسوس کرتا۔ اسے دیکھ کر میری اذیت کئی گنا بڑھ جاتی۔ مجھے بچے بے انتہا یاد آتے۔ دنیا کی کوئی چیز اس خلا کو پر نہ کر سکتی تھی۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں باپ ہونے سے بڑی کوئی خوشی نہ دیکھی تھی۔ یہ ایسا تجربہ ہے جس سے اکثر والد اپنی مصروفیات کے باعث محروم رہ جاتے ہیں۔ میری زندگی میرے خاندان اور میرے کام تک محدود تھی۔ اس دوران میں شاید ہی کبھی دوستوں سے ملنے ملانے یا کھانے کی دعوتوں پر گیا ہوں...... اب وہ میرے پاس نہیں تھے میں اکیلا تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے محسوس ہوا کہ زندہ رہنے کی خواہش کیسے اور کیونکر دم توڑ دیا کرتی ہے۔ جب آپ عادی ہوں کہ اکثر صبحوں کو کوئی اپنا، آپ کو بیدار کرے تو مسرت سے آپ کا وجود سرشار ہو جاتا ہے۔ آپ ایک نئی امید کے ساتھ ایک نئے دن کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اب اچانک یہ حال کہ میرے لیے بستر سے نکلنا بھی محال ہونے لگا۔

ایک بار پھر میرے ایمان نے میرا ہاتھ تھام لیا اور اس مشکل سے مجھے نکالا۔ ایک مرتبہ طلاق کو جب میں نے ذہنی طور پر قبول کر لیا تو میں نے خود کو سنبھالا اور دوبارہ اپنے سیاسی و فلاحی کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میرے اندر وہ جو ایک رجائیت پسند ہے، ہمیشہ ہر معاملے کے روشن پہلو پہ نظر رکھتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ طلاق کے معاملے میں، میں باقی لوگوں سے کہیں زیادہ

خوش قسمت ہوں۔ ہمارے درمیان کوئی تلخی، کوئی مخاصمت نہ ہوئی، مالی تنازعات قطعاً نہ اٹھے جن کے لیے وکیلوں کی ضرورت پڑتی۔ جمائما بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع فراہم کرنے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ وہ اپنی چھٹیاں پاکستان میں گزارتے ہیں۔ جب وہ یہاں ہوتے ہیں تو میں خود کو ان کے لیے وقف کر دیتا ہوں۔ جب میں انگلینڈ جاتا ہوں تو اپنی سابق خوش دامن لیڈی اینابل کے گھر پر قیام کرتا ہوں۔ آج بھی میرے ساتھ وہ گھر کے فرد جیسا برتاؤ کرتی ہیں۔ ان کے بیٹے بن (Ben) اور زیک (Zac) بھائیوں کی طرح مجھ سے پیش آتے ہیں۔ اب میں اپنی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز کر سکتا ہوں۔ جمائما کو دکھی رکھنے کا جو بوجھ مجھ پر تھا، وہ ہٹ گیا۔ میرے نزدیک اگر کسی اپنے کو خود سے دور رکھنا برا ہے تو اس کو دکھی دیکھنا اس سے بھی بدتر ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے "ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔" (65:7-7:42) قرآن کی ان آیات سے میں اپنی ہمت بندھاتا کہ جب اللہ ہماری کوئی دعا قبول نہیں کرتا تو فقط وہی جانتا ہے کہ ہمارے حق میں بہتر کیا ہے۔ جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب کچھ دوبارہ دہرائے جانے پر کیا میں مختلف انداز میں عمل کر سکتا؟ کون جانے زندگی اسرار سے بھری ہے۔ ہم ہر چیز کا ادراک نہیں کر سکتے۔

جب میں شادی شدہ نہ تھا تو میرے دوست مجھے رشک سے دیکھا کرتے۔ میری زندگی میں سب سے بڑی خوشی اور سب سے زیادہ اطمینان شادی کے بعد آیا۔ میں ہمیشہ سے خطرات مول لیتا آیا ہوں اس لیے کامیابیوں کے ساتھ ناکامیوں کے لیے بھی ذہنی طور پر پوری طرح تیار رہتا ہوں۔ میں ماضی میں جھانک کر دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ ان حالات میں کیا ممکن تھا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کسی بھی قیمت پر اپنی شادی کو بچا لینا چاہیے تھا۔ اب مگر کوئی پچھتاوا نہیں۔ اگر کوئی بات مجھے جمائما سے شادی کرنے سے روک سکتی تو وہ یہی تھی کہ وہ کمسن اور ناتجربہ کار ہے۔ اتنی بڑی آزمائش میں اسے نہیں ڈالنا چاہیے۔ مجھے یہ بات بہت تکلیف

دیتی ہے کہ اسے ان تمام ناگوار احساسات سے گزرنا پڑا جو طلاق سے جنم لیتے ہیں۔ بہر حال ان سب دکھوں کے بدلے وہ دو خوبصورت بیٹوں کی ماں اور پاکستان کی صورت میں وہ دوسرے وطن کی مالک ہے جہاں اسے پسند کیا جاتا ہے اس لیے پاکستان کے ساتھ اس کی وابستگی قائم ہے۔ سیلاب ہو یا زلزلہ، ملک پر جب بھی آزمائش آئی، وہ سب سے پہلے مدد کے لیے موجود ہوتی ہے۔ پوچھنے والے سوال کرتے ہیں کہ اپنی شادی بچانے کے لیے میں لندن منتقل کیوں نہ ہو گیا؟ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ برطانیہ میں بس جاؤں، کرکٹ اور صحافت کی زندگی بسر کروں۔ میرے لیے یہ ایک بے مقصد حیات ہوتی۔ میں یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ زندگی کسی مقصد اور جنون کے بغیر بسر کی جاسکتی ہے۔ ایک وقت تھا جب مقصد کرکٹ تھا۔ پھر شوکت خانم ہسپتال اور نمل یونیورسٹی جو اگر پروردگار کو منظور ہوا تو ایک دن عظیم الشان شہرِ علم کی بنیاد بن جائے گی۔ اب سیاسی جدوجہد میری زندگی کا مرکز و محور بن گئی۔ جمائما کو یہ بات معلوم تھی۔ اس نے ہمہ وقت گھر کے ساتھ چمٹے رہنے والے کسی شخص سے شادی نہ کی تھی۔ میری شخصیت کا تحرک بھی ان اوصاف میں شامل تھا جس نے اس شادی پر اسے آمادہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس تحرک کو میں کھو دیتا تو خود اس کی نظروں سے بھی گر جاتا۔ حالات کتنے ہی خراب اور منزل کی راہ میں کتنی ہی دشواریاں حائل ہوں، فیصلے کرنا ہی پڑتے ہیں۔ پھر کیوں نہ حوصلہ مندی اور مثبت اندازِ فکر کے ساتھ کیے جائیں۔ یہی سچی زندگی ہے اور اسی میں آدمی کی ابدی مسرت کا راز پوشیدہ ہے۔

باب ہفتم

لو آپ اپنے دام میں صیّاد آ گیا

12 اکتوبر 1999ء کو پرویز مشرف نے فوج کے بل پر اقتدار سنبھالا تو مجھ سمیت بہت سے پاکستانیوں کے قلوب و اذہان میں امید نے جنم لیا کہ شاید ملک کو اب زوال کے عذاب سے کچھ تھوڑی مہلت ملے۔ وہ زوال جو ماضی کی تمام حکومتوں میں جاری و ساری تھا۔ چودھویں اور پندرھویں ترامیم کے ذریعے نواز شریف نے آمرانہ اختیارات حاصل کرنے کا جو منصوبہ بنایا، وہ جمہوریت کے لیے ایک عظیم خطرہ تھا۔ میں نے سوچا اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم بچ نکلے۔ ہم اس لیے بھی امید سے ہم کنار تھے کہ پرویز مشرف نے حقیقی جمہوریت کے لیے نئے الیکشن کرانے اور ملک کو کرپشن سے پاک کردینے کا وعدہ کیا تھا۔ شروع میں ان کے دعووں میں خلوص جھلکتا تھا۔

فوجی انقلاب کے چند ماہ بعد مشرف کی خواہش پر اس کے ساتھ میری ایک خفیہ ملاقات ہوئی۔ اسی وقت مجھے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ جنرل کا کوئی نظریہ نہیں۔ قانون کی حکمرانی کیا ہوتی ہے، اس سے وہ آشنا نہیں۔ دوراندیشی اس میں پائی نہیں جاتی۔ وہ پہلے ہی اپنا پی سی او

جاری فرما چکا تھا۔ چند ایک ججوں کو اس نے گھر بھیج دیا تھا۔ ان دو کو جو سب سے زیادہ بدعنوان تھے، اپنے عہدوں پر اس نے برقرار رکھا۔ میں نے پوچھا: عدلیہ کی آپ نے پوری طرح صفائی کیوں نہ کی؟ اگر آپ کا بنیادی مقصد احساس ذمہ داری کے ساتھ اچھی حکومت اور کرپشن سے نجات ہے تو آپ کو سب سے پہلے یہی کام کرنا چاہیے تھا۔ صرف ایک مضبوط اور آزاد عدالتی نظام ہی سچے احتساب کا ضامن ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں بدعنوانی کے تباہ کن جرائم، ان سیاستدانوں کے ہاتھوں انجام پائے، جن کے ہاتھوں میں اختیارات مرتکز ہو گئے۔ وہ اس لیے بچ نکلتے ہیں کہ عدلیہ انتظامیہ کے رحم وکرم پر ہوتی ہے یا درحقیقت انتظامیہ کا حصہ ہی۔ پرویز مشرف کا جواب یہ تھا ”عمران خان! اگر میں نے عدلیہ کو چھیڑا تو پوری بین الاقوامی برادری میں ہم اچھوت بن کر رہ جائیں گے۔“ اب حقیقت تو یہ تھی کہ چھیڑ تو وہ چکا تھا اور الگ تھلگ بھی ہو گیا تھا۔ سب سے پہلے اسے پاکستان کو بچانے کی فکر کرنا چاہیے تھی، دنیا کے بارے میں بعد ازاں سوچ لیا جاتا۔ اگر وہ سچا اور مخلص ہوتا تو پاکستانی عوام اس کے ساتھ ہوتے اور دنیا اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتی۔ بین الاقوامی برادری کے ساتھ نمٹنا بہت آسان ہو جاتا۔ سات برس بعد یہ بات اس پر آشکار ہو گئی ہو گی۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو اس نے برطرف کیا۔ تب دنیا کی واحد عالمی طاقت کی حمایت بھی اسے بچا نہ سکی کہ عوام مکمل طور پر اب اس کے خلاف تھے۔ یہی شاہ ایران کے ساتھ ہوا تھا۔ حال ہی میں مصر کے حسنی مبارک اور تیونس کے زین العابدین پر بھی یہی بیتی۔ 1978ء اور 1979ء میں ایرانی عوام رضا شاہ پہلوی کے خلاف اٹھے تو اپنی بہترین کوششوں کے باوجود امریکہ بھی اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ اسے بھاگنا پڑا جس طرح عوام کے غیض وغضب کا شکار ہونے والے ہر حکمران کو بھاگنا پڑتا ہے۔

مشرف کی اکثر ابتدائی غلطیوں کو ہم میں سے اکثر نے نظر انداز کر دیا۔ ہم یہ سمجھے کہ اسے غلط مشورے دیئے جا رہے ہیں یا شاید سیاست کی اسے سمجھ نہیں۔ گیارہ برس تک پاکستان

پر ن لیگ اور پیپلز پارٹی کا قبضہ رہا۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو ڈٹ کر بدعنوانیوں کا ارتکاب کرتے رہے۔ مشرف کو ہم کچھ وقت دینے پر آمادہ تھے۔ رفتہ رفتہ ہم پر کھلا کہ اس کا واحد مقصد خود کو اقتدار میں برقرار رکھنا اور اس کا لطف اٹھانا ہے۔ اس کی تمام تر بصیرت اور جدوجہد اسی ایک ہدف پر مرکوز تھی۔ ہر سمجھوتا اس نے اسی خاطر کیا۔ 1979ء میں جنرل محمد ضیاء الحق نے افغانستان میں سوویت مداخلت کو اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے استعمال کیا۔ خود کو انکل سام کے لیے ناگزیر بنا دیا۔ اسی طرح مشرف نے بھی اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے نیویارک اور واشنگٹن پر نائن الیون کے حملے کو ایک بہترین موقع جانا۔

11 ستمبر 2001ء کو، میں صوبہ سرحد کے سب سے بڑے شہر پشاور میں ایک سیاسی ریلی سے خطاب کر رہا تھا، جب امریکی شہروں پر حملے کی خبریں میں نے سنی۔ دوسرے جہاز کے ٹاور سے ٹکرانے کا منظر میں نے خود ٹی وی پر دیکھا۔ خطرے کی گھنٹی میرے دل میں بج اٹھی۔ مناظر کی ہولناکی کے باعث میں سکتے میں آ گیا۔ میں نے سوچا کہ نتائج خطرناک ہوں گے۔ کس طرح لوگ عمارت کے اندر بھڑکتے دوزخ سے بھاگ کر کھڑکیوں سے چھلانگیں لگا رہے تھے۔ پوری زندگی میں ایسے دہلا کر رکھ دینے والے مناظر میں نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ ہر کوئی حیران اور ششدر تھا، ہر کوئی سوچتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ کاش! ہائی جیکر مسلمان نہ ہوں، دوسرا یہ کہ اگر مسلمان بھی ہوں تو پاکستانی ہرگز نہیں۔

جب یہ بات سامنے آئی کہ حملہ آور عرب تھے تو مجھے یہ احساس ہوا کہ عالم اسلام کے لیے دنیا اب ویسی کبھی نہ رہے گی جیسی پہلے تھی۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق تھا، چونکہ ہمارا یہاں کا کوئی شہری سانحے میں ملوث نہ تھا، اس لیے میں نے سوچا کہ اس سے شاید ہمیں خاص فرق نہ پڑے۔

ایک ہفتے کے اندر اندر پاکستان کے خلاف عالمی میڈیا نے ایک بھرپور تحریک شروع کر دی، ایک عجیب وغریب تماشا۔ ہماری آنکھ کھلی تو ہم ”دہشت گردی کے خلاف جنگ“ میں

جھونکے جا چکے تھے۔ اب تک امریکہ پرویز مشرف کو شک کی نظر سے دیکھتا آیا تھا۔ اچانک وہ اس کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ 2000ء میں جب امریکی صدر بل کلنٹن پاکستان کے دورے پر آئے تو انھوں نے مشرف کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے تصویر تک بنوانے سے انکار کیا تھا۔ کہیں دنیا یہ تاثر نہ لے کہ امریکہ فوجی آمر کے اقتدار کو تسلیم کرتا ہے۔ اب مشرف ''اسلامی دہشت گردی'' کے خلاف انکل سام کا اہم اتحادی بنا تو جمہوریت کو لاحق خطرات پر ساری تشویش بھاپ بن کر اڑ گئی۔ جیسے ہی مشرف نے اپنے سابق اتحادی طالبان کے خلاف امریکہ بہادر کی مدد شروع کی، ان پر ڈالر برسنے لگے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ نائن الیون کے بعد مشرف حکومت نے سینکڑوں لوگوں کو واشنگٹن کے حوالے کیا، ڈالروں کے بدلے۔ ''چیریٹی ریپرائیو'' (Charity Reprieve) کے مطابق ان میں سے 95 فیصد پاکستانی بے گناہ تھے۔ اپنی خودنوشت میں مشرف نے خود اقرار کیا کہ القاعدہ سے تعلق کے شبہ میں سات سو افراد کو اس نے امریکہ کے سپرد کیا۔ اس کے باوجود کہ یہ حرکت پاکستانی دستور کی دفعہ 41 کی صریح خلاف ورزی تھی۔ دستور یہ کہتا ہے کہ کوئی پاکستانی کسی اور ملک کے حوالے نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اُسے عدالت میں پیش نہ کیا جائے، جب تک اپنی معصومیت ثابت کرنے کا اسے موقع نہ دیا جائے۔ پرویز مشرف نے آئین پامال کر کے رکھ دیا، صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ بعض عرب حکمرانوں کی طرح وہ بھی ''اسلامی انتہاپسندی'' کے خلاف ہے۔
امریکہ نے مشرف کو بے دریغ استعمال کرنا شروع کیا۔ انکل سام کو اب پاکستان کے لیے جمہوریت یاد نہ رہی جس کا بعد ازاں عراق میں وہ واویلا کرتا رہا۔ پاکستان سے بس اتنا ہی سروکار تھا کہ اس کی شاندار فوج امریکہ کے لیے کرائے کے سستے سپاہیوں کا کردار ادا کرے۔
یہی کچھ جنرل محمد ضیاء الحق کے دور اقتدار میں انھوں نے کیا تھا۔ مسائل پیدا کرنے والی جمہوریت کی بجائے ایک طاقت ور آمر استعمار کو ہمیشہ سازگار ہوتا ہے۔

ان دنوں میجر جنرل احتشام ضمیر آئی ایس آئی میں سیاسی ونگ / شعبہ کے سربراہ تھے۔ پرویز مشرف نے ایک مشترکہ سیاسی محاذ تشکیل دینے کا فرض انھیں سونپ رکھا تھا۔ (میری حمایت انھیں درکار تھی، ان کے بقول عیار سیاستدانوں سے نجات پانے کے لیے)۔ مشرف کے عہدۂ صدارت کو قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے 2002ء کے موسم بہار میں ریفرنڈم ہوا۔ اس کے فوراً بعد انھوں نے مجھے ملاقات کی دعوت دی۔ اب انھوں نے مجھے ایک ''عظیم قومی اتحاد'' کے بارے میں بتایا جو وہ تشکیل دینے کے آرزومند تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ جنرل احتشام ضمیر نے اپنے اندازوں سے مجھے آگاہ کیا۔ موسم بہار کے الیکشن میں کس پارٹی کو کتنی سیٹیں ملیں گی۔ میں نے پوچھا ''وہ بدعنوان سیاست دانوں سے نجات کا منصوبہ کیا ہوا؟ اس بارے میں اب کیا حکمت عملی ہو گی؟'' احتشام ضمیر نے سچ اگل دیا۔ بولے، ''بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان کے عوام کرپٹ لیڈروں کو ہی ووٹ دیتے ہیں۔'' اب مجھے پتا چلا کہ ہمیں سبز باغ دکھایا گیا۔ وقتی اور ادنیٰ، بہت ہی معمولی اور ذاتی فائدے کے لیے ملک کے دیرپا مفاد کو قربان کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ یہ مشرف کا فیصلہ تھا اور ملک کی سب سے اہم خفیہ ایجنسی اس مقصد کے لیے استعمال کی جا رہی تھی۔ یہی ان کی روایت تھی۔ طویل المیعاد تجزیے کی بجائے سطحی اور وقتی مقاصد کے لیے وہ ہر اقدام کرتے رہے جو ملک کے لیے تباہ کن ثابت ہوئے۔ دنیا بھر میں بہت سی دوسری خفیہ ایجنسیاں بھی اسی طرح جھک مارتی ہیں۔ مثال کے طور پر سی آئی اے، جس نے گھٹیا مفادات کے لیے دنیا کے کتنے ہی ممالک میں انتشار پھیلایا۔ آئی ایس آئی کے ساتھ پہلی بار مجھے واسطہ پڑا تھا۔ میں نے یہ سیکھا کہ کبھی کسی حال میں بھی ان لوگوں کو اپنے فیصلوں پر اثرانداز ہونے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔
پرویز مشرف کے ساتھ میری پانچویں اور آخری ملاقات 23 جولائی 2002ء کو ایوان صدر اسلام آباد میں ہوئی۔ اسی نے مجھے مدعو کیا تھا۔ میں یہ عزم لے کر گیا کہ اسے سیاسی ٹھگوں کا

ایک متحد ٹولہ جسے انگریزی میں Coalition of Crooks کہتے ہیں، بنانے سے باز رکھ سکوں۔ اب اس ملاقات میں پوری طرح مجھے اندازہ ہوا کہ ہم نے کتنا بڑا دھوکا کھایا ہے۔ ہم سے میری مراد، بشمول میرے وہ تمام لوگ ہیں جنھوں نے ابتدا میں اُس کے اس وعدے پر اعتبار کرلیا تھا کہ وہ سیاست کی تمام گندگی کو صاف کردے گا۔ اس ملاقات میں میرے علاوہ، مشرف کے نیشنل سکیورٹی ایڈوائزر طارق عزیز اور احتشام ضمیر بھی موجود تھے۔ ابتدا میں ماحول خوش گوار تھا۔ پھر انھوں نے کہا وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے مجوزہ اتحاد کا حصہ بن جاؤں۔ یہ بھی کہا کہ مجھے وہ ملک کا واحد صاف ستھرا سیاست دان سمجھتے ہیں۔ جب انھوں نے بتایا کہ ان کے اتحاد میں کون کون سے زعما شامل ہوں گے، تو مجھے جھٹکا لگا۔ دنیا گھومتی ہوئی نظر آئی۔ جن لیڈروں کا نام اُس نے لیا ان میں سے بعض کے جرائم مسلمہ اور اسی بنا پر وہ مشہور ومعروف تھے۔ پرویز مشرف سے میں نے کہا ''جی نہیں! میں کیسے شامل ہوسکتا ہوں؟ میں اپنا سب اعتبار اور ساری عزت داؤ پر کیسے لگا دوں؟ اپنی ساکھ برباد کیوں کروں؟ میرا بنیادی نعرہ ہی کرپشن کا خاتمہ ہے۔'' اس نے کہا ''ایسی صورت میں تم ہار جاؤ گے۔'' میں نے کہا ''جی بہت اچھا! اپنا اعتبار کھودینے کی بجائے شکست مجھے گوارا ہے۔ سیاست میں آنے سے پہلے بینظیر بھٹو اور نواز شریف سے میرے ذاتی تعلقات تھے۔ ان کی مخالفت میں نے اسی لیے تو کی کہ وہ بدعنوان تھے۔ کم از کم وہ کچھ مقبولیت تو رکھتے ہیں، جن بدعنوان سیاستدانوں کو آپ متحد کرنے اور ساتھ لے کر چلنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ چور بھی ہیں اور نامقبول بھی'' فوجی حکمران کو میں نے متنبہ کیا کہ ان لوگوں سے وہ جا ملا تو اس کا فائدہ بےنظیر اور نواز شریف کو پہنچے گا۔ بے شک لوگ بدعنوانی کے سبب ان سے ناراض ہیں لیکن جب وہ مجسم گمراہ لوگوں کو ساتھ لے کر چلیں گے تو عوام یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ ساری پارٹیاں ہی کرپٹ ہیں۔ اس طرح میدان ایک بار پھر نواز شریف اور بینظیر کے لیے ہموار ہوجائے گا۔ مشرف نے جواب میں وہی جملہ دہرایا جو میں احتشام ضمیر سے

سن چکا تھا ''بدقسمتی سے لوگ بددیانت سیاستدانوں کو ہی چنتے ہیں۔'' مجھے اس نے نصیحت کی کہ میں خوابوں کا اسیر نہ رہوں۔ مجھے عملیت پسند ہوجانا چاہیے۔ میں نے کہا کہ انھیں ملک کو ایک طاقت ور عدلیہ دینا چاہیے تھی، ایک آزاد الیکشن کمیشن اور احتساب کا قابل اعتبار نظام۔ اس اہتمام کے بعد اگر وہ شفاف الیکشن کرا دیتے تو قائداعظم کے بعد ان کی سب سے زیادہ ستائش کی جاتی۔ جواب میں اس نے کہا ''اس میں خطرات پوشیدہ ہیں۔'' خطرہ پاکستان کو نہیں جنرل کی اپنی ذات کو تھا۔ اس عظیم نقصان کی اسے کوئی پروا نہیں تھی جو بدعنوان سیاستدانوں کے اتحاد سے ملک کو پہنچتا۔ وہ ایک احمقانہ خیال میں مبتلا تھا کہ جب تک اختیار اس کے ہاتھ میں ہے، وہ ہر چیز پہ قابو پا سکتا ہے۔ ان دنوں میں یہ سوچتا تھا کہ مشرف کو ان کے قریبی ساتھی طارق عزیز الٹے سیدھے مشورے دیتے ہیں مگر بعد میں یہ احساس ہوا کہ ایسے مشیر وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے آقا سننا چاہتے ہیں۔ سچائی، سیاسی تدبّر سے کیا غرض جب مقصد محض اقتدار بچانا اور برقرار رکھنا ہو۔ پرویز مشرف سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ اب ہمارے راستے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ بعد میں لوگ طرح طرح کی کہانیاں گھڑتے رہے۔ برسوں بعد تک یہ کہتے رہے کہ میں پھر ان سے اتحاد بنا لوں گا۔ آنے والے برسوں میں بعض ''باخبر'' صحافیوں نے یہ بھی لکھا کہ میری بیرون ملک اس سے خفیہ ملاقاتیں ہوئیں اور یہ کہ ایک بار پھر ہم اکٹھے مل کر کام کریں گے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ یہ کیوں کہتے تھے۔ کیا یہ کردارکشی کی دانستہ اور مربوط کوشش تھی یا مخالفین کی پھیلائی افواہوں پر انھوں نے یقین کرلیا تھا۔ کچھ بھی ہو، میرا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ہم پھر کبھی نہ ملے اور میرا نہیں خیال کہ کبھی ملیں گے۔ جہاں تک بے بنیاد پراپیگنڈے کا تعلق ہے، وقت گزرنے کے ساتھ وہ اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ چیخ چیخ کر تردید کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ میرے بعض دوست اس بارے میں خواہ مخواہ پریشان ہوتے رہتے ہیں۔

مشرف کے اتحاد میں شمولیت سے انکار پر میری پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی۔ ماضی میں اس کے ساتھ میرے کچھ مراسم ضرور رہے تھے لہٰذا ہمیں مشرف کا طرف دار سمجھا جاتا۔ ہمیں اپوزیشن تصور نہ کیا جاتا لیکن اب ہم اسٹیبلشمنٹ کے خلاف کھڑے تھے۔ حکومت مخالفت پر تلی تو نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے اچھے امیدواروں نے پارٹی چھوڑ دی۔ جو بچ گئے انھیں آئی ایس آئی نے آ گھیرا۔ اس کے ایجنٹوں نے تحریک انصاف کے مؤثر امیدواروں پر تحریص کا ہر حربہ استعمال کیا۔ کچھ نے ہمت ہار دی اور مجھ سے کہا کہ وہ فوج اور خفیہ ایجنسی سے نہیں لڑ سکتے۔ کچھ خاموش رہے، کچھ لالچ دے کر قاف لیگ کا حصہ بنا لیے گئے۔ ان کے دلائل دلچسپ مگر بعض اعتبار سے درست تھے۔ انھوں نے کہا الیکشن لڑنے کے لیے روپے کی ضرورت ہوتی ہے، دیہی علاقے میں کم از کم ایک کروڑ روپے۔ اپنا پیسہ، توانائی اور وقت وہ کیوں برباد کریں۔ ان کا انداز فکر یہ تھا کہ ملکی تاریخ میں آج تک کوئی پارٹی اسٹیبلشمنٹ کو پچھاڑ نہیں سکی۔

اکتوبر 2002ء کے بعد میری پارٹی اپنی زندگی کے مشکل ترین دور سے گزری۔ 1997ء میں بدترین شکست کے بعد حالات مشکل تھے لیکن 2002ء کے بعد کا دور سب سے زیادہ تباہ کن۔ میں صرف ایک سیٹ جیت سکا جب کہ پوری پارٹی انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو گئی۔ اب ہمیں صرف یہ کرنا تھا کہ کسی نہ کسی طرح خود کو بچا لیں۔ برقرار رہ سکیں تو نمو کا امکان بھی ہوگا اور آگے بڑھنے کے مواقع بھی۔ یہ ایسا تھا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا آدمی اپنا سر پانی سے باہر رکھنے کی تگ و دو میں لگا ہو۔ اس بارے میں مجھے ہرگز کوئی شبہ نہیں کہ اگر تمام رکاوٹوں کے باوجود میں اپنی سیٹ نہ جیت پاتا تو میری پارٹی کا کام تمام ہو گیا ہوتا۔ پوری سرکاری مشینری میرے خلاف سرگرم عمل تھی۔ ذاتی طور پر جنرل پرویز مشرف اور ان کے مشیر، پنجاب کا گورنر، میرے علاقے کا کور کمانڈر، علاقے میں تمام جاگیردار اور ان میں ایک ملک کا سب سے بڑا ٹرانسپورٹر تھا۔ ایک صاحب، منشیات کے کاروبار میں ملوث بتائے جاتے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ نقد

رقوم کے انبار پر بیٹھے ہیں۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ اس کے باوجود پانچ ہزار ووٹوں کی برتری سے میں جیت گیا جو ایک ریکارڈ تھا۔ پولنگ ختم ہونے کے فوراً بعد میں اسلام آباد روانہ ہو گیا کہ پانچ ماہ تک بیوی بچوں سے دور رہا تھا۔ ایک ہی نشست تھی لیکن اس کا مطلب یہ تھا کہ کم از کم میری جماعت اب زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ زمانہ صبر آزما بہت تھا۔ پارٹی کے بمشکل 20 عہدہ داران متحرک تھے اور حرکت میں رکھنے کے لیے انھیں بھی ترغیب دینا پڑتی۔ باقیوں میں سے کچھ نے جماعت کو الوداع کہا اور باقی چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ اس کڑے وقت کا ایک مثبت پہلو ہے۔ پتا چلا کہ میرے سچے ساتھی کون ہیں۔ بحران ہی میں آدمی کی قدر و قیمت اور اصل شخصیت کا علم ہوتا ہے۔ تمام اچھے برے حالات میں پوری مضبوطی کے ساتھ میرے ہمراہ کھڑے رہنے والوں میں ایک سیف اللہ نیازی تھا۔ وہ آدمی، کہر اور دھوپ کے سب موسموں میں اپنا سارا وقت جس نے پارٹی کو دیا۔ اب تک شادی تک نہیں کی۔ اس کے علاوہ راشد خان بھی۔ ایک سال کے اندر اندر ہم نے پارٹی کے وہ قرض چکا دیے جو اس دوران لیے تھے۔ وسائل کے فقدان نے مجبور کیا کہ ہم اسلام آباد میں اپنا مرکزی دفتر خالی کر دیں۔ ہم میز کرسیاں اٹھا کر میرے ذاتی دفتر میں لے گئے جو رکن اسمبلی کے طور پر ملا تھا۔ آخری قرضہ عجیب طور سے ادا ہوا میں اپنے خاندان کے ساتھ انگلینڈ میں تھا۔ میرا برادر نسبتی بین گولڈ سمتھ (Ben Goldsmith) بار بار مجھ سے پوچھتا: انگلینڈ اور جنوبی افریقہ کے درمیان جاری میچ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کی غیر معمولی دلچسپی کا سبب کیا ہے۔ مقابلے پر اس نے شرط لگا رکھی تھی۔ پوچھا تو اس نے بتایا کہ دس ہزار پاؤنڈ وہ ہار چکا ہے۔ میں نے کہا میں اس کی مدد کی خاطر میچ دیکھنے کے لیے تیار ہوں۔ شرط یہ ہے کہ ہارے ہوئے دس ہزار پاؤنڈ واپس مل جانے کے بعد جو بھی اضافی رقم ہوگی وہ میری پارٹی کا قرض اتارنے کے کام آئے گی۔ میں ان کھلاڑیوں میں سے ایک ہوں جن پر کبھی کسی بدعنوانی کا الزام نہ لگا۔ ماہرین نے جب کبھی

کرکٹ کی پوری تاریخ کے کھلاڑیوں پر مشتمل تصوراتی ٹیم (Dream Team) بنائی، اکثر مجھے ہی اس کا کپتان چنا گیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی مجھ پر میچ فکسنگ کی پھبتی تک نہ کسی گئی تھی۔ ویسے بھی برطانیہ میں شرط کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ یہ بازار حصص میں سرمایہ کاری کے مترادف ہے۔ فقط روپے سے نہیں آپ مہارت سے جیتتے اور عدم مہارت سے ہارتے ہیں۔ پھر میں نے تو شرط پر ایک پاؤنڈ بھی لگایا نہ تھا۔ فقط میں اسے بتاتا رہا کہ کس وقت اسے کیا کرنا ہے۔ بہر حال بین کی ہاری ہوئی رقم اسے واپس مل گئی۔ ایک موقع پر بکی نے اس سے کہا ''مسٹر گولڈسمتھ، لگتا ہے تم اپنے بہنوئی کے ساتھ بیٹھے ہو۔'' چند ماہ قبل اس کتاب کا انگریزی ایڈیشن چھپا تو میرے محترم اور معزز سیاسی مخالفین نے میرے خلاف اس واقعہ کو جواز بنا کر پروپیگنڈے کی نئی مہم شروع کی۔ ان کے کارندہ اخبار نویسوں نے مجھے بتایا کہ شرطیں لگانا کتنا بڑا جرم ہے۔ میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔ ماننی ہی چاہیے، غلطی بہر حال غلطی ہی ہوا کرتی ہے لیکن کیا ان میں سے کبھی کسی کو خیال آیا کہ ان کے آقاؤں نے ملک کے اربوں روپے لوٹ لیے اور کبھی اس پر شرمندہ نہ ہوئے، حتیٰ کہ ان کے مداح بھی نہیں۔

اگلے چند ماہ پارٹی انتہائی معمولی بجٹ کے ساتھ کام کرتی رہی۔ ہارنے والوں کو چندہ کون دیتا ہے؟ ساڑھے تین برس تک پارٹی کو بقا کی جنگ لڑنا پڑی لیکن پھر ٹی وی پر حالات حاضرہ کے پروگراموں سے راستہ ہموار ہونے لگا۔ میں کثرت سے ان میں مدعو کیا جاتا اور ہر موضوع پر اپنا واضح مؤقف پیش کرتا۔ میں نے کوشش کی کہ ہر موضوع پر دوٹوک رائے دوں۔ خاص طور پر دہشت گردی کے خلاف جنگ، جس نے پاکستانی عوام کو تباہ کیا اور اشرافیہ کو فائدہ پہنچایا۔

مارچ 2007ء سے چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی برطرفی کے خلاف عوام میں جدوجہد کا نیا دور شروع ہوا تو تحریک انصاف پیش پیش تھی۔ اب ان نئے عوامل نے عام لوگوں کو پارٹی کی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔ ماضی کے زخم مندمل ہونے لگے۔

میرا تجزیہ ہے کہ 2002ء کا الیکشن اگرچہ مشرف کی پارٹی نے جیت لیا مگر اس کے ساتھ ہی اس کے زوال کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس نے اپنی پارٹی، قاف لیگ کو بہر صورت کامیاب بنانے کے لیے حزب اختلاف کو تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے متحدہ مجلس عمل کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی۔ یہ منصوبہ اس کے لیے مصیبت بن گیا۔ قبائلی علاقوں پر امریکی بمباری کا ردعمل شدید تھا۔ ساری پشتون پٹی برہم اور مشتعل تھی انھوں نے متحدہ مجلس عمل کو ووٹ دیا۔ میں بھی سرحد کے دو انتخابی حلقوں میں اپنے امیدواروں کی انتخابی مہم چلا رہا تھا لیکن معلوم ہوا کہ پشتون طالبان کی ہمدردی میں ووٹ متحدہ مجلس عمل کو ملیں گے۔ پاکستانی پختون سرحد کے اس طرف سفاک امریکی فوج سے نبرد آزما طالبان کو اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ متحدہ مجلس عمل کی چونکا دینے والی فتح نے نہایت احتیاط سے بنائے گئے منصوبے کے تار و پود بکھیر دیے۔ پس پردہ مشرف کے لیے الیکشن کا منظر نامہ تشکیل دینے والی انٹیلی جنس ایجنسیوں کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی۔ الیکشن کے بعد مشرف کو اپنا وزیراعظم بنانے کے لیے سیاسی جوڑ توڑ کا آغاز کرنا پڑا۔ وہ اب، کرپشن کے خلاف اظہار عزم جو اس کا واحد مثبت نکتہ تھا کے باوجود کرپٹ سیاستدانوں کے رحم و کرم پر تھا۔ اب انھیں رشوت دینا تھی یا بلیک میلنگ کے ذریعے اپنی حمایت پر آمادہ کرنا تھا۔ بدعنوان بھی کم کائیاں نہیں ہوتے۔ انھوں نے اپنے خلاف مقدمات ختم کرائے اور پھر احسان جتلا کر وزارتوں کے حلف اٹھائے۔ دونوں ایک دوسرے کی مجبوری تھے۔ ایک گروہ احتساب سے خوفزدہ، دوسری ذات شریف اقتدار کے لالچ میں اندھی۔

بڑے سے بڑے آمر کے اختیار اور قوت کی ایک حد ہوتی ہے۔ مشرف کے معاملے میں چیلنج عدلیہ کی طرف سے اچانک سامنے آیا۔ وہی عدلیہ جس کی اہمیت کو، اقتدار کے اوائل میں اس نے نظر انداز کیے رکھا۔ 2006ء کے آخری دنوں میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری اور بنچ میں ان کے شریک ججوں نے پاکستان سٹیل ملز کی نجکاری منسوخ کر دی۔ انھوں نے اس فیصلے

کو جلد بازی کا ناتراشیدہ اقدام کہا۔ انھوں نے بعض لوگوں کے اچانک غائب ہو جانے کے
واقعات کی تفتیش کا حکم بھی دیا۔ مشرف کو احساس ہوا کہ چیف جسٹس نے کچھ زیادہ ہی آزاد روی
اختیار کر لی ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ غائب کیے گئے لوگوں کو فوج اور خفیہ ایجنسیوں نے چھپا رکھا
ہے۔ مشرف کو اب اس خوف نے آلیا کہ ممکن ہے چیف جسٹس انھیں صدارتی انتخاب لڑنے کے
لیے درکار آئینی تبدیلیوں کی اجازت نہ دیں کیوں کہ فوج کے سربراہ کی حیثیت سے وہ ایک
سرکاری ملازم تھے اور سرکاری ملازم الیکشن نہیں لڑ سکتا۔ 9 مارچ 2007ء کو اختیارات کے ناجائز
استعمال کا الزام لگا کر چیف جسٹس کو معطل کر دیا گیا۔ کسی کو اندازہ نہ تھا کہ عوامی ردعمل کتنا شدید
ہوگا۔ شاید جنرل محمد ضیاء الحق کے دور حکومت میں یہی واقعہ خاموشی سے گزر گیا ہوتا۔ گھروں کی
تنہائی میں لوگ روتے پیٹتے مگر خود ترحمی کا شکار ہو کر چپ رہتے لیکن اب آزاد ٹی وی چینلز موجود
تھے۔ آزاد پریس عوامی جذبات کو نظر انداز نہیں کر سکتا؛ چنانچہ عوامی ردِعمل کی گونج، پورے زور و
شور سے پل پل ملک کے ایک ایک گھر میں پہنچنے لگی۔ ستم ظریفی یہ کہ مشرف ہی نے آزاد
الیکٹرانک میڈیا کی ابتدا کی تھی۔ شروع میں فائدہ اسے بھی پہنچا پھر یہ کہ اس کے ذریعے عوامی
جذبات کی بھاپ نکلتی رہتی تھی۔ لیکن اب اس کی مقبولیت برائے نام رہ گئی تھی۔ متحرک میڈیا اس
کا ساتھ کیونکر دیتا؟ ترقی پذیر ممالک اس لیے دلدل میں پھنسے رہتے ہیں کیونکہ حکومت عدلیہ کو
جواب دہ نہیں ہوتی۔ اب یہ احساس اور شعور عام ہونے لگا کہ کرپٹ حکومت کبھی آزاد عدلیہ کی
متحمل نہیں ہوتی۔ اب تک جمہوری حکومتوں نے بھی عدلیہ کو پھولنے پھلنے کی آزادی عطا نہ کی
تھی۔ بھٹو سے لے کر ان کی بیٹی بے نظیر اور بے نظیر سے لے کر نواز شریف تک یہی شعار تھا۔
نواز شریف کے لوگوں نے تو سپریم کورٹ پر ہلّہ بھی بول دیا تھا۔ مشرف نے عدلیہ پر یلغار کی تو
ایک المناک واقعہ پیش آیا۔ اپنی برطرفی کے خلاف دائر کردہ مقدمے کی سماعت کے لیے اپنے
گھر سے چند سو گز کے فاصلے پر چیف جسٹس نے عدالت کا رخ کیا تو پولیس نے ان کا راستہ

روکا۔ عدالت عظمیٰ کے سامنے مشتعل مظاہرین جمع تھے۔ چیف جسٹس پیدل چل کر وہاں جانے
کے آرزومند تھے۔ پولیس انھیں گاڑی میں سوار کرنے پر مصر تھی۔ وہ ڈٹے رہے تو ایک پولیس
افسر نے سر کے بالوں سے پکڑ کر انھیں کھینچا۔ کم از کم اخبار میں شائع ہونے والی تصویر میں یہی
نظر آیا۔ ان کے ساتھ ناروا سلوک کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ احتجاج کا سلسلہ
شروع ہوا اور نہایت تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا۔ چیف جسٹس نے عہدہ چھوڑنے سے انکار کر
دیا۔ اب نہایت منظم وکلاء کے علاوہ جن کی قیادت میں، میری پارٹی کے نائب صدر حامد خان
نمایاں تھے، میڈیا اور حزب اختلاف کی پارٹیاں میدان میں نکل آئیں، پوری قوت اور پوری
شدت کے ساتھ۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وکلاء برادری ایک مقصد کے لیے پوری طرح متحد،
سڑکوں پر کھڑی تھی۔ عوام کی مکمل حمایت انھیں حاصل تھی۔ اب وہ مشرف کے اقتدار کا خاتمہ
چاہتے تھے اور اس سے کم کسی چیز پر راضی نہیں تھے۔ صورت حال نے ایک آئینی بحران پیدا کر
دیا۔ چیف جسٹس صرف عام شہری کے حقوق کا محافظ نہیں بلکہ تمام اداروں اور آئین کا نگران بھی
تھا۔ اگر ریاست انہی کے ساتھ بدسلوکی پر اتر آئی ہے تو مجبور اور کمزور شہریوں کا تحفظ کیسے کرے
گی؟ یہ سوال اب ہر ذہن میں گونج رہا تھا۔

وکلاء تحریک ایک عظیم تاریخی پیش رفت تھی۔ امید کی کرن اس ایک نکتے میں پوشیدہ تھی
کہ وہ کسی خاص مذہبی یا سیاسی پارٹی سے وابستہ نہ تھے۔ پوری سول سوسائٹی ان کی پشت پر
آ کھڑی ہوئی۔ پرویز مشرف سمجھ ہی نہ پایا کہ آزاد میڈیا نے عام آدمی کو کتنا گہرا سیاسی شعور بخش
دیا ہے۔ بعد میں بینظیر بھٹو اور نواز شریف بھی یہ ادراک نہ کر سکے۔ میری پارٹی کو اس نئی صورت
حال سے بہت فائدہ پہنچا۔ سوکھے دھانوں پر ابر اس لیے برسا کہ مدتوں سے صرف ہم آزاد
عدلیہ کا مطالبہ کرتے آئے تھے۔ 1996ء میں تحریک انصاف وجود میں آئی تو خود مختار عدالتی
نظام ہمارا سب سے بڑا مطالبہ تھا۔ تب یہ کسی ویرانے میں ایک دیوانے کی صدا لگتی تھی۔ ٹی وی

مذاکروں سے ہر ایک کو فائدہ پہنچا ہو گا لیکن سب سے زیادہ میری پارٹی کو اس لیے کہ میڈیا، آزاد عدلیہ کا علم بردار بن کر ابھرا۔ اخبار نویسوں نے اس موضوع پر بہت غور و فکر کیا اور ایک بات قوم کو باور کرا دی کہ ترقی کے آرزومند معاشرے کو آزادی درکار ہوتی ہے اور عدلیہ ہی آزادی کی حفاظت کرتی ہے۔ حامد خان وکلاء تحریک کے سب سے بڑے ناموں میں تھے۔ وہ تحریک انصاف کے بانی ارکان میں سے ایک ہیں۔ پس پردہ وہی تحریک کی سب سے بڑی قوت تھے۔ اوّل منیر اے ملک، پھر اعتزاز احسن، جسٹس طارق محمود اور علی احمد کرد سمیت جانباز اور متحرک وکلاء لیڈروں کے ساتھ حامد خاں اہم لوگوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ تھے۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا اس تحریک میں، میں نے کیا۔ ہم نے پہلی پریس کانفرنس جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد کے ساتھ مل کر کی۔

اس تحریک کی روداد ہمیشہ دہرائی جاتی رہے گی۔ وہ شاندار مناظر جو ملکی تاریخ میں پہلی بار نظر آئے۔ ایسا اتحاد اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ولولہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ افتخار محمد چودھری دورے پر نکلتے تو سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے ہجوم ان کا استقبال کرتے۔ لوگ پھولوں کی پتیاں ان پر نچھاور کرتے اور کرتے ہی رہتے۔ پرویز مشرف کے خلاف نعرے لگائے جاتے۔ 8 مئی کی رات داتا دربار کے باہر شب بھر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جاگتا رہا۔ شام کو انہیں پہنچنا تھا لیکن کیسے وہ پہنچ پاتے۔ ہر جگہ لوگ انہیں روک لیتے۔ سبھی کو یاد ہے کہ اسلام آباد سے لاہور تک انہوں نے پانچ گھنٹے کا سفر پورے ایک دن اور رات میں طے کیا۔ اگلی صبح سات بجے وہ ہائیکورٹ پہنچے جہاں ججوں کی اکثریت نے ان کا خیر مقدم کیا۔

شب بھر داتا دربار کے باہر جہاں میں کھڑا تھا، اندرون لاہور سے ٹولیوں کی ٹولیاں آ کر مجھ سے ملتی رہیں۔ اس رات مجھے یہ احساس ہوا کہ ایک بے مثال تبدیلی ملک کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ جب سے میں سیاست میں آیا تھا، پہلی بار بیداری کی ایسی

لہر میں نے دیکھی تھی۔ اس صبح لاہور کے افق پر سورج طلوع ہوا تو دور کھڑے ایک شخص نے چیخ کر مجھ سے کہا ''عمران خان! نیا سورج نکل آیا ہے۔'' میں یہ بات عمر بھر کبھی نہ بھول سکوں گا۔ پاکستان واقعی بدل رہا تھا۔ افتخار چودھری کی عوامی مقبولیت نے مشرف کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ اس بوکھلاہٹ کا ثبوت چند روز بعد فوجی آمر نے چیف جسٹس کے دورۂ کراچی کے موقع پر فراہم کیا۔ وہ سندھ ہائیکورٹ سے خطاب کرنے والے تھے۔ اس موقع پر بے پناہ غنڈہ گردی کا مظاہرہ ہوا۔ مشرف کی حامی متحدہ قومی موومنٹ نے چیف جسٹس کے استقبال کے لیے باہر نکلنے والے لوگوں پر حملہ کر دیا۔ 39 لوگ جاں بحق اور 100 سے زیادہ زخمی ہو گئے۔ ایم کیو ایم تقسیم کے خونی منظروں میں بے گھر ہو کر پاکستان آنے والے مہاجرین کی آئندہ نسلوں کا تحفظ کرنے کے نام پر بنی تھی مگر اب یہ ایک دہشت گرد تنظیم کے طور پر جانی جا رہی تھی۔ ایم کیو ایم کے مسلح افراد نے چیف جسٹس کا استقبال کرنے کے لیے ائیرپورٹ جانے کے آرزومند سیاسی کارکنوں کے جلوس پر فائرنگ کی۔ ٹھیک اس وقت میں براہ راست نشر ہونے والے پروگرام ''کیپٹل ٹاک'' میں شریک تھا۔ سٹوڈیو میں ہم نے اسی وقت حملے کے مناظر دیکھے۔ ایم کیو ایم کے جھنڈے اٹھائے ہوئے لوگ ہجوم پر کلاشنکوف، رائفلوں سے آگ برسا رہے تھے۔ ٹی وی کے میزبان حضرات اس قدر خوفزدہ تھے کہ ایم کیو ایم کے کارکن بتانے کی بجائے وہ انھیں ''دہشت گرد'' کہہ رہے تھے۔ تحریک انصاف کے سیکرٹری جنرل عارف علوی نے فون پر مجھے بتایا کہ ہماری جماعت کے کارکنوں پر ایم کیو ایم نے دھاوا بولا ہے۔ اس نے بتایا کہ پولیس اور رینجرز کے لوگ اس قتلِ عام پر خاموش تماشائی بنے کھڑے رہے۔ زخمی ہونے والوں میں میری پارٹی کے دس کارکن شامل تھے۔ خوش قسمتی سے ان سب کی جان بچ گئی۔ ایک وقت وہ تھا کہ ایسا کوئی واقعہ شاید منظر عام پر آ ہی نہ سکتا۔ اب یہ ٹی وی پر براہ راست دکھایا جا رہا تھا۔

انسانی حقوق کی معتبر عالمی تنظیم ''ہیومن رائٹس واچ'' (Human Rights

Watch) نے حزب اختلاف کی گرفتاریوں پر جو افتخار محمد چودھری کے دورے کے دوران ہوئیں، پرویز مشرف حکومت کی پرزور مذمت کی۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ فوجی آمر نے جان بوجھ کر تشدد کو ہوا دی۔ معاملہ جب ہاتھ سے نکل گیا تو تشدد کے اس سلسلے کو خود حکومت بھی روک نہ سکی۔ پرویز مشرف کو لبرل کہلانے کا شوق بہت تھا لیکن اب اس کے دعوے کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ اس واقعے نے مجھے اس قدر غضب ناک کیا کہ میں نے الطاف حسین پر لندن میں مقدمہ دائر کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان میں اس پر مقدمہ چلانا تو ممکن ہی نہیں۔ لوگ اس پارٹی سے اتنے خوف زدہ ہیں کہ اس کے خلاف گواہی دینے پر شاید ہی کوئی آمادہ ہو۔ 12 مئی کو کراچی میں ہونے والی غارت گری پر سندھ ہائیکورٹ میں سماعت شروع ہوئی تو ایم کیو ایم کے حامیوں نے عدالت کو گھیر لیا۔ عدالتی کارروائی ملتوی کرنا پڑی۔ الطاف حسین کے خلاف عرق ریزی کے ساتھ ٹھوس ثبوتوں پر مبنی ایک فائل ہم نے مرتب کی۔ لندن پہنچ کر یہ فائل میں نے برطانوی پولیس سکاٹ لینڈ یارڈ (Scotland Yard) کے حوالے کر دی۔ مشکل یہ ہے کہ گواہ دہشت زدہ ہیں۔ اس قدر کہ وہ لندن میں بھی شہادت دینے پر راضی نہیں۔ ایک دشواری یہ ہے کہ برطانوی پولیس گواہوں کے بیانات قلمبند کیے بغیر قانونی طور پر معاملہ آگے نہیں بڑھا سکتی۔ پہلے پرویز مشرف اور اب آصف علی زرداری برطانوی پولیس کو ان ممکنہ گواہوں سے بات چیت کے لیے پاکستان آمد کی اجازت نہیں دیتے۔

شاندار عوامی تحریک کے نتیجے میں جسٹس افتخار چودھری بالآخر بحال ہو گئے۔ جنرل پرویز مشرف اب انتہائی کمزور تھے۔ اب ایک اور راستہ انھوں نے ڈھونڈ نکالا۔ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کی حکومت ضامن بنی اور بینظیر بھٹو کے ساتھ انھوں نے خفیہ سمجھوتا کرلیا۔ اس مفاہمت کے تحت بے نظیر کو وطن واپس آ کر الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت مل گئی۔ ایک عشرے سے وہ بیرون ملک تھیں نواز شریف کے دور سے کرپشن کے بہت سے مقدمات ان کے خلاف

چلے آ رہے تھے جو مشرف نے برقرار رکھے۔ ان کا سامنا کرنے کے لیے وہ تیار نہ تھیں۔ اب وہ لوٹ کے آ سکتی تھیں۔ بے نظیر نے اس بات سے اتفاق کر لیا کہ الیکشن جیتنے کے بعد وہ وزیراعظم اور مشرف ملک کے صدر ہوں گے۔ اسی مقصد کے لیے فوجی حکومت نے این آر او (NRO) متعارف کرایا۔ بے نظیر اور ان کے شوہر آصف علی زرداری پر قائم کرپشن کے تمام مقدمات واپس لے لیے گئے۔ بظاہر یہ خیال جنوبی افریقہ میں Truth and Reconciliation Initiative (اظہار صداقت اور قیام مفاہمت کے اقدام) سے مستعار تھا۔ این آر او کی روح مگر اس قانون سے مکمل طور پر مختلف تھی۔ جنوبی افریقہ میں یہ قدم دو متحارب فریقوں میں فاصلے مٹانے کی غرض سے اٹھایا گیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ این آر او نامی قانون کو سچائی سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہاں تو سچائی مان لی گئی اور اس کے بعد مفاہمت ہوئی۔ یہاں زرداری سمیت کسی شخص نے بھی اپنے جرم کا اعتراف نہ کیا۔ فقط ''مفاہمت'' کا لفظ برت کر یہ لوگ اس خیال کے دام میں آ گئے کہ وہ تمام الزامات سے بری ہو جائیں گے۔ کرپشن کی نذر ہونے والے اربوں روپے بھلا دیے گئے۔ بعد میں سپریم کورٹ نے اس واہیات قانون کو آئین سے متصادم قرار دے کر منسوخ کر دیا۔ اس کے باوجود یہ آرڈیننس تباہی لایا۔ آج بھی بہت سے مجرم اہم عہدوں پر فائز ہیں اور کرپشن، لوٹ مار میں بدل چکی ہے۔ عادی مجرم کو جب آپ یہ امکان فراہم کر دیتے ہیں کہ وہ بچ نکلے گا تو جرم کے سوا وہ کس چیز کی طرف مائل ہوگا۔ قانون کا خوف ہی روکتا ہے، صرف اس کا وجود ہی نہیں بلکہ اس کے نفاذ کا ڈر۔

پرویز مشرف کی ساکھ بحال نہ ہو سکی۔ عدلیہ سے لاحق خطرات بھی دور نہ ہوئے جو دوبارہ صدر منتخب ہونے کے منصوبے کو خاک میں ملا سکتی تھی۔ سب سے مقبول لیڈر بینظیر کے ساتھ سودابازی کے نتیجے میں مشرف کو تھوڑی سی مہلت ضرور مل گئی۔ اس طرح اگلی چال وہ چل سکا۔ صدارتی الیکشن اس نے جیت لیا لیکن قانون کی رو سے اس کی اہلیت اب بھی متنازعہ

رہی۔ 3 نومبر کو اس نے چیف جسٹس کو ایک بار پھر برطرف کر دیا، بعض دوسرے ججوں کو بھی نکال دیا۔ ہنگامی حالت کے نفاذ کا اعلان کر دیا اور میڈیا پر پابندیاں لگا دیں۔ یہی وہ موقع تھا جب میری گرفتاری کا فیصلہ ہوا۔

جیل سے انگریزی اخبار دی نیوز (The News) کے لیے اپنے ایک مضمون میں میں نے لکھا: مشرف مزید پانچ سالہ اقتدار کے لیے اب اصل اپوزیشن، وکلاء اور انسانی حقوق کے حقیقی پاسداروں پر چڑھ دوڑنے کی کوشش کریں گے۔ دو تین ہفتوں کے اندر پولیس کے ذریعے وہ پورے ملک کو خوف زدہ کرنے پر تلے تھے۔ ممتاز شخصیات کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ ہر سچی اور بیدار آواز کو خاموش کر دینے کے آرزومند تھے، جعلی ججوں کے ذریعے اپنی صدارت کی توثیق سے پہلے پہلے۔ 8 جنوری 2008ء کو وہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے خوف نے آلیا میں نے سوچا سیاست دانوں کی اکثریت بھی دل سے آزاد عدلیہ کو پسند نہیں کرتی وہ اپنی راہ بدل لیں گے۔ محض مقبول عوامی تحریک کی وجہ سے وہ اس مطالبہ کے حامی تھے۔ پرویز مشرف کی امید اس خیال سے وابستہ تھی کہ وہ ”دہشت گردی کی جنگ“ کا بہانہ بنا کر مخالفین کو کچل ڈالے گا۔ امریکہ اس کا مددگار ہوتا۔ عوامی تحریک اتنی طاقت ور تھی کہ سیاست دان خواہش کے باوجود اپنا قبلہ بدل نہ سکے۔ ہنگامی حالت نافذ کرنے کے چند ہفتے بعد جو نئے جج مقرر ہوئے، انھوں نے صدارت کے لیے مشرف کے راستے کی آخری رکاوٹ بھی دور کر دی تھی۔ اب اپنے وعدے کے مطابق آرمی چیف کا عہدہ اسے چھوڑنا پڑا۔ یوں اس نے ایک غیر فوجی صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اب صیاد خود اپنے دام میں تھا۔ اپنی صلاحیت کے بارے میں اس کے اندازے غلط تھے۔ اب یہ اس کے بس کی بات نہ رہی تھی حتیٰ کہ امریکہ، اس کا انکل سام، بھی اسے نہیں بچا سکتا تھا۔

باب ہشتم

یرغمال پاکستان

امریکہ پر القاعدہ کے حملوں کو 10 برس بیت چکے، 10 خونی برس۔ 9 ستمبر 2001ء کو نیویارک کے جڑواں میناروں "Twin Towers" پر حملے میں تین ہزار امریکی مارے گئے۔ عالم اسلام آج تک اس حادثے کی قیمت چکا رہا ہے۔ امریکی ردعمل کے نتیجے میں مسلمان ممالک میں جتنی بڑی تباہی اور جس قدر شدید جانی نقصان ہوا، واشنگٹن اور نیویارک میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ ہوا تھا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نتیجے میں جاں بحق ہونے والوں کی عظیم اکثریت کا نائن الیون حملوں سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ عراق پر امریکی قبضہ کی مہم کے دوران مرنے والوں کا اندازہ 10 لاکھ تک لگایا گیا۔ تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے، یہ تو مگر واضح ہے کہ لاکھوں بے گناہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اُن سے کہیں زیادہ زندگیاں زخم آلود ہو گئیں۔ 80 فیصد افغان شہریوں نے نائن الیون کے بارے میں سنا تک نہیں تھا لیکن پورے ایک عشرے سے وہ موت اور تباہی کا کھیل بھگت رہے ہیں۔

تجزیہ نگار فرخ سلیم کے مطابق 2003ء سے 2010ء کے دوران 33,467 پاکستانی

دہشت گردی کے واقعات میں شہید ہوئے۔ ابھی اور کتنے مسلمانوں کو اس حملے کی قیمت چکانا ہے؟ پاگل پن پر مبنی دہشت گردی کی جنگ میں عراق اور افغانستان کو برباد کر کے رکھ دیا گیا اور تیسرے مسلمان ملک پاکستان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ ہزاروں برس سے آباد دیہات اُجڑ گئے ہیں۔ بے شمار لوگ نئی طرح کی مشکل زندگی گزارنے کے لیے خیمہ بستیوں اور بڑے شہروں میں منتقل ہونے پر مجبور ہوئے۔ ان میں سے کچھ کبھی واپس نہ جاسکیں گے۔ فارن پالیسی میگزین کے مطابق، امریکی امداد کے باوجود یہ تینوں ممالک دس ناکام ریاستوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ تصویر کا دوسرا رُخ اُتنا ہی بھیانک ہے۔ امریکہ بہادر کے عوام کو بھی اس جنگ سے قطعاً کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ اُلٹا یہ نقصان ہوا کہ امریکہ سے نفرت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ امریکی شہری خود بھی یہ سمجھتے ہیں کہ 2001ء کے مقابلے میں اب وہ کہیں زیادہ غیر محفوظ ہیں۔ دوسری طرف انکل سام اگر معاشی زوال کا شکار ہے تو یہ 10 سالہ مہم جوئی اس کے بنیادی اسباب میں سے ایک ہے۔ جوزف ای سٹگلٹز (Joseph-e-Stiglitz) اور لنڈا جے بلمز (Linda-j-Bilmes) نے محض 2008ء تک صرف عراق میں فوجی کارروائیوں کے خرچ کا تخمینہ 3 کھرب ڈالر لگایا! 2010ء میں انہوں نے کہا کہ اصل اخراجات اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف مہم نے دنیا کی واحد عالمی طاقت کی ساکھ بہت بری طرح مجروح کر دی ہے۔ کسی قوم کے مہذب ہونے کا پیمانہ یہ ہوتا ہے کہ آزمائش کی گھڑی میں وہ کیسے کردار کا مظاہرہ کرتی ہے۔ امریکہ پہ برا وقت آیا تو وہ سُرخ رو ہونے میں مکمل طور پر ناکام ہوگیا۔ اس کی قیادت نے اپنی ہی اعلان کردہ اقدار اور اصولوں کو روند ڈالا۔ وہ اقدار اور اصول جو دنیا کے طول و عرض میں کئی نسلوں سے اس کی برتری کا سبب تھے۔ اُن کا دعویٰ یہ تھا کہ نوآبادیاتی طاقتوں کے برعکس وہ بنی نوع انسان کے لیے آزادی اور مساوات کے علم بردار ہیں۔ دنیا میں کتنے ہی لوگ کبھی دوسری سامراجی طاقتوں سے امریکہ کا موازنہ کرتے اور اسے داد دیا کرتے تھے۔ وہ

خود بھی اپنی تہذیب اور ماحول پر نازاں تھے۔ اسے وہ امریکی سپنا کہتے تھے، حیرت ہے کہ اب بھی کہتے ہیں۔ اُس وقت جب ہم اپنی آنکھوں سے انہی امریکیوں کے ہاتھوں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر ان اصولوں کو ہر روز قتل ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں دوسری جنگ عظیم کے بعد 3 کروڑ انسانوں کے قتل کی ذمہ دار نازی قیادت کو، عدالتی کارروائی کا حق دینا، امریکہ کی اخلاقی برتری کا نقطۂ عروج تھا۔ برطانوی وزیراعظم چرچل کا ارادہ تو وگرنہ یہ تھا کہ جرمن لیڈروں کو فوراً ہی موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ امریکی صدر روز ویلٹ اس بات پر مُصر رہا کہ مقدمہ چلایا جائے گا اور باقاعدہ۔ نیورمبرگ کے مقدمہ میں امریکہ کی جانب سے مقرر کردہ چیف پراسیکیوٹر جسٹس رابرٹ جیکسن نے کہا تھا ''معاہدوں کی خلاف ورزی اگر جرم ہے تو پھر جرمنی ہو یا امریکہ، دونوں کا جرم یکساں ہوگا۔ دوسروں کے جرائم پر کوئی قانونی کارروائی اُس وقت تک ہم کر نہیں سکتے جب تک ہم خود اس قانون کی پابندی نہیں کرتے۔'' جرم وسزا کے باب میں یہ رحم دلی، توازن اور انسانی اخلاق کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔ نائن الیون کے بعد مسلمانوں کو اتنا حق بھی نہ دیا گیا جو جرمنی کے مسلح قاتلوں کو ملا تھا۔ امریکہ اگر دہشت گردی کے ملزموں کو دشمن فوج کے جنگجو قرار دے کر خلیج گوانتانا مو میں پھینکنے کی بجائے اُن پر مقدمات چلاتا تو اُس کی اخلاقی ساکھ محفوظ رہتی۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر تب شائد مسلمان یہ سوچتے کہ وہ ننگی جارحیت اور پاگل پن پر مبنی ناانصافی کا شکار نہیں۔

امریکہ کا منہ کالا ہوگیا۔ صرف اس لیے نہیں کہ افغانستان اور عراق پر اس نے چڑھائی کی بلکہ اس لیے بھی کہ پاکستان کے شمال مغربی علاقوں پر بے رحمی سے ڈرون حملوں کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ صرف ابوغریب جیل اور خلیج گوانتانا مو میں جنگی کیمپوں کی تشکیل ہی نہیں، محض قیدیوں کو ایسے علاقوں میں منتقل کرنے سے نہیں جہاں قانون تشدد اور ایذا رسانی کو روکتا بلکہ اس لیے بھی کہ امریکی اب ''نا برسرِ جنگ'' (Enemy non-combatants) اور

مجبوری کے انسانی قتل (Collateral Damage) ایسی اصطلاحات برتنے لگے۔ اب یہ نیا امریکہ تھا۔ عراق پر حملے کے لیے اُس نے انتہائی خطرناک ہتھیاروں کی موجودگی اور القاعدہ سے عراق کے تعلقات کی کہانی گھڑی۔ اس منافقت اور بددیانتی نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو ششدر کر کے رکھ دیا۔ صدام حسین کا اسامہ بن لادن کی اسلامی بنیاد پرستی سے کیا تعلق تھا؟ اس کے علاوہ امریکہ، ایران عراق جنگ میں عراق کی پشت پناہی کرتا رہا تھا۔ اس بات کو لوگ کس طرح بھول جاتے کہ جو امریکہ عراق میں جمہوریت کے لیے بے تاب ہے، پچھلے کئی عشروں سے مشرقِ وسطیٰ میں آمروں اور بادشاہوں کی ڈٹ کر حمایت کرتا آیا ہے۔ کمیونزم سے تصادم کے ہنگام سرد جنگ کے دنوں سے امریکہ تیسری دنیا میں آمروں کی حمایت کے لیے، کمیونزم کے خطرے کا ڈھنڈورا پیٹتا آیا تھا۔ آج اسلامی بنیاد پرستی کا ہوّا کھڑا کیا جا رہا ہے۔ 9/11 کے بعد روس سے لے کر اسرائیل اور اسرائیل سے بھارت تک تمام حکومتوں نے آزادی کے لیے جنگ کرنے والوں کے خلاف وحشی پن کی انتہا کر دی۔ اب اُن کے پاس ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا بہانہ موجود تھا۔ کسی بھی مخالف آواز کو اندھی قوت کے ساتھ دبانے کی کوششوں نے انتہا پسندی ہی کو فروغ دیا ہے۔ 2011ء کے آغاز سے عرب دنیا میں پھیلنے والی بغاوت نے حکمرانوں کو غفلت کی حالت میں آلیا۔ تاریخ میں لازمی طور پر وہ ناپسندیدہ اور نامقبول حکمرانوں کے طور پر یاد رکھے جائیں گے۔ امریکہ کے پالے ہوئے حسنی مبارک کی تائید کے لیے امریکی ذرائع ابلاغ برسوں تک ''اسلامی خطرے'' کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے۔ پاکستان میں پرویز مشرف نے بھی یہی کیا۔ حسنی مبارک نے آخری دنوں میں امریکہ کو مداخلت پر آمادہ کرنے کے لیے یہاں تک کہہ دیا کہ مصر پر اسلامی انتہا پسندوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ دوسری طرف معمر قذافی لیبیا میں اُٹھنے والے طوفان کو بنیاد پرستوں اور القاعدہ کی کارستانی قرار دیتا رہا۔

معاملہ تو مختلف تھا۔ مصر اور تیونس میں مسلم عوام جمہوریت، قانون کی حکمرانی، روزگار

کے مساوی مواقع اور مساوات کے نعرے لے کر اُٹھے تھے۔ یہ مضحکہ آمیز مفروضہ پوری طرح پٹ چکا کہ اسلامی دنیا مغرب کو ماننے والے تھوڑے سے اعتدال پسندوں اور ایسی جاہل اکثریت پر مشتمل ہے، بنیاد پرست جسے ورغلانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ امریکہ کے پروردہ حکمران اور بادشاہ، ظاہر ہے کہ عوامی امنگوں کے ترجمان نہ تھے۔ مسلمان عوام تو ظاہر ہے یہ چاہتے ہیں کہ انہیں بھی یہ حقوق مل جائیں جو مغربی ممالک کے حامیوں کو کسی مطالبے کے بغیر حاصل ہیں۔

شاہ ایران، افغانستان کے حامد کرزئی، ہمارے مشرف اور زرداری بظاہر اپنی قوم کو غلام بنا کر امریکہ کو فائدہ پہنچاتے ہیں لیکن آخری تجزیے میں امریکی عوام کو اس سے نقصان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ امریکی اشاروں پر چلنے کی وجہ سے یہ حکمران عوام کی نظروں سے گر جاتے ہیں، اُن کا اعتبار جاتا رہتا ہے اور یوں ایک پوری قوم امریکہ سے نفرت کرنے لگتی ہے۔ امریکی مصنف مائیکل شیور (Michael Schewr) پاکستان اور افغانستان کے حوالے سے امریکی خارجہ پالیسی پر اپنی کتاب استعماری گھمنڈ (Imperial Hubris) میں لکھتا ہے ''صرف یہ سبق سیکھنا کافی نہیں کہ ہمارے مذموم مقاصد دوسرے لوگ پورے نہیں کر سکتے بلکہ وہ ہمیں خود بھی ایسا کرنے نہ دیں گے۔ اپنے مشکل کاموں اور خون خرابے کے لیے دوسروں پر انحصار کر کے ہم اتنے عادی ہو گئے کہ سچائی کو سمجھ نہیں سکتے۔ جنون کی حالت میں ہم اپنے کام ایسے لوگوں کو سونپ دیتے ہیں جو یا تو انہیں انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا پھر جان بوجھ کر کرتے ہی نہیں۔''

مسلمان ملکوں میں ان اداروں کے بارے میں شکوک وشبہات کی ایک فصل بارآور ہو چکی جو امریکی حملوں کو گھناؤنے ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم وہ ہیں 1961ء میں جن کا تعارف امریکی صدر آئزن ہاور نے انڈسٹریل ملٹری کمپلیکس نام سے کرایا تھا۔ ان کے علاوہ وہ لوگ جو نوقدامت پسند کہلاتے ہیں، انہی لوگوں نے ''نئی

امریکی صدی'' کا منصوبہ دیا تھا۔ ان کے سوا واشنگٹن کا ایک تھنک ٹینک جو یہ سمجھتا ہے کہ امریکی اصولوں کو پوری دنیا پر غالب ہونا چاہیے، اس مقصد کے لیے ان کے دانا اور دانشور مدت سے روز و شب مصروفِ عمل ہیں۔ نائن الیون کے حملوں نے نوقدامت پسندوں کو صدام حسین کے خاتمہ کا بہترین بہانہ فراہم کر دیا۔ یہ لوگ 1997ء سے ایسا کرنے کے آرزومند تھے۔ امریکہ میں چھپنے والی کئی تحقیقی رپورٹوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ عراق کا نائن الیون کے حملوں سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ اسرائیل نے نوقدامت پسندوں کا ساتھ دیا۔ وہ عراق کو اپنے اور تیل کی صنعت کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ ڈریک یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد اسماعیل حسین زادے نے جو امریکہ کی سیاست اور معیشت پر ایک مشہور کتاب کے مصنف ہیں کہا ''فوجیوں، صنعت کاروں، سکیورٹی اداروں اور مالیاتی امور کے ماہرین کا ایک مافیا، امریکہ پر قابض ہو چکا۔ ان کا مقصد پوری دنیا پر حتمی غلبہ حاصل کرنا ہے۔ اس ٹولے نے دنیا کو دشمن اور دوست میں تقسیم کر رکھا ہے۔ جارحیت اور جنگوں سے جیبیں بھرنے والا یہ گروہ، دو مختلف فریقوں کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ عسکریت کا راستہ اختیار کریں۔ نتیجہ مزید عسکریت اور آمرانہ طرزِ حکومت کی صورت نکلتا ہے۔''

امریکہ پوری دنیا کو عسکریت کی راہ پر ڈال رہا ہے۔ اس سب کے پیچھے جنگ کے ذریعے منافع کمانے والا گروہ ہے۔ نہ صرف وہ دنیا کے مختلف ممالک میں قومی وسائل کی بربادی کا باعث ہے بلکہ ان کے قرضوں میں روز افزوں اضافے کا موجب بھی بنتا ہے۔ یہی قوتیں مختلف انداز میں شکوک اور مزید تنازعات جنم دینے میں کوشاں رہتی ہیں۔ نائن الیون کے واقعہ پر امریکی ردعمل بڑی حد تک احساسِ شکست سے پھوٹا۔ اس معاملے میں کئی غلطیاں اس نے کیں۔ ایک بڑی غلطی یہ تھی کہ امریکہ طالبان اور القاعدہ میں امتیاز نہ کر سکا۔ طالبان فقط مقامی سطح پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے، قدیم نظریات کے حامل لوگ، جب کہ القاعدہ

ایک بین الاقوامی تنظیم ہے جو پوری دنیا میں امریکی مفادات کو نشانہ بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ طالبان ان مجاہدین کا حصہ ہیں جنہوں نے سوویت فوجوں سے ٹکر لی تھی۔ سوویت فوج نکل جانے کے بعد جو حکومتیں بنی، وہ امن و امان کے قیام اور تباہ حال افغانستان کی بحالی میں ناکام رہیں۔ طالبان ردِعمل میں ابھرے۔ پاکستان میں طالبان حکومت کے سفیر ملا ضعیف نے اپنی کتاب ''طالبان کے ساتھ زندگی'' (Living with the Taliban) میں انتشار اور بدنظمی کی وہ کیفیت بیان کی ہے جو طالبان سے پہلے تھی۔ جنگی سردار افغانستان پر بے رحمی سے اور ظلم سے حکومت کرتے۔ اسی پس منظر میں طالبان اُبھر کر سامنے آئے۔ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کہیں طالبان طرز کی مذہبی حکومت بنی۔ ملا ضعیف کے مطابق ملا عمر نے اُن سے درخواست کی تھی کہ کارِ سرکار میں وہ ان کی مدد کریں۔ طالبان کو معلوم نہ تھا کہ ریاست کو کیسے چلایا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو جنگ کے میدان میں پل کر جوان ہوئے تھے۔ سولہ برس تک انہوں نے صرف جنگ دیکھی تھی۔ افغانستان میں ہر طرف افراتفری تھی۔ ملا ضعیف کو مختلف وزارتوں کی ذمہ داریاں سونپی جاتی رہیں۔ طالبان میں ایسے پڑھے لکھے افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی جو حکومت چلانے کے قابل ہوتے۔ امریکہ طالبان پر الزام عائد کرتا ہے کہ انہوں نے القاعدہ کو پناہ دی۔ یہ بات درست نہیں۔ اُسامہ بن لادن اور اس کی تنظیم طالبان کو ورثے میں ملی تھی۔ طالبان برسرِ اقتدار آئے تو القاعدہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔ مزید برآں کئی بار طالبان نے امریکہ سے معاملہ کرنا چاہا۔ ہر بار یہ پیش کش اس نے مسترد کر دی۔ 1998ء میں کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں میں بم دھماکوں کے بعد امریکہ افغانستان پر بن لادن کو اپنے سپرد کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہا تھا۔ افغان حکومت نے پیشکش کی کہ اسامہ پر افغان سپریم کورٹ میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے یا پھر تین اسلامی ملکوں کے ججوں پر مشتمل عدالت جو کسی چوتھے مسلمان ملک میں قائم ہو۔ امریکہ نے اِس پیشکش کو رد کر دیا۔ وہ اس بات پر اڑا رہا کہ اُسامہ کو غیر مشروط طور پر اس کے حوالے کیا جائے۔

ملا ضعیف کا دعویٰ ہے کہ امریکی اُسامہ پر ہیگ کی عالمی عدالت میں مقدمہ چلانے سے بھی گریز کرتے۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ ملا عمر نے نائن الیون حملوں کے چند روز بعد آمادگی ظاہر کی تھی کہ اگر افغانستان نہیں تو کسی بھی مسلمان ملک کی عدالت میں اسامہ پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ ملا عمر اس بات پر زور دیتے رہے کہ مقدمہ چلانے کے لیے اُسامہ کے ملوث ہونے کی ابتدائی شہادت پیش کی جائے۔ ظاہر ہے کہ ہر طرح سے یہ ایک معقول شرط تھی۔ 2003ء میں روس نے دہشت گردی کے الزامات لگا کر برطانیہ سے باغی چیچن لیڈر احمد زالیف کو مانگا۔ برطانیہ نے بھی یہی کہا تھا کہ روس اپنا دعویٰ عدالت میں ثابت کرے۔ برطانوی عدالت نے ناکافی شہادتوں کی بنیاد پر روسی درخواست مسترد کردی۔ بش افغانستان پر چڑھائی کے لیے تلا بیٹھا تھا۔ جنگ ہمیشہ آخری تدبیر ہوتی ہے۔ نائن الیون حملوں کے بعد امریکہ نے اسے اولین اور واحد راستے کے طور پر استعمال کیا۔ اول روز سے امریکہ نے ممکنہ دہشت گردوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے دانستہ معروف اور مسلمہ اصولوں سے انحراف کیا۔

بین الاقوامی اصولوں سے انحراف کے باعث امریکہ مسلم دنیا کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ عالم اسلام ملوث افراد کو قرار واقعی سزا دلانے کے لیے تعاون پر آمادہ تھا۔ میں اس بات کا گواہ ہوں۔ پاکستان میں کروڑوں لوگوں نے، ٹی وی سکرین پر جلتے جڑواں میناروں "Twin Towers" سے بے گناہ لوگوں کو موت کی طرف چھلانگیں لگاتے دیکھا۔ ان سب کے دلوں میں امریکہ کے لیے ہمدردی کے جذبات تھے۔ امریکی صدر بش نے اس طرح دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا اعلان کیا گویا کسی روایتی فوج سے مقابلہ درپیش ہو۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان دہشت گردوں سے عام مجرموں کی طرح نمٹنے کے بجائے امریکہ ''اسلامی بنیاد پرستی'' کے خلاف برسرِ پیکار ہونے پر تل گیا۔ اس معاملے کو اس نے ایسی صورت دے دی کہ جیسے مغربی دنیا کو ایک نئے نظریاتی دشمن کا سامنا ہے۔ نئے دشمن کے خلاف خود کو

بالکل اسی طرح وہ منظم کرنا چاہتا ہے جیسے ماضی میں فاشزم اور کمیونزم کے مقابل کیا تھا۔ امریکہ اور بعض یورپی حکومتوں نے عراق اور افغانستان کے خلاف جنگوں کے لیے عوامی حمایت کی خاطر ہر طرح کا جھوٹ بولا۔ حقائق کو انہوں نے توڑ مروڑ کر پیش کیا۔ اس روّیے نے تاثر پیدا کیا کہ جیسے دنیا کا ہر مسلمان مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہو۔ نائن الیون حملوں کے بعد کسی صحافی کی جانب سے جو پہلی ٹیلی فون کال مجھے ملی وہ آئی ٹی این کے مارٹن بشیر کی تھی۔ چھوٹتے ہی اُس نے مجھ سے پوچھا ''ایک مسلمان کی حیثیت سے کیا آپ اس حملے پر شرمندہ نہیں؟'' میں یہ سُن کر ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ دوسرے مغربی لوگ بھی ہمارے بارے میں اسی طرح سوچ رہے ہوں گے۔ مٹھی بھر مجرموں کی ایک کارروائی کے لیے دنیا کے ایک ارب تیس کروڑ مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرانے کا جواز کیا تھا؟ ساری دنیا کے عیسائیوں سے کیا یہ توقع کی جائے کہ وہ ہٹلر یا سٹالن کی وحشیانہ کارروائیوں کے لیے جواب دہی کریں۔ روم کے کیتھولک پیروکاروں سے کیا یہ پوچھا جائے کہ انہوں نے 1998ء کے اوماگو میں بم دھماکا کر کے بچوں اور سیاحوں کے چیتھڑے اُڑانے والے آئی آر اے کے لوگوں کی مدد کی تھی؟ ایک پوری تہذیب کو مجرموں کی صف میں کھڑا کر کے امریکہ نے بہت سے عام مسلمانوں کو مشتعل کرلیا۔ بش کے ردعمل نے اُلٹا دہشت گردوں کے مقاصد کو فائدہ پہنچایا۔ اس طرح بعض دہشت گردوں کو مقدس جہادیوں اور جانبازوں کا رتبہ مل گیا۔ مسلمانوں میں ایک تعداد ایسی ضرور ہوگی جو دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والوں کو شہید سمجھتی ہے اور اُن کے طرزِ عمل کو برحق قرار دیتی ہے۔ صورت حال اگلے دس برس میں بد سے بدتر ہوتی گئی۔ بے گناہ مسلمانوں کی اموات کے ردعمل میں بہت سے عام مسلمان امریکہ سے نفرت کرنے لگے اگرچہ ان میں سے اکثر نے عملی انتہاپسندی سے گریز کیا۔ اب زیادہ لوگ القاعدہ میں بھرتی ہونے لگے۔ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' دراصل نئے دہشت گردوں کی تخلیق کا باعث بنی۔ دہشت گردی کی اس جنگ نے بے شمار، بے گناہ شہریوں کو قتل کر کے مسلمانوں کے مصائب کی فہرست طویل کرنے کے سوا کچھ نہ کیا۔ نائن الیون کے

بعد لندن میں سیون سیون کے حملے، ٹائمنر سکوائر میں دہشت گردی کی ناکام کوشش اور جرمنی کے فرینکفرٹ ایرپورٹ پر ایک مسلمان کے ہاتھوں دو امریکی فوجیوں کے قتل سمیت دہشت گردی کے تمام واقعات عراق اور افغانستان میں جاری جنگ کا ردعمل ہیں۔

انتہائی افسوس ناک بات یہ ہے کہ مغربی دنیا مذہبی انتہا پسندی کی بنیادی وجوہات کو سمجھنے پر آمادہ نہیں۔ کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، فلسطین اور دیگر ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں نفرت کی آگ کو بھڑکاتی ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ نائن الیون کے حملے دہشت گردی کی کارروائی تھے۔ جب ایک مسلمان جنگ میں حصہ لیتا ہے تو وہ سب کچھ اسلام کے نام پر کرتا ہے۔ ناانصافی کے خلاف جدوجہد جہاد ہے۔ مزید برآں، دنیا کے دیگر علاقوں سے اپنے بھائیوں کی امداد کے لیے مسلمان جنگ میں شریک ہونے آتے ہیں جیسے برطانیہ اور امریکہ میں رہنے والے یہودی لازمی فوجی خدمات کے لیے اسرائیل جانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہ اپنے ہم مذہب عوام کی جدوجہد کے ساتھ یک جہتی کا سوال ہے۔ اسلامی دنیا یہ سمجھتی ہے کہ بین الاقوامی برادری ہمیشہ عیسائیوں کے تحفظ کے لیے میدان میں کودنے کو تیار رہتی ہے۔ جب مسلمانوں کے حق خودارادیت کا سوال اٹھتا ہے تو آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں۔ اقوام متحدہ نے عیسائی اکثریتی علاقے مشرقی تیمور میں ریفرنڈم کی قرارداد منظور کی جس کی بنیاد پر یہ علاقہ انڈونیشیا سے الگ ہوگیا۔ اسی طرح کی جو قراردادیں کشمیر میں استصواب رائے کے لیے منظور ہوئیں، ان پر نصف صدی گزرنے کے باوجود کیوں عملدرآمد نہ ہوا؟...... اور وہ قراردادیں جو اسرائیل کے خلاف منظور ہوئیں؟

نائن الیون کے واقعہ پر سازشی کہانیاں بہت ہیں۔ میرے نزدیک اسلامی دنیا کے خلاف سب سے بڑی سازش وہ مہم ہے جس کے تحت فلسطین، اسرائیل تنازع کو مذہبی جنگی جنون ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سعودی شہزادے ولید بن طلال بن عبدالعزیز السعود

نے کہا تھا: ''عین ممکن ہے کہ امریکہ کی مشرق وسطیٰ خصوصاً فلسطین کے حوالے سے طے کردہ پالیسیاں نائن الیون حملوں کا موجب بنی ہوں۔'' اس پر ناراض ہو کر نیویارک کے میئر ایڈولف جولیانی نے شہزادہ طلال کی 10 ملین ڈالر کی امداد کی پیش کش ٹھکرا دی۔ شہزادے نے نیویارک ٹائمز سے انٹرویو میں کہا تھا ''وہ بات میں امریکیوں کو بتا رہا ہوں جسے بعض امریکی پہلے ہی سمجھنے لگے ہیں۔ انہیں ادراک کرنا ہوگا کہ اگر وہ احمقانہ اور ہولناک ردعمل کا واقعی خاتمہ چاہتے ہیں تو فلسطین کا مسئلہ حل کرنا پڑے گا۔''

صدر بش نے کہا: ''القاعدہ امریکہ سے اس لیے نفرت کرتی ہے کہ ہماری آزادی انہیں پسند نہیں۔ ہم مذہبی آزادی پر یقین رکھتے ہیں۔ تحریر و تقریر کی یہاں آزادی ہے، ووٹ کی آزادی ہے، تنظیم سازی اور اختلاف رائے کی آزادی ہے۔'' اس پر برطانوی صحافی رابرٹ فسک جو اُسامہ کا انٹرویو کرنے والے چند صحافیوں میں سے ایک تھا نے یہ کہا: ''القاعدہ کا لیڈر امریکہ سے اپنی نفرت کی تین بنیادی وجوہات بیان کرتا ہے: اوّل یہ کہ امریکہ فلسطین کے معاملے پر اسرائیل کی حمایت کرتا ہے۔ ثانیاً وہ سعودی بادشاہت کا حامی ہے اور ثالثاً مسلم علاقوں میں امریکی فوج تعینات ہیں۔'' اِس بات کی تصدیق اُسامہ بن لادن کی بارہ صفحات پر مشتمل اس دستاویز سے بھی ہوتی ہے جس کا عنوان ''امریکہ کے خلاف اعلان جنگ'' ہے۔ اس عبارت میں امریکہ سے جنگ کے یہ اسباب بیان ہوئے ہیں: عرب آمرانہ ریاستوں اور اسرائیل کی امریکی حمایت، عرب علاقوں میں امریکی موجودگی، اسلامی ممالک میں امریکی افواج کی تعیناتی اور روس، چین اور بھارت سمیت اُن ممالک کی امریکی حمایت جو مسلمانوں کو دبانے پر کمربستہ ہیں۔ اِس دستاویز میں جمہوریت اور مغربی طرزِ زندگی سے نفرت کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔

اس کے بجائے کہ امریکہ مسلمانوں کے بنیادی مسئلے یعنی فلسطینی تنازع کو طے کرانے کی کوشش کرتا، اُلٹا اس نے اسلامی انتہا پسندی کا واویلا شروع کر دیا۔ بش کا یہ دعویٰ کہ مغربی دنیا

اور اسلام کے درمیان تہذیبی تصادم کی کیفیت برپا ہے، ایک لغو بات ہے۔ محض اپنے آپ کو دھوکا دینے والی بات۔ مغربی میڈیا اکثر اسلام کی من چاہی تصویر پیش کرتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اسلام، مغربی اقدار سے اسی طرح متصادم ہے جیسے فاشزم اور کمیونزم۔ اگر آپ ایک عالمی مذہب کو اپنا دشمن بنانے پر تلے ہوئے ہیں تو ظاہر ہے پھر اُس کا تعارف آپ اسی انداز میں کرائیں گے۔ ہر ملک میں اسلام کی شکل وصورت مختلف ہے۔ مکہ میں مسلمانوں کا طرزِ عمل انڈونیشیا سے جدا ہے۔ پاکستان ان دونوں سے الگ حتیٰ کہ پاکستان کے چاروں صوبوں میں اسلام پر عمل کے طریق کار میں فرق ہے۔ ہر مذہبی برادری مختلف ثقافتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ہر مذہب کے اندر بنیاد پرستوں کی قلیل تعداد بھی ہمیشہ ہوا کرتی ہے۔

مسلمان عوام کی اکثریت امریکہ کے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ یہی کہ وہ اسلامی ملکوں کی اندرونی سیاست میں مداخلت کرتا ہے، دوسروں کی خودمختاری اور اقتدارِ اعلیٰ کی تحقیر کا مرتکب ہوتا ہے۔ بدعنوان اور جرائم پیشہ آمروں کی پشت پناہی کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر عراق اور افغانستان پر قبضہ نوآبادیاتی ناانصافیوں کی طویل فہرست کی تازہ ترین کڑی ہے۔ مغرب کے اس طرزِ عمل کا آغاز 1798ء میں مصر پر نپولین کے حملے سے ہوا تھا۔ آج مسلمانوں کی نئی نسل یہ دیکھتی ہے کہ ان کے کرپٹ حکمران، ملک جس کے لیے اُن کے آباؤاجداد نے بے پناہ قربانیاں دی تھیں کی آزادی پر سمجھوتا کر چکے۔ ملک کی خودمختاری اور آزادی کو محض اس لیے گروی رکھ دیا جاتا ہے کہ امریکی پشت پناہی حاصل ہو جائے۔ مغربی اقوام کئی صدیوں سے دنیا کی صورت گری کرتی آئی ہیں۔ میں اپنے لڑکپن میں وہ تصویری کہانیاں (Comics) پڑھا کرتا تھا جن میں امریکہ کے قدیم باشندے یعنی ریڈ انڈینز گھٹیا اور قابض یورپی نیک لوگ دکھائے جاتے۔ جب میں بڑا ہوا تو حقیقت آشکار ہوئی کہ گوروں نے دو کروڑ ریڈ انڈینز کو قتل کیا تھا۔ یہی کچھ آسٹریلیا کے اصل باشندوں کے ساتھ ہوا۔

کئی عشروں تک ہم نے اُن حکومتوں کو بھگتا ہے جو ہمیں کمیونزم کے خطرے سے خوف زدہ رکھا کرتیں۔ آج جب میں اپنے بیٹوں کے ساتھ فلم دیکھتا ہوں تو ان میں اکثر منفی کردار مسلمانوں کے ہوتے ہیں۔ مجھے اس بات کی توقع تھی کہ یہ نائن الیون کے واقعے کا ردِعمل ہوگا لیکن ایسی شدت کے ساتھ، اس بات کا اندازہ بالکل نہ تھا۔ مغربی ممالک میں عام لوگوں کے دلوں میں اسلام سے نفرت پیدا کرنے کے لیے جنونی انداز میں اسلامو فاشزم ''Islamo fascism'' کی اصطلاح گھڑی گئی۔ اسی رویے نے مسلمانوں سے خوف میں اضافہ کر دیا۔ یورپ میں تارکینِ وطن سے نفرت کا درس دینے والے دائیں بازو کی قوت میں اضافہ ہوا ہے۔ دائیں بازو کے میڈیا میں مسلمانوں کے بارے میں گمراہ کن پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری ہے۔ سنسنی خیز جھوٹی خبریں، فرانس میں برقعہ، سوئٹزر لینڈ میں مساجد کے مینار تعمیر کرنے پر پابندی، نیویارک میں تباہ شدہ ''ٹوئن ٹاورز'' کے قریب مسلمانوں کے کمیونٹی سنٹر کی موجودگی پر شدید احتجاج، انہی چیزوں نے بنیاد پرستوں کو تقویت دی ہے۔ اس طرزِ عمل نے عام مسلمان کو امریکہ سے دور کر دیا۔ بش کا رویہ یہ تھا اگر تم ہمارے ساتھ نہیں تو ہمارے دشمن ہو۔ صدر بش اور وزیرِاعظم ٹونی بلیئر کا کہنا یہ تھا کہ ہماری جنگ بنیاد پرست اسلام کے خلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ مغربی ممالک کے گلی کوچوں میں چلنے والا کوئی بھی شخص ایک عام مسلمان اور بنیاد پرست میں کس طرح تمیز کرے گا؟ میں نے اس پیش رفت کو دونوں طرف سے دیکھا ہے۔ اس طرح مجھے صورت حال کا تجزیہ کرنے کا ذرا بہتر موقع حاصل ہے۔ ایک جانب میں یہ جانتا ہوں کہ مغرب میں لوگ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ دوسری جانب ایک سیاست دان کی حیثیت سے مجھے معلوم ہے کہ پاکستان کے گلی کوچوں میں لوگ امریکہ اور یورپ کے طرزِ فکر کو اسلام کے خلاف جنگ کیوں سمجھتے ہیں۔ انتہائی دُکھ کے ساتھ میں اس صورت حال کو دیکھ رہا ہوں۔ دہشت گردی کی جنگ کے حوالے سے اصل حقائق سے ناآشنائی اسلامی دنیا کے درمیان انتشار کے عمل کو مزید فروغ دیتی ہے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ ایک طرف اس جھوٹے تصور کو فروغ دیتی ہے کہ اسلام بنیاد پرستی اور تشدد کا دوسرا نام ہے۔ دوسری طرف 2008ء میں شائع ہونے والے عالمی گیلپ سروے سے ظاہر ہوا کہ مسلمانوں کی غالب اکثریت نائن الیون کے حملوں کی مذمت کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ مسلمان عوام سیاست اور تحریر وتقریر میں آزادی، انصاف پر مبنی عدالتی نظام اور جمہوریت کے حوالے سے مغرب سے مختلف اندازِ فکر نہیں رکھتے۔ اکثر غیر مسلموں کی طرح وہ بھی مقدس جنگ اور خون خرابے کے بجائے بہتر ملازمت اور تحفظ کا خواب دیکھتے ہیں۔ 2011ء میں مشرق وسطیٰ میں اُٹھنے والی تحریکیں کیا بتاتی ہیں؟ گیلپ سروے سے حاصل ہونے والے نتائج کی وہ عملاً تصدیق کرتی ہیں۔ اسی سروے کے مطابق پوری دنیا میں صرف 7 فیصد لوگوں نے ان حملوں کو جائز قرار دیا۔ جو لوگ اس طرح سوچتے ہیں، وہ مذہبی دشمنی کے سبب نہیں بلکہ اپنے ملکوں پر امریکی غلبے سے ناراض ہیں۔ سروے کے مطابق مسلمانوں سے جب پوچھا گیا کہ مغربی دنیا میں بہترین چیز کیا ہے؟ ان کا جواب تھا، جدید ٹیکنالوجی اور جمہوریت۔ یہی سوال امریکی شہریوں سے پوچھا گیا تو ان کا جواب بھی یہی تھا۔

یونیورسٹی آف شکاگو کے ماہر سیاسیات رابرٹ پیپ خودکش حملہ آوروں اور اسلامی بنیاد پرستی کے حوالے سے پائے جانے والے نظریات کو احمقانہ قرار دیتے ہیں۔

1980ء سے 2003ء تک دنیا میں ہونے والے تمام خودکش حملوں کے تجزیے کے بعد نتیجہ یہ ہے کہ سری لنکا کے تامل ٹائیگرز اس میں سرفہرست ہیں۔ یہ ہندو پس منظر کی حامل سیکولرازم اور کمیونزم کی قائل تنظیم تھی۔ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ خودکش دہشت گردی کی 95 فیصد کارروائیاں بہت بڑی تنظیموں نے کیں، مذہبی نہیں سیکولر اور سیاسی مقاصد کے لیے! یہ حملے ایسے علاقوں پر فوجی قبضے کے ردِعمل میں ہوئے جنہیں دہشت گرد اپنا وطن سمجھتے تھے۔ ایک اور اہم بات اس تحقیق سے یہ سامنے آئی کہ اکثر خودکش حملہ آور متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے، تعلیم

یافتہ اور کٹر نظریاتی افراد ہوتے ہیں، غریب، جاہل اور مذہبی جنونی نہیں، ہمارے ڈالروں کے بھوکے حکمران مغربی دنیا کو جس کا یقین دلانے پر کمربستہ ہیں۔

دہشت گردی کا مذہب سے قطعاً کوئی تعلق نہیں، یہ تعلق سیاست کے ساتھ ہے۔ بہت سے مسلمان حکمران امریکہ کی قربت حاصل کرنے کے لیے امریکہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ نہ تو ان میں اتنی غیرت ہے اور نہ ہی فہم کہ وہ مغربی دنیا پر حقائق واضح کر سکیں۔ جہادیوں کے انتہائی سخت رویے میں کارفرما وجوہات کے تدارک پر زور دینے کی بجائے وہ خود کو امریکہ کا اتحادی ثابت کرنے میں لگے ہیں۔ واشنگٹن کی حمایت کے لیے، مسلمان رہنماؤں کی اکثریت خود کو اعتدال پسند بنا کر پیش کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ میں مسلمان ملکوں کی مغرب زدہ اشرافیہ ہی کو ذمہ دار ٹھہراتا ہوں۔ یہ لوگ اعتدال پسندی کے پیچھے پناہ لینے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہمارا اسلام اعتدال پسند ہے یوں اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ دہشت گردی کی بنیادی وجہ سیاسی ناانصافی نہیں، ایک دینی نظریہ ہے۔ اس طرح کی باتیں احمقانہ ہیں۔ ہر کسی کو اعتدال پسند اور بنیاد پرست مسلمان میں تمیز کرنا ہوگی۔ نائن الیون پر حملہ کرنے والوں کے حلیے باریش بنیاد پرستوں جیسے نہیں تھے۔ 2010ء میں نیویارک کے ٹائمز سکوائر میں کار بم دھماکے کی کوشش کے الزام میں سزا پانے والا فیصل شہزاد کیا کسی مولوی جیسا تھا؟

اسلامی دنیا کی اشرافیہ کو مغرب کے حملوں کا مقابلہ کرنے میں اجتماعی ناکامی کا سامنا ہے۔ ہمارے اہلِ دانش اپنا کردار ادا کرنے میں شرمناک اور مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہوئے۔ جو بھی دہشت گردی کے اسباب کی نشاندہی یا سیاسی حل کی بات کرتا ہے، اُسے دہشت گردوں کا ہمدرد قرار دے دیا جاتا ہے۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ برطانوی وزیراعظم چیمبرلین کی طرح ہیں جو امن کی آرزو میں ہٹلر سے مؤدب ہو کر ملا تھا۔ اسی پر بحث کا گلا دبا دیا جاتا ہے۔ یہ طرزِ عمل گوئبلز کے پراپیگنڈا کی یاد دلاتا ہے جس نے پوری بے حیائی اور بے شرمی سے جھوٹ کو

فلسفہ بنا دیا۔ جب کوئی اعتراض کرتا تو اسے غیر محب وطن کہا جاتا، حتیٰ کہ غداری کا الزام لگا دیا جاتا۔ دوسری جانب مغربی دانش ور اسلام سے پیدا کیے گئے خوف کا مقابلہ کرنے سے اس لیے قاصر ہیں کہ وہ اسلام کے بارے میں جانتے ہی نہیں۔

استعماری ہتھکنڈوں اور جھوٹے پروپیگنڈے کا مؤثر جواب دینے میں سب سے بہتر کردار برطانیہ میں بائیں بازو کے میڈیا نے ادا کیا۔ ان میں گارجین اور انڈیپنڈنٹ اخبارات اہم ہیں۔ برطانیہ کے پاکستانی نژاد صحافی طارق علی مختلف طرح کے آدمی ہیں۔ پاکستان میں بائیں بازو کے اخبار نویس اور دانش ور دہشت گردی کی جنگ میں روا رکھی جانے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پہ اصولی مؤقف اختیار کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔ وجہ بہت ہی دلچسپ ہے، پورے اخلاص کے ساتھ وہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں طالبان کے اقتدار کا خطرہ موجود ہے۔ اُن کے خیال میں یہ خطرہ ڈرون حملوں اور قبائلی علاقوں میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ ان صحافیوں اور کالم نگاروں نے جو ماضی میں استعماری قوتوں کے خلاف ڈٹ کر لکھنے کی شہرت رکھتے تھے، اچانک دہشت گردی کی جنگ میں امریکہ کی حمایت شروع کر دی۔ پاکستان کی خود مختاری کو لاحق خطرات اور اپنے ہی شہریوں پر ہونے والی بم باری پر ان کی مکمل خاموشی کانوں کے پردے پھاڑتی ہے۔ اس سے بڑی ستم ظریفی کیا ہوگی کہ خود کو لبرل کہلانے والے بعض صحافی ڈرون طیاروں، پاک فضائیہ کے طیاروں، گن شپ ہیلی کاپٹروں اور توپ خانے سے دیہات پر گولا باری کے مکمل حامی ہیں۔ شہریوں، خواتین اور بچوں کے قتل کو وہ مجبوری کے نقصان کے نام پر ہضم کر لینے پر آمادہ ہیں۔ این جی اوز اس بارے میں کچھ نہ کرتی تھیں کہ ان کے بجٹ کا بڑا حصہ مغربی ممالک سے آتا ہے۔ اہم سیاسی جماعتیں بھی خاموش ہیں کہ کہیں امریکی حمایت سے محروم نہ ہو جائیں۔ اس صورت حال میں میری پارٹی اور مذہبی جماعتیں ہی اس پالیسی کے خلاف کھڑی ہیں۔

نائن الیون کے بعد سے میری سیاسی جدوجہد کا محور کرپشن اور دہشت گردی کی مخالفت رہا ہے۔ اس حوالے سے میں پاکستان اور مغربی دنیا کو درپیش طویل المیعاد تباہ کن نتائج کی نشاندہی کرتا رہا۔ اسی بنا پر پاکستان کے انگریزی اخبارات و جرائد سے وابستہ نام نہاد لبرل صحافیوں نے مجھے دائیں بازو کا انتہا پسند، حتیٰ کہ طالبان کا حامی تک قرار دے ڈالا۔ میں نے ہمیشہ یہ مؤقف اختیار کیا کہ افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشن ناکام رہے گا۔ درحقیقت یہ جنگ معاشرے میں بنیاد پرستی کو فروغ دے گی۔ نئے دہشت گرد ردِعمل میں پیدا ہوتے ہیں۔ 2010ء اور 2011ء میں سامنے آنے والے وکی لیکس کے انکشافات میں بتایا گیا کہ پاکستان میں امریکی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن کا خیال بھی یہی تھا کہ فائدے کی بجائے ڈرون حملوں اور فوجی کارروائیوں سے اُلٹا نقصان ہوا۔

ہمارے والدین نے یہ بتا بتا کر ہمیں بڑا کیا کہ تم کیسے خوش قسمت ہو کہ ایک آزاد وطن میں پیدا ہوئے، اس خطے میں جو صدیوں تک غلامی کا شکار رہا۔ اب جب میں دیکھتا ہوں کہ مشرف اور زرداری نے ملک کی خود مختاری امریکہ کے پاس گروی رکھ دی ہے تو بہت ذلت کا احساس ہوتا ہے۔

دیکھنا یہ چاہیے کہ افغانستان کے ساتھ تعلقات کے باب میں مشرف نے اصولوں کو کس طرح پامال کیا۔ نائن الیون کے فوراً بعد امریکہ نے پاکستان کو سات مطالبات پر مشتمل ایک فہرست دی جس میں پاک افغان سرحد پر القاعدہ کی سرگرمیوں کی روک تھام، انٹیلی جنس معلومات کی فراہمی، پاکستان کے فضائی اور بحری اڈوں تک امریکہ کی رسائی، افغانستان کی طالبان حکومت سے تمام تعلقات منقطع کرنے اور ان کے لیے جاری تیل کی ترسیل بند کرنے کے تقاضے شامل تھے۔ مشرف نے فوراً ہی یہ ساتوں مطالبات تسلیم کر لیے۔ بھارت کے مقابل افغانستان میں تزویراتی گہرائی کی حکمت عملی، بنیادی اہمیت کی حامل ہے؛ چنانچہ افغانستان کے

ساتھ اچھے تعلقات لازم ہیں۔ مشرقی محاذ سے کسی ممکنہ حملے سے نمٹنے کے لیے کابل میں پاکستان کی حامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ پاکستان نے 1996ء میں طالبان حکومت کو تسلیم کرلیا تھا۔ مشرف نے بہت تیزی سے اور خوشی خوشی امریکی مطالبات مان لیے۔ گویا وہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ مشرف کی ایسی تابعداری پر خود امریکہ بھی حیران تھا۔ پاک فوج کو اس سے مایوسی ہوئی۔ لوگوں کو شدید دھچکا لگا۔ وہ ہمیں ایسے حالات میں دہشت گردی کی جنگ میں گھسیٹ لے گیا جب نائن الیون کے حملوں میں کوئی پاکستانی ملوث نہ تھا۔ افغانستان میں موجود القاعدہ امریکی سی آئی اے کی تربیت یافتہ تنظیم تھی اور پاکستان میں طالبان جنگجوؤں کا کوئی وجود نہ تھا۔ امریکی خفیہ ایجنسیوں کو پاکستان نے کھلی چھٹی دے دی کہ وہ دہشت گردی کے شبہ میں کسی بھی پاکستانی یا غیر ملکی کو اُٹھالے جائیں۔ امریکہ کی دھونس دھمکی سے سہمے ہوئے پاکستانی اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے سیاست دانوں نے نہایت بے شرمی کے ساتھ ڈالروں کے بدلے اپنے لوگ امریکہ کے حوالے کرنے کا سلسلہ شروع کردیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کوئی منصوبہ بندی مشرف نے ہرگز نہ کی تھی۔ اُسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کس وقت سمجھوتا کرنا ہے اور کس وقت گریز اور انکار۔ کوئی منتخب پارلیمنٹ اور کابینہ موجود نہ تھی جس میں فیصلوں پر بحث ہوتی۔ وقتی ضرورت اور مفاد پرستی کی بنیاد پر فیصلہ ہوا۔ بے شک نائن الیون کے ذمہ داروں کی گرفتاری میں امداد کی پیش کش کرنا چاہیے تھی۔ پاکستان کے سب سے بڑے عہدہ پر فائز ہونے کے باعث وہ اس قابل تھے کہ القاعدہ سے نمٹنے کے حوالے سے امریکہ کو مشورہ دیتے۔ پاکستانی حکمران کی حیثیت سے اُن کی بنیادی ذمہ داری یہ تھی کہ ملک کے مفادات پر حرف نہ آئے۔ انہوں نے عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بالکل وہی ہتھیار برتا جو بش نے امریکی عوام کو دھوکا دینے کے لیے استعمال کیا تھا یعنی ڈرا دینے کا عمل۔ ان کا دعویٰ یہ تھا: ایٹمی اثاثوں کو بچانے اور کشمیر پالیسی پر تائید کے لیے امریکہ سے تعاون ضروری ہے۔ نائن الیون کے کچھ عرصہ بعد کل جماعتی کانفرنس میں انہوں

نے ہمیں بتایا کہ امریکہ کی حالت اس وقت کسی زخمی ریچھ جیسی ہے جو غصے میں چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ ہمیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو امریکہ چاہتا ہے ورنہ وہ ہمیں برباد کر کے رکھ دے گا۔ جنرل مشرف نے بعدازاں یہ لکھا ''امریکہ کے نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج نے آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل محمود سے کہا تھا کہ پاکستان کو امریکہ کی مدد کرنا ہوگی ورنہ اسے پتھر کے زمانے میں پہنچا دیا جائے گا۔'' انہوں نے ہمیں بتایا کہ بھارت ہماری جگہ طالبان کے خلاف امریکہ کا اتحادی بننے کے لیے تیار ہے۔ یہ بھی کہا کہ امریکہ بھارت کو استعمال کر کے ہمیں اسی طرح تباہ کرسکتا ہے جیسے اس نے افغانستان میں شمالی اتحاد کے ہاتھوں طالبان کو تباہ کر ڈالا تھا۔

میں نے اپنی پوری زندگی میں پاکستانیوں کو امریکی اشتعال سے ایسا خوف زدہ ہوتے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ ایک مثال تھی کہ حکمران طبقات کس طرح خوف کا ہتھیار استعمال کر کے لوگوں کو اپنی راہ پہ لے آتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی واضح ہوا کہ جس حکمت عملی کو خوف پر استوار کیا جائے، وہ تباہ کن ثابت ہوا کرتی ہے۔ اب دس سال کے بعد لوگوں کو یہ بات پوری طرح سمجھ آرہی ہے کہ خوف کی حالت میں کیے گئے فیصلوں نے پاکستان کو داؤ پر لگا دیا ہے، امریکی مطالبات کے سامنے بار بار گھٹنے ٹیکنے کی روش نے۔ پرویز مشرف کی دلیل یہ تھی کہ بہر حال ہمیں صدر بش کا ساتھ دینا ہوگا ورنہ فائدہ بھارت کو پہنچے گا۔ انہوں نے غلط کہا تھا، بالکل غلط۔ افغانستان پر امریکی قبضہ ہوا تو پاکستان کی حامی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اب وہاں بھارت نواز لوگ براجمان ہیں۔ بھارت ہمیشہ سے ہمارا حریف تھا، اب بھی ہے۔ اب وہ افغانستان میں مالی امداد، قونصل خانوں کے جال اور تجارت کے علاوہ ٹیلی ویژن اور بظاہر فروغ فلم جیسے بے ضرر ذرائع استعمال کر کے اپنے اثرات بڑھاتا جارہا ہے۔ پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔ جبکہ دوسری طرف ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود امریکہ نے بھی کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھا۔ تمام قربانیوں کے باوجود اگر امریکہ کے خلاف کسی بھی کارروائی میں کوئی ایسا فرد

شامل ہو جس کا کوئی تعلق کسی طرح بھی پاکستان سے بنتا ہو تو ہم دشنام کا نشانہ ہوتے ہیں۔ ممتاز صحافی بوب وڈ ورڈ اپنی کتاب اوباما کی جنگ (Obama's War) میں لکھتا ہے ''اگر فیصل شہزاد نیویارک میں بم دھماکا کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو امریکہ پاکستان کے اندر ''دہشت گردوں کے 150 محفوظ ٹھکانوں'' پہ بمباری کرتا۔''

وکی لیکس سے منظر عام پر آنے والی معلومات سے کیا ظاہر ہوا؟ یہی کہ پاکستان میں امریکی سفارت خانے کو تقریباً وہی حیثیت حاصل ہے جو انگریزی دور میں برطانوی وائسرائے کو ہوا کرتی تھی۔ ذرا سی تنقید بھی اسے گوارا نہیں۔ پاکستان کی حکومت امریکہ کی اتحادی ہے اور خود انہی کی نگاہ میں پاکستان کے عوام بدترین دشمن۔ امریکہ اور یورپ میں مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

مقدونیہ میں چھ پاکستانیوں کو دہشت گردی کے شبہ میں ہلاک کر دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بے چارے تو سیدھے سادے کاروباری لوگ تھے۔ یونان میں پانچ پاکستانی تاجروں کو جیل میں ڈال دیا گیا، ان سے تفتیش کی گئی اور انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ تفتیش مکمل ہوئی تو یہ سب بے گناہ ثابت ہوئے۔ برطانیہ میں بہت سے ایسے واقعات ہوئے جن میں پاکستانیوں کو اُٹھا لیا گیا۔ بدترین معاملہ وہ تھا جب دہشت گردی کے شبہ میں سات پاکستانی طالب علموں کو چھ ماہ تک ایک بدترین جیل میں رکھا گیا۔ بے گناہ ثابت ہونے پر انہیں ملک سے نکال دیا گیا۔ ان طلبا میں سے دو مجھ سے ملاقات کے لیے میرے اسلام آباد دفتر آئے۔ یہ عام گھرانوں کے بچے تھے جن کے والدین حصول تعلیم کی خاطر انہیں انگلینڈ بھیجنے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ بے گناہ ثابت ہو جانے کے باوجود انہیں نکال پھینکا گیا، ان کا مستقبل تباہ کر دیا گیا۔ فضائی سفر کے دوران کئی بار ایسے پاکستانیوں سے میری ملاقات ہوئی جو امریکہ میں قیام کے دوران اپنے اُٹھائے جانے، جیل میں ناروا سلوک اور پھر ملک بدر کرنے کی ہولناک کہانیاں سناتے رہے۔
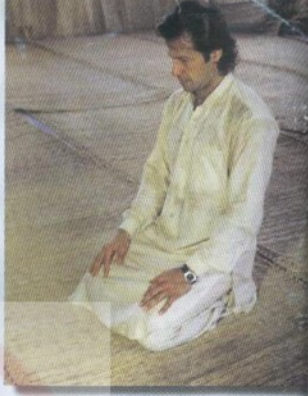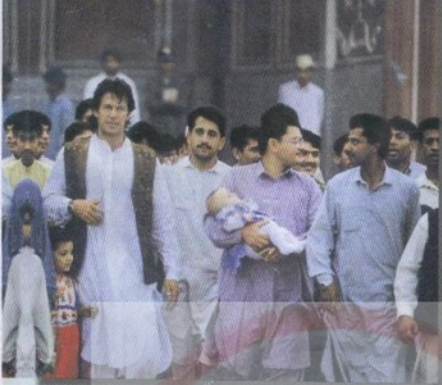
اوپر بائیں جانب: بادشاہی مسجد لاہور 2003ء میں نماز جمعہ کے بعد۔
اوپر دائیں جانب: لاہور میں والدہ کے نام پر قائم شدہ کینسر ہسپتال کی مسجد میں نماز ادا کرتے ہوئے۔
دائیں جانب اور نیچے: 1996ء اور 1997ء کی انتخابی مہم کے دوران جب میری پارٹی نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔

اوپر: چیف جسٹس، جنھیں صدر مشرف نے 9 مارچ 2007ء کو غیر فعال کر دیا تھا، اُن کی بحالی کی تحریک میں میری پارٹی نے ہر اول دستے کا کردار ادا کیا۔

دائیں جانب: مشرف کے دورۂ برطانیہ 2008ء کے خلاف دس ڈاؤننگ سٹریٹ (برطانیہ) کی جانب رواں احتجاجی جلوس کی قیادت کرتے ہوئے۔

نیچے: بعدازاں اسی سال میری پارٹی آل پارٹیز ڈیموکریٹک موومنٹ کا حصہ تھی، سابق وزیرِاعظم نواز شریف کی پارٹی بھی اس کی رُکن تھی۔

اوپر بائیں جانب: 2002ء میں ایک انتخابی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے۔ ہر سال میری پارٹی پاکستان میں مستحکم ہوتی چلی گئی۔

دائیں جانب: 2009ء میں ایک ریلی کا انعقاد ہوا مگر مجھے لاہور سے کراچی جانے کی اجازت نہ ملی۔

دائیں جانب: 2007ء میں جیل سے رہائی کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے۔

اوپر: انگلستان میں میری اہلیہ، جمائما خان اور ان کی والدہ لیڈی اینابل گولڈسمتھ میرے بیٹے قاسم کے ساتھ، جنہوں نے میری رہائی کے لیے جدوجہد کی۔
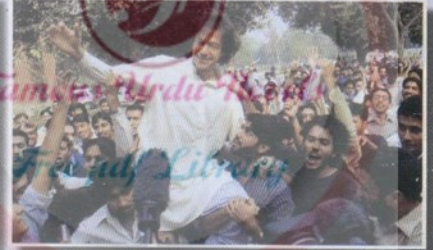
بائیں جانب: شوکت خانم میموریل ہسپتال اور ریسرچ سنٹر لاہور، جس کی بنیاد 29 دسمبر 1994ء کو رکھی گئی اور اسے میری والدہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ہسپتال ہر خاص و عام کو اول درجے کی سہولیات دیتا ہے اور غربا کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔

نیچے: 1996ء میں ہسپتال کو بم کا نشانہ بنایا گیا۔ جمائما اور میں نقصان کا جائزہ لیتے ہوئے۔

سب سے نیچے: شہزادی ڈیانا کے ہسپتال کے دورے 1997ء کی وجہ سے ہماری عطیات جمع کرنے کی مہم کو بہت معاونت ملی۔ مریضوں کے لیے اُن کی دلی ہمدردیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔

ہسپتال کے لیے عطیات اکٹھے کرنے کی غرض سے میں نے ملک کے تقری
ہر گوشے کا دورہ کیا.... مساجد، سکولوں، کاروباری مراکز اور گھروں سے بھی
ہزاروں لوگوں نے عطیات جمع کرائے جن کی فیاضی سے میں بے حد متاثر ہوا

نیچے: 1994ء میں سینٹ جوزف سکول کراچی میں عطیات اکٹھے کرتے ہوئے۔
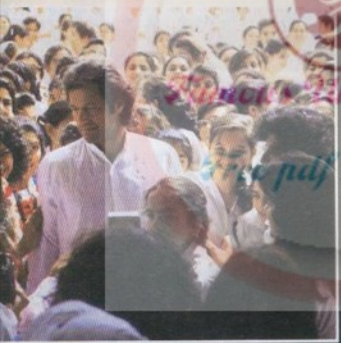
نیچے: نمل یونیورسٹی (میانوالی) جس کا افتتاح 2008ء میں ہوا تھا۔ یہ ادارہ یونیورسٹی آف بریڈفورڈ (برطانیہ) کی ڈگری دیتا ہے، میں اس یونیورسٹی کا چانسلر بھی ہوں۔

اوپراور بائیں طرف: جمائما اور میں جون 1995ء میں برطانیہ میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ جمائما میری بہنوں رانی اور عظمیٰ کے ساتھ زمان پارک لاہور میں۔
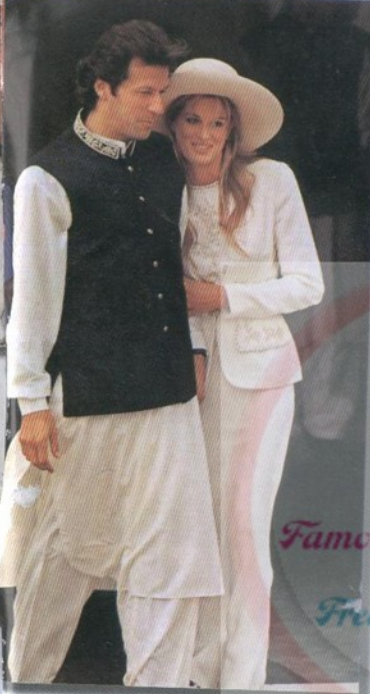
اوپر دائیں اور بائیں جانب: انگلستان میں جمائما کے ساتھ ہائی کورٹ پیشی کے موقع پر 1996ء جہاں آئین بوتھم اور ایلن لیمب نے مجھ پر ہتک کا مقدمہ دائر کیا تھا۔ اپریل 2000ء میں پاکستان ٹیلی وژن ایوارڈز تقریب میں "سپورٹس مین آف دی ملینیم" کے ایوارڈ کے ساتھ۔

دائیں جانب اور نیچے: اگرچہ میں اب کرکٹ نہیں کھیلتا، مگر مجھے اب بھی اسے دیکھنے کا شوق ہے۔ شین وارن اور برادر نسبتی زیک گولڈ سمتھ کے ساتھ 2007ء میں منعقد ہونے والے ایک چیرٹی میچ کے دوران۔ سلیمان اور قاسم کے ساتھ پاکستان اور انگلینڈ کے درمیان کھیلا جانے والا راولپنڈی ٹیسٹ میچ دیکھتے ہوئے۔

دائیں طرف اور نیچے: جمائما 1996ء میں ہمارے پہلے بیٹے سلیمان کے ساتھ۔

اسلام آباد میں پہاڑیوں پر میری رہائش گاہ۔

میری پارٹی کے نام کا مطلب ہے "انصاف کے لیے جدوجہد" اور ہم اسی کے لیے کوشاں ہیں۔
اوپر: کرپشن کے خلاف ریلی میں۔
اوپر دائیں جانب: مئی 2011ء میں قبائلی علاقوں میں ڈرون حملوں کے خلاف۔
دائیں: جولائی 2011ء میں فیصل آباد میں عوامی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے۔ بعدازاں فیصل آباد کے وکلا سے ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن میں خطاب کرتے ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ میری پارٹی کا دور آ گیا ہے۔

دہشت گردی کی جنگ کے خلاف مسلسل اور کھلے عام میرے احتجاج کی بنا پر تباہ کاری کا شکار بہت سے لوگ مدد کے لیے مجھ سے رابطہ کرتے رہے ہیں۔ نائن الیون کے بعد غیر پاکستانی مسلمان خصوصاً پاکستان میں رہنے والے عرب باشندوں کی پوزیشن بہت نازک ہو چکی ہے۔

غیر ملکی مسلمانوں کو جس تذلیل کا نشانہ بنایا گیا، وہ ہماری تاریخ کا انتہائی شرمناک باب ہے۔ ان سب کو بدترین دہشت گرد سمجھ لیا گیا۔ یہ موقع بھی انہیں دیا نہ گیا کہ وہ خود کو بے گناہ ثابت کریں۔ بہت سے غائب کر دیئے گئے، بعض کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا، یہ جانے بغیر ہی کہ وہ قصوروار بھی تھے یا یکسر معصوم۔ یہ وہ مرحلہ تھا جہاں امریکہ نے خود کو دہشت گردی سے محفوظ بنانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ ڈٹ کر دوسرے ملکوں میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کیں اور براہ راست خود بھی اور اپنے ایجنٹ حکمرانوں کے ذریعے اس عمل کی اور زیادہ پشت پناہی کی۔ برطانیہ میں سیون سیون کے حملوں کے بعد برازیل کے ایک بے گناہ شہری کو پولیس نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا تو پوری برطانوی قوم سراپا احتجاج بن گئی۔ باقاعدہ تحقیقات کرنا پڑیں اور مرنے والے کے ورثا کو معاوضہ دیا گیا لیکن پاکستان میں حالت وہ رہی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ بڑی تعداد میں ایسے لوگ میرے پاس آئے یا فون پر رابطہ کرتے رہے جن کے پیاروں کو خفیہ ایجنسیوں یا فوج نے اُٹھا لیا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ اُن کے شوہر، بیٹے یا بھتیجے کو کس الزام کے تحت اُٹھایا گیا ہے۔ وہ ہیں کہاں؟ کوئی ان کی مدد کے لیے تیار نہیں۔ یہ ہے وہ خوف جو محض دہشت گردی کے شبہ پر تباہی کا باعث بنتا ہے۔

2003ء میں، لاپتا افراد کے لواحقین کے ساتھ میں نے پارلیمنٹ کے سامنے پہلا احتجاجی مظاہرہ کیا۔ ایک سال قبل 2002ء میں ڈاکٹر عامر عزیز کو اٹھا لیا گیا تھا۔ وہ ہڈیوں کے ایک ممتاز معالج، بہت معروف آرتھوپیڈک سرجن ہیں۔ ہر سال ڈاکٹروں کی ایک ٹیم لے کر وہ مفت علاج کے لیے افغانستان جایا کرتے۔ میں ڈاکٹر عامر عزیز کو اس لیے بھی جانتا ہوں کہ وہ

شوکت خانم ہسپتال میں رضا کارانہ کام کر چکے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق ڈاکٹر عامر عزیز کو ایف بی آئی کے ایجنٹوں کے ساتھ کام کرنے والی پاکستانی پولیس نے اغوا کیا۔ ان پر الزام تھا کہ وہ القاعدہ اور طالبان دہشت گردوں کو انتھراکس (Anthrax) سپلائی کرتے تھے۔ میں نے حزب اختلاف کے چند رہنماؤں اور ایک مذہبی جماعت سے بات کی۔ ان سے کہا کہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کی گرفتاری پر احتجاج کے لیے ایک پریس کانفرنس بلانی چاہیے۔ وہ سب خوف زدہ تھے۔ یوں یہ پریس کانفرنس مجھے تنہا کرنا پڑی۔ چند روز بعد پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے لاہور شہر میں اس واقعہ کے خلاف ہنگامہ برپا کیا۔ تب دوسری پارٹیوں نے بھی آواز اٹھائی۔ ایک مہینہ امریکی سفارتخانے میں رکھنے کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ اگر عوامی سطح پر احتجاج نہ ہوتا تو انہیں گوانتانامو بے کی ہوا کھانا پڑتی۔

ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے خاندان والے بھی میرے پاس آئے۔ امریکیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ پاکستانی نژاد سائنس دان اور تین بچوں کی ماں، القاعدہ کی رکن ہے۔ اُس کے خلاف دہشت گردی کے جرم میں کارروائی نہ ہوئی بلکہ ایک اور ڈرامہ رچایا گیا۔ عافیہ کے خاندان کا کہنا ہے کہ 2003ء سے 2005ء تک وہ لاپتا رہیں۔ اس دوران وہ امریکہ کی قید میں تھیں جہاں اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ امریکہ اس الزام کی تردید کرتا رہا۔ فروری 2011ء میں عافیہ کے وکیل نے ایک آڈیو ٹیپ جاری کی جو عافیہ کے گھر والوں کے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہے۔ ٹیپ پاکستان کے انسداد دہشت گردی ادارے کے عمران شوکت نامی ایک سینئر اہلکار کے بیان پر مشتمل ہے۔ واضح الفاظ میں وہ تصدیق کرتا ہے پاکستانی پولیس نے 2003ء میں عافیہ کو گرفتار کر کے آئی ایس آئی کے حوالے کیا۔ برطانوی صحافی ایوان ریڈلے (Yuonne Ridley) کے مطابق قیدی نمبر 560 عافیہ کا المیہ عجیب اور پراسرار ہے۔ اس خاتون کی چیخیں اور آہ و بکا کی صدائیں افغانستان کے بگرام ہوائی اڈے پر موجود دوسرے قیدیوں کے لیے اذیت کا باعث

تھیں۔ جب پہلی بار وہ لاپتا ہوئی تو اُس کے چچا نے ذاتی طور پر مجھے فون کر کے اطلاع دی۔ انہوں نے بتایا آخری بار اس نے اپنے خاندان سے تب رابطہ کیا جب وہ اپنے تین بچوں کے ساتھ کراچی سے اسلام آباد آنے کے لیے ریل گاڑی میں سوار ہوئی۔ وہ ہوائی جہاز کے سفر سے خوف زدہ تھی۔ اس نے سنا تھا کہ اس کا نام ایف بی آئی کی فہرست میں شامل ہے۔ عافیہ کی ماں نے فون کر کے مجھ سے مدد کی درخواست کی۔ میں نے ان کے ہمراہ ایک پریس کانفرنس پر آمادگی کا اظہار کیا۔ اگلے روز انہوں نے انکار کر دیا۔ خفیہ ایجنسی کی طرف سے فون پر انہیں دھمکی ملی کہ اپنے ارادے پر انہوں نے عمل کیا تو وہ اپنی بیٹی اور نواسوں کو آئندہ کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔ ابتدا میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) نے عافیہ کے معاملے کو چھوا تک نہیں۔ مغرب کی امداد پر پلنے والی این جی اوز کو بھی انسانی حقوق کی فکر لاحق نہ ہوئی، وہ یکسر الگ تھلگ رہیں۔

2008ء میں ریڈلے کے ساتھ میں نے اسلام آباد میں عافیہ کی رہائی کا مطالبہ کرنے اور پریس کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا۔ اب تک پریس بے اعتنائی برت رہا تھا لیکن اب اخبارات میں اچھی کوریج ملی۔ رفتہ رفتہ عافیہ کا معاملہ ایک قومی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ دعویٰ کیا گیا کہ اسے افغانستان میں امریکیوں نے گرفتار کیا تھا۔ انہوں نے اعلان فرمایا کہ اس دھان پان خاتون نے، جس کے تین بچے اغوا کر لیے گئے تھے، دوران حراست ایک امریکی فوجی سے رائفل چھین کر امریکی فوجی افسر اور ایف بی آئی کے ایجنٹوں پر فائرنگ کی۔ گولی کسی کو لگی نہیں۔ اُسے اچانک نیویارک منتقل کر دیا گیا اور 2010ء میں اقدام قتل کے الزام میں اس پر مقدمہ چلایا گیا اور 86 برس قید کی سزا سنا دی گئی۔ ملک میں شدید ردعمل سامنے آیا عوام نے سڑکوں اور گلیوں میں احتجاجی جلوس نکالے۔ عراق اور افغانستان میں معصوم شہریوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والے امریکی فوجیوں کو کبھی سزا نہ دی گئی۔ سی آئی اے کا اہلکار ریمنڈ ڈیوس لاہور میں دو نوجوانوں کو قتل کر ڈالتا ہے تو چوری چھپے اسے طیارے میں بٹھا کر امریکہ بھیج دیا جاتا ہے۔

2008ء میں کراچی میں مقیم وزیرستان سے تعلق رکھنے والا میری جماعت کا ایک رُکن اچانک غائب ہوگیا۔ فرنٹیئر فورس کے جوانوں نے اسے اٹھایا اور پشاور کے قلعہ بالا حصار میں لے گئے۔ میری پارٹی نے کراچی میں مظاہرے کیے اور میں نے اعلیٰ پولیس افسروں سے پوچھا کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا۔ چند روز بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ پتا چلا کہ نہ صرف فرنٹیئر فورس کے اہلکاروں نے اس سے تفتیش کی بلکہ چند امریکی بھی پوچھ گچھ فرماتے رہے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ جب وہ اپنے گھر وزیرستان گیا تھا تو اس نے طالبان کو 50 لاکھ روپے کس مقصد کی خاطر دیے تھے۔ جہانزیب نے اقرار کیا کہ واقعی یہ رقم اس نے دی تھی۔ پھر اس نے پوچھا کہ اگر وہ طالبان کو روپیہ دینے سے انکار کردے تو کیا وہ اس کے تحفظ کی ضمانت دے سکتے ہیں؟ جہانزیب کا کہنا تھا کہ اگر کسی اور کو ایسی صورت حال کا سامنا ہوتا تو وہ اس قدر خوش قسمت ثابت نہ ہوتا۔ کراچی میں اگر اُس کی رہائی کے لیے مظاہرے نہ ہوتے تو اس کے لیے دو سال کی سزا طے تھی۔ جہانزیب کی کہانی سے پُوری طرح واضح ہوتا ہے کہ قبائلی علاقوں کے اندر صورت حال درحقیقت کیسی ہے۔ لوگ طالبان اور سکیورٹی فورسز کی باہمی کشمکش میں پس کر رہ گئے ہیں۔ وہاں کوئی قانون نہیں اس لیے دونوں جانب سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سلسلہ جاری ہے۔

ہماری تاریخ کے شرمناک ترین واقعات میں سے ایک، اسی برس 2011ء میں، کوئٹہ میں پیش آیا۔ تین خواتین اور دو مردوں پر مشتمل ایک نہتے چیچن خاندان کو ایک ناکے پر پولیس نے گولیوں سے بھون دیا۔ پولیس نے دعویٰ کیا کہ یہ لوگ دہشت گرد تھے۔ پھر اُن کی ایک تصویر سامنے آئی جس میں سات ماہ کی حاملہ ایک خاتون ہاتھ اُٹھا کر رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ شاید وہ آسمان کی طرف اشارہ کر کے اللہ کا واسطہ بھی دے رہی تھی۔ یہ دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ خدا جانے ایسے کتنے ہی واقعات ہوئے ہوں گے جو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ نہ ہو سکے۔ مشرف حکومت کے کالے کرتوتوں کی فہرست میں شامل ایک اور شرمناک واقعہ ملا ضعیف کے

ساتھ ہونے والا سلوک ہے۔ نائن الیون کے بعد پاکستانی اہل کاروں نے جنیوا کنونشن کے تحت ملنے والے سفارتی استثنیٰ کو پس پشت ڈال کر طالبان کے سفیر کو گرفتار کر کے امریکہ کے حوالے کر دیا۔ 2000ء میں ملا ضعیف سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اُن دنوں وہ اسلام آباد میں ایران افغانستان تناؤ کم کرنے کے لیے سرگرم عمل تھے۔ وہ انتہائی مہذب، بالغ نظر اور نرم گفتار شخصیت کے مالک تھے۔ اپنی کتاب ''طالبان کے ساتھ زندگی'' (My Life with the Taliban) میں انہوں نے بتایا ہے کہ امریکہ کے سپرد کیے جانے کے بعد اُن پر کیا گزری:

> ''انہوں نے میرے چہرے پر لپٹے کالے کپڑے کو ایک جھٹکے سے اُتارا تو پہلی مرتبہ مجھے اندازہ ہوا کہ میں کہاں ہوں۔ پاکستانی اور امریکی فوجی میرے اردگرد کھڑے تھے۔ امریکی فوجی مجھے پیٹ رہے تھے۔ میرے جسم پر باقی رہ گئے کپڑوں کو پھاڑ کر بدن سے الگ کر رہے تھے۔ پاکستانی فوجی چپ چاپ کھڑے یہ منظر دیکھتے رہے۔ بالآخر جب مکمل طور پر مجھے برہنہ کردیا گیا تو خود کو پاسدارانِ قرآن کہلانے والے پاک فوج کے سپاہی، بے شرمی کے ساتھ ہنس ہنس کر امریکیوں کے اس ذلت آمیز سلوک پر اُنہیں داد دینے لگے۔ انہوں نے امریکہ کو سپردگی کی یہ ''تقریب'' میری آنکھوں کے سامنے رچائی۔ یہ لمحات میری روح پر گہرے داغ کی طرح ثبت ہیں۔ تھوڑی سی توقع مجھے ضرور تھی کہ پاکستانی امریکہ کو مجبور کرتے کہ کم از کم یہ سلوک اُن کے سامنے اور اُن کی آزاد اور خود مختار سرزمین پر نہ کیا جائے''۔

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں۔ کسی شخص کا طالبان سے کسی بھی طرح کا واسطہ ہو،

اُسے دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے۔ نائن الیون کے ہنگامے سے قبل پاکستان اُن ممالک میں شامل تھا جو اسلامی امارات افغانستان کو تسلیم کر چکے تھے، پاکستان کے علاوہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات بھی۔ ظاہر ہے کہ افغانستان کے اداروں اور عوام کے ساتھ بہت سے پاکستانیوں کے روابط تھے۔ ہمارے وطن میں طالبان کو بنیاد پرست تو سمجھا جاتا، دہشت گرد ہرگز نہیں۔ جہاں تک القاعدہ کا تعلق ہے تو بہت کم پاکستانی اس نام سے واقف تھے۔ جو واقف تھے وہ انہیں بھی غیر ملکیوں پر مشتمل افغان مجاہدین جیسی ایک جہادی تنظیم سمجھتے۔

اس بات سے قطع نظر کہ دہشت گردی کے ان ملزموں سے کیا کیا جرائم سرزد ہوئے، بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں انصاف کے تقاضے مکمل طور پر نظر انداز کر دیئے گئے۔ کسی بھی مہذب ملک کی پہچان اس کا عدالتی نظام ہی ہوتا ہے۔ پاکستان کے پہلے سے کمزور جمہوری ادارے مزید خطرات سے دوچار ہو گئے۔ مشرف نے بلاامتیاز تمام سطحوں پر قانون کی حکمرانی کو پامال کر کے رکھ دیا۔ جنرل مشرف اپنے اقتدار کو سہارا دینے کے لیے غیر آئینی اقدامات پر مجبور تھے۔ امریکہ کے ساتھ موصوف کا اتحاد ان کی مقبولیت کو تباہ کیے دیتا تھا۔ وہ سمجھوتے پر سمجھوتا کیے جاتے۔ اقتدار پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد بدعنوانی کے خلاف ایک یلغار انہوں نے برپا کر دی۔ بدعنوان آصف علی زرداری جیل میں تھے۔ نواز شریف دور میں اپنے خلاف بنائے گئے مقدمات سے بچنے کے لیے بے نظیر بھٹو پہلے ہی ملک سے باہر تھیں۔ خود نواز شریف طیارہ اغوا کرنے کے الزام میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے تھے۔ اچانک ایک سمجھوتا کر کے مشرف نے نواز شریف کی سزا معاف کر دی اور انہیں سعودی عرب جلاوطن کر دیا۔ 2002ء میں جب موصوف نے اپنے عہدۂ صدارت میں توسیع کے لیے ریفرنڈم کا اعلان کیا تو میں اس وقت تک بھی اُن سے بھلائی کی اُمید لگائے بیٹھا تھا۔

اقتدار پر قبضہ کے خلاف کئی درخواستیں عدالت میں زیرِ سماعت تھیں اسی لیے انہوں نے

2000ء کے آغاز میں ججوں کے نئے حلف کا حکم جاری کیا۔ اس حکم کے تحت ججوں کے لیے یہ لازم قرار دے دیا گیا تھا کہ وہ فوجی حکومت سے وفاداری کا حلف اٹھائیں۔ چند ججوں نے انکار کیا اور احتجاجاً استعفیٰ دے دیا جبکہ بعض کو مشرف نے فارغ کر دیا۔ سپریم کورٹ اس بات پر مصر تھی کہ جنرل پرویز مشرف 12 اکتوبر 2002ء تک عام انتخابات کرا دیں لہٰذا وہ جمہوریت کی بحالی کے بعد بھی، اپنی صدارت برقرار رکھنے پر تلے ہوئے اور بطور فوجی صدر قانونی جواز حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ میری پارٹی کی مرکزی مجلسِ عاملہ اس موضوع پر ڈیڑھ دن تک بحث کرتی رہی آیا ہمیں اس غیر آئینی تجویز کی حمایت کرنی چاہیے یا نہیں۔ بالآخر پرویز مشرف نے تین سال کے اندر جمہوریت بحال کرنے کا وعدہ کر لیا۔ ہم کسی نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو میں نے مشرف کو فون کیا۔ بحث میں شریک میری پارٹی کے تمام ارکان کو انہوں نے دعوت دی کہ ہم اس سے بات کریں۔ فوجی بزرجمہر نے قائل کرنے کی کوشش کی کہ کرپشن کا خاتمہ کرنے کے لیے مزید پانچ سال اسے صدارت کی ضرورت ہے۔ تحریک انصاف کی مجلس عاملہ کو شیشے میں اتار لینے میں وہ کامیاب رہے۔ سنٹرل ایگزیکٹو کے وہ ارکان بھی مان گئے جو ہر چیز پر شک کرنے کے عادی تھے۔ اس کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ نواز شریف اور بے نظیر ادوار کی نااہلی اور کرپشن کی ناگوار یادیں ذہنوں میں تازہ تھیں۔ اندیشہ یہ دامن گیر تھا کہ پھر سے یہی لوگ واپس آ جائیں گے۔

یہ ریفرنڈم بہت بڑی بدنامی کا باعث ہوا۔ ہر طرف سے دھاندلی کے الزامات کی بوچھاڑ تھی۔ مشرف کا دعویٰ یہ تھا کہ 50 فی صد ووٹروں نے حق رائے دہی استعمال کیا۔ ان میں سے 98 فی صد نے آئندہ پانچ برس تک اُن کے صدر رہنے کی توثیق کر دی ہے۔ سچائی سے اس دعوے کا دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ بلکہ قومی سطح پر یہ واقعہ ہماری شدید بدنامی کا باعث بنا۔ حکومت نے ریفرنڈم مخالف ریلیوں پر پابندی لگا کر تمام وسائل ووٹنگ کی شرح بڑھانے میں جھونک

دیئے تھے۔ فراڈ ریفرنڈم کی حمایت پر میری پارٹی کی بہت رسوائی ہوئی چنانچہ بعد ازاں اپنے اس فیصلے پر عوام سے مجھے مسلسل معافی مانگنا پڑی۔ یہ میری پارٹی اور خود میرے لیے ایک سبق تھا کہ آئندہ کبھی کسی بھی غیر آئینی اقدام کی حمایت نہ کی جائے، کبھی نہ کی جائے۔

واشنگٹن کو ان تمام معاملات سے لاتعلق رہنے میں ہرگز کوئی پریشانی لاحق نہ تھی۔ امریکی نائب خارجہ ڈونلڈ کیمپ سے ''نیویارک ٹائمز'' نے اس ریفرنڈم کے بارے میں پوچھا تو اُن کا کہنا تھا، ''پاکستان کے سیاسی امور پر کسی رائے کا اظہار میں نہیں کرنا چاہتا''۔ ''لاتعلقی'' کا یہ سلسلہ دس سال تک جاری رہا۔ امریکہ اُس وقت بھی خاموش رہا جب پاکستان کی مکروہ سیاسی مافیا کے لیے مشرف حکومت کے دروازے کھول دیئے گئے۔ فوجی حکومت خود کرپشن سے آلودہ ہوگئی اور بری طرح آلودہ پرویز مشرف نے ہر چیز پر سمجھوتا کر لیا تھا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ مشرف حکومت میں درجنوں وفاقی وزراء ایسے تھے جن میں سے اکثر کو وزارت سیاسی رشوت کے طور پر ملی تھی۔ نیب (National Accountability Bureau) حزب اختلاف کو ہراساں کرنے کا ایک ہتھیار بن چکا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اختیار اور طاقت کے حصول کی تگ ودو میں مشرف ہمیں نواز شریف اور بے نظیر کے دور میں واپس لے گیا۔ قومی مفاہمت کا قانون (National Reconciliation Ordinance) پاکستانی قوم کے لیے مشرف کا سب سے بڑا جرم تھا۔

2007ء کے اوائل میں اختیارات کی تقسیم پر یہ ایک سوچی سمجھی ڈیل تھی جس کے تحت مشرف کے دوبارہ صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کے عوض بینظیر بھٹو کو وزیراعظم بننے کا موقع مل جاتا۔ سمجھوتے کے ثالث امریکہ اور برطانیہ تھے۔ آصف علی زرداری اور بے نظیر کے علاوہ 1986ء سے 1999ء کے درمیان آٹھ ہزار سے زائد ایسے افسروں، اہلکاروں، بینکاروں اور سیاستدانوں کو عام معافی دے دی گئی جن پر کرپشن اور فوجداری نوعیت کے سنگین الزامات تھے۔

قومی احتساب بیورو کی جانب سے سپریم کورٹ میں پیش کی جانے والی دستاویزات کے مطابق اُن لوگوں پر پاکستان کے 1060 ارب روپے لوٹنے کے الزامات تھے جن میں سے بینظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کا حصہ 140 ارب تھا۔ ماضی میں بینظیر اور آصف زرداری کے خلاف سوئٹزرلینڈ میں درج مقدمات کی اسی کی عدالتوں میں پیروی کی جاتی رہی۔ پاکستان کے قومی خزانے سے 2 ارب روپے کی رقم خرچ کی جا چکی تھی۔ اس این آر او کی وجہ سے قتل کے ہزاروں مقدمات بھی ختم ہوگئے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایم کیو ایم کے کارکن ان کے مرتکب تھے۔

امریکہ اور برطانیہ اپنے ملک میں ایسے کسی اقدام کی کبھی، کسی صورت اجازت نہ دیتے۔ ان کی اصل ترجیح قانون، امن اور انصاف ہرگز نہ تھا مگر دہشت گردی کے خلاف جنگ تھی۔ امریکہ کو پاکستان میں ایسی کٹھ پتلی حکومت درکار تھی جو قبائلی علاقوں میں بم باری پر ضمیر کی کوئی خلش کبھی محسوس نہ کرے۔ نہ ہی مجبوری کے جانی نقصان سے اس کا دل کانپے۔

2001ء سے 2003ء تک اسلام آباد میں برطانیہ کی ہائی کمشنر ہیلری سینوٹ (Hilary Synnott) کا کہنا ہے کہ دہشت گردوں کے معاملے میں مشرف منافقت میں مبتلا تھے۔ اس نے اپنی کتاب (Transforming Pakistan: Ways out of Instability) میں لکھا ہے:

> ''بش انتظامیہ کی مشکل یہ تھی کہ وہ مخمصے کا شکار تھی۔ اُس کا اندازہ تھا کہ دہشت گرد گروپوں کے حوالے سے دھوکا دہی کے باوجود پاکستان میں مشرف کا برسراقتدار رہنا ضروری ہے۔ دوسری طرف امریکہ الیکشن کے انعقاد کی حمایت اور جمہوریت کی طرف پیش رفت کی بات بھی کرتا۔ صحیح معنوں میں انصاف پر مبنی جمہوری انتخابات

کے نتیجے میں اس بات کا زیادہ امکان نہیں کہ پاکستان کو ایک ایسی مؤثر حکومت میسر آتی جو امریکہ کی مدد جاری رکھتی۔ اس مسئلے کا واحد حل یہی تھا کہ پرویز مشرف اور سیاسی قیادت کا سمجھوتا کرا دیا جائے جو الیکشن جیت سکتی ہو۔ امید یہ تھی کہ اس طرح پاکستان اور امریکی مفادات کو کم سے کم نقصان پہنچے گا۔"

بلاشبہ دونوں ہی فریقوں کو اس سے نقصان پہنچا مگر پاکستان تباہی سے دوچار ہوا۔ این آر او کے ذریعے پاکستانیوں کو یہ تاثر دیا گیا کہ بے نظیر بھٹو کو دوبارہ اقتدار میں لایا جا رہا ہے، امریکی مفادات کی خاطر! امریکہ نے بے نظیر کو جیتے جی مار دیا۔ بہت بعد میں وکی لیکس کا یہ انکشاف بھی سامنے آیا کہ آصف علی زرداری نے امریکی سفیر سے کہا تھا کہ بے نظیر پاکستان کا رُخ نہ کریں گی جب تک امریکہ کی طرف سے ایسا کرنے کا واضح اشارہ نہیں مل جاتا۔ بے نظیر کی موت سے چند ہفتے قبل میں ایک کانفرنس کے لیے دہلی میں تھا۔ میں کشمیری سیاست دان محبوبہ مفتی سے باتیں کر رہا تھا جب جارج ڈبلیو بش کا بھائی جب بش (JIB BUSH) وہاں آ پہنچا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "کیا لوگ بے نظیر واپسی پہ خوش ہیں؟ پر جوش ہیں؟" میں نے جواب دیا: "وہ ایک چلتی پھرتی مردہ عورت ہے۔ ایک طرف وہ القاعدہ اور طالبان کے حوالے سے امریکی پالیسی اختیار کر کے دہشت گردوں کا ہدف بن چکی۔ دوسری طرف اسے ان سیاستدانوں کو بھگتنا ہے جنہیں اقتدار چھن جانے کا خوف ہے۔ وہ بھی بے نظیر کو نشانہ بنانے کی تاک میں ہیں۔ وہ اُسے قتل کر کے الزام طالبان پر لگا سکتے ہیں۔"

بے چاری بے نظیر کے پاس کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ وہ اُس وقت بچ کر نکل سکتی تھی جب 3 نومبر 2007ء کو مشرف نے ہنگامی حالت نافذ کی تھی۔ بے نظیر الیکشن کا بائیکاٹ کر کے دبئی چلی گئی۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ پہلی کے بعد اُس کی باقی عوامی ریلیاں مؤثر نہ رہی تھیں۔ مشرف

کے ساتھ ڈیل اور امریکہ کا طفیلی ہونے کے تاثر نے اُس کی مقبولیت کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ افسوس کہ امریکہ کے دباؤ پر اُس نے اپنا فیصلہ تبدیل کیا اور محض اڑتالیس گھنٹے بعد وطن لوٹ آئی۔ آخر کار پرویز مشرف نے دوسری مدت کے لیے صدارت کا حلف لینے کے بعد آرمی چیف کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا لیکن دسمبر میں بے نظیر بے چاری راولپنڈی میں اپنی انتخابی مہم کے دوران خودکش حملے کا شکار ہو گئی۔

آصف علی زرداری نے اس بھیانک قتل کے ذمہ دار افراد کو کیفر کردار تک پہنچانے کا اعلان کیا لیکن تفتیش میں اب تک پیش رفت نہیں ہوئی۔ بے نظیر کا قتل بھی پاکستانی تاریخ کے اُن پراسرار واقعات میں شامل ہو چکا ہے جن کے بارے میں محض اندازے اور قیاس آرائیاں ہی ممکن ہیں۔ سرکاری ترجمان نے قتل کا ذمہ دار طالبان لیڈر بیت اللہ محسود کو ٹھہرایا۔ اس حوالے سے پیپلز پارٹی کا طرزِ عمل ناقابل فہم تھا۔ وہ کئی قوتوں کو مجرم قرار دیتے رہے۔ کبھی اسٹیبلشمنٹ کا نام لیا، کبھی طالبان اور کبھی قاف لیگ کا پھر اقوام متحدہ سے انکوائری کا مطالبہ کر دیا گیا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ ایک ایسی پارٹی جو خود برسر اقتدار ہو، خفیہ ایجنسیاں جس کے ماتحت ہوں، وہ اقوام متحدہ سے تحقیقات پر اصرار کیوں کرتی رہی۔ پارٹی اب بھی اقتدار میں ہے اور سانحے کو ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ تین سال میں ہونے والی اقوام متحدہ کی انکوائری اپریل 2010ء میں سامنے آئی۔ رپورٹ میں مشرف کو مقتول لیڈر کو پورا تحفظ فراہم نہ کرنے کا ذمہ دار بتایا گیا۔ پولیس اور انٹیلی جنس اہلکاروں پر الزام تھا کہ انہوں نے تفتیش میں رکاوٹ ڈالی۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ سب کچھ معاملے کو چھپانے کی کوشش ہے۔ جس کسی نے بھی جائے وقوعہ کو عجلت میں دھلوایا اُس نے تفتیش کے عمل کو ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار کیا۔ ان واضح حقائق تک پہنچنے کے لیے تین برس تک اقوام متحدہ کی تحقیقات کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ عدالتوں سے پرویز مشرف کے وارنٹ کئی بار جاری ہوئے۔ وہ عدالت میں پیش کیوں نہیں ہوتا؟ اسے لایا کیوں

نہیں جاتا؟ تفتیش کیوں آگے نہیں بڑھتی؟ ہر طرف خاموشی کیوں ہے؟

2007ء میں جب میں جیل سے رہا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ مشرف کی مخالفت میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے۔ اب وہ دھاندلی کر کے بھی الیکشن جیت نہیں سکتا۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے سیاسی اتحاد اے پی ڈی ایم کو الیکشن میں حصہ لینا چاہیے۔ دوسری سیاسی جماعتیں اور وکلاء تحریک کے رہنما مگر اتنے پُراعتماد نہ تھے۔ مشرف نے انتخابی مہم کے لیے ہمیں پانچ ہفتے دیئے۔ ہنگامی حالت بدستور نافذ تھی۔ میڈیا پر دباؤ، نگران حکومت، مقامی انتظامیہ، خفیہ ایجنسیاں، الیکشن کمیشن اور عدلیہ سب مشرف کے ہاتھ میں تھا۔ ہمارے سیاسی حلیفوں کا خیال تھا کہ منصفانہ الیکشن کی ہرگز کوئی اُمید نہیں۔ اگر وہ جیت گیا تو وہ ان انتخابات کو چیف جسٹس کے خلاف عوامی ریفرنڈم قرار دے گا اور ان کٹھ پتلی ججوں کو قانونی جواز میسر آ جائے گا جنہیں وہ عدلیہ میں شامل کرتا جا رہا تھا۔ ایسا ہوا تو ایک خودمختار عدالتی نظام کی تمام اُمیدیں خاک میں مل جائیں گی۔ امریکہ کو اس کی ہرگز کوئی پرواہ نہ تھی۔ امریکی دفتر خارجہ آزادانہ الیکشن اور ہنگامی حالت کے خاتمے کی بات تو کرتا لیکن ججوں خاص طور پر چیف جسٹس کی بحالی کا کوئی ذکر نہ ہوتا۔ 2011ء میں وکی لیکس کے انکشافات منظر عام پر آئے تو یہ بھی واضح ہوا کہ امریکی سفیر این ڈبلیو پیٹرسن چیف جسٹس کی بحالی کے حق میں نہیں تھیں۔ اگر جج بحال نہ ہوتے تو منصفانہ انتخابات کیونکر ممکن ہوتے؟ کیا یہ بات مشرف پر چھوڑی جا سکتی تھی؟ یعنی وہ خود یہ بات طے کرے کہ آزادانہ اور منصفانہ الیکشن کے تقاضے کیا ہوتے ہیں؟

مشرف مخالف پارٹیوں کے اتحاد اے پی ڈی ایم نے 24 نومبر کو بائیکاٹ کا اعلان کیا تو حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ پراسرار طور پر اور اچانک نواز شریف کو وطن واپس آنے کی اجازت دے دی گئی حالانکہ واضح طور پر وہ دس سال کے لیے سیاست سے علیحدگی کا سمجھوتا کر چکے تھے۔ اس واقعہ نے اس شک کو اور تقویت دی کہ پس پردہ بیرونی قوتوں کا کردار فیصلہ کن

ہے۔ برطانیہ اور امریکہ بھی سیاسی پارٹیوں پر انتخابی عمل میں شرکت کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ نام نہاد "لبرل اتحاد" کی کامیابی کے بعد قانونی جواز میسر آ سکے۔ الیکشن بائیکاٹ کے اقدام میں کلیدی کردار ادا کرنے کے بعد نواز شریف فیصلے سے انحراف کی طرف مائل ہونے لگے۔ آخر میں موصوف نے امریکہ، برطانیہ اور سعودی عرب کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ ہم سب سے غداری کر گئے۔ مجھے یاد ہے کہ اے پی ڈی ایم کے ایک اجلاس کے دوران وہ برطانوی وزیر خارجہ کا فون سننے کے لیے 40 منٹ تک غائب رہے۔ اے پی ڈی ایم میں شامل باقی جماعتوں کی اکثریت نے اپنے فیصلے پر قائم رہتے ہوئے بائیکاٹ کیا۔ میری پارٹی اور مذہبی ہی نہیں علاقائی اور سیکولر نظریات کی حامل جماعتیں بھی اس اقدام میں شامل تھیں۔ بعد ازاں پتا چلا کہ سب سے اہم پشتون جماعت، عوامی نیشنل پارٹی کے قائد اسفند یار ولی کو بھی امریکی دورے کے دوران الیکشن لڑنے پر مائل کیا گیا۔ 2008ء کے انتخابات کا مقصد پاکستان میں جمہوریت کا قیام نہ تھا جس کے لیے وکلاء تحریک اور میری پارٹی نے سول سوسائٹی کی مدد کے ساتھ جان توڑ جدوجہد کی تھی۔ ہم لوگ بش انتظامیہ کے ساتھ مل کر ساز باز کرنے والے ذاتی مفادات کے غلام سیاست دانوں کی بے وفائی کا شکار ہوئے تھے۔ 2004ء تک عراق اور افغانستان میں جنگ، تیزی سے بڑھتی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور پاکستان میں خود مختاری کی پامالی کے واقعات پر عوام کا اشتعال پیہم بڑھ رہا تھا۔ عراق پر امریکی حملہ، مسلم عوام کے اس خیال کو پختہ کرنے میں آخری تنکا ثابت ہوا کہ امریکہ نے اسلام کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے۔ امریکہ کے ساتھ پاکستان کے اتحاد نے انہیں غصے سے بھر دیا۔ جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے، وزیرستان میں مشرف کے فوجی آپریشن پر قبائلی پشتونوں نے فوج کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ اہم ترین موڑ ثابت ہوا۔ یہی وہ سال تھا جب سی آئی اے نے قبائلی علاقوں میں ڈرون حملوں کا سلسلہ شروع کیا۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ جہادی گروپ جنہیں آئی ایس آئی

اور سی آئی اے نے سوویت جنگ کے لیے تربیت دی تھی، پاک فوج کے خلاف صف آراء ہو گئے۔ ان گروپوں کے نظریاتی عنصر کے باوصف یہ لوگ پاکستانی طالبان کہلائے۔ ان میں سے ایک لیڈر الیاس کشمیری تھا جسے ماضی میں آئی ایس آئی کا اعزاز یافتہ ''اثاثہ'' سمجھا جاتا تھا۔ وہ کشمیر میں جہاد کے لیے ایک گروپ میں نمایاں رہا تھا لیکن 2004ء کے بعد وہ فوج کے خلاف ہو گیا۔ 2011ء کے ایک ڈرون حملے سے اپنی ہلاکت تک اُس نے پاک افواج پر کئی حملے کیے۔

2004ء کے بعد فوج اور پولیس پر حملوں میں زبردست اضافہ ہو گیا۔ آئی ایس آئی اور ایف آئی اے کے دفاتر اور پاک فضائیہ کے اہلکاروں کو نشانہ بنایا گیا۔ خود مشرف بھی ان حملوں کا ہدف رہا۔ کئی بار اس کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ 2009ء میں آرمی ہیڈ کوارٹرز راولپنڈی کو انتہائی بے خوفی کے ساتھ ہدف بنایا گیا جس میں 6 فوجی جاں بحق ہوئے۔ لال مسجد کے معاملہ نے بھی افواج اور پولیس کے خلاف بڑھتی ہوئی کارروائیوں میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ 2007ء میں فوج نے اسلام آباد کی لال مسجد میں کارروائی کی تھی۔ مسجد اور مدرسے میں محصور بہت سے طالب علم جاں بحق ہوئے۔ کئی مہینوں سے مقامی حکام اور مدرسے کے طلبا میں تناؤ بڑھ رہا تھا۔ حکومت نے معاملات کو پیچیدہ تر ہونے دیا حالانکہ یہ وقت تھا جب محض پولیس کی مدد سے قابو پایا جا سکتا تھا۔ مدرسے کے طالب علم انتہا پسند تھے، دہشت گرد نہیں۔ صرف اُن جرائم کی انہیں سزا دی جانی چاہیے تھی جو اُن سے سرزد ہوئے تھے۔

یہ طالب علم مشرف کے مخالفین کو بھڑکا رہے تھے۔ وہ اسلام آباد میں ہونے والی ان سرگرمیوں کے خلاف عملی اقدامات کرتے جو ان کے خیال میں غیر اخلاقی تھیں۔ وہ ڈی وی ڈی کی دکانوں کے مالکان کو دھمکاتے۔ انہوں نے کچھ چینی خواتین کو اغوا بھی کیا جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ جسم فروشی کا دھندا کرتی ہیں۔ وہ مدرسوں میں اصلاحات، سرکاری زمین پر بلا اجازت بننے والی مسجدوں کے انہدام اور معاشرے پر مغربیت مسلط کرنے کی کوششوں پر مبنی

جرنیلی اقدامات پر غضب ناک تھے۔ ان کے نزدیک مشرف مغرب کا ایک طفیلی تھا جو اسلام کو تباہ کرنے پر تلا تھا۔ یہ ایک مثال ہے جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ مغرب کے کٹھ پتلی حکمران مسلم دنیا میں کس طرح انتہا پسندی کی آگ بھڑکاتے ہیں۔

مغرب زدہ اشرافیہ کی طرف سے پرویز مشرف پر شدید دباؤ تھا کہ وہ مدرسے پر چڑھائی کرے۔ اس کی مقبولیت 2004ء سے پہلے ہی زوال پذیر تھی۔ اسی سال وکلاء تحریک نے اس کی شہرت بری طرح مجروح کر دی تھی۔ مشرف نے سوچا کہ یہ مغربی پشت پناہوں سے داد وصول کرنے کا ایک سنہری موقع ہے۔ اس نے ضرورت سے کہیں زیادہ سختی کے ساتھ صورت حال سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر پانی، گیس اور بجلی منقطع کر دی جاتی، اگر انتظار کیا جاتا کہ طالب علموں کی ہمت کب ٹوٹتی ہے، آخر یہ گرمیوں کا موسم تھا، کتنے دن وہ مزاحمت کر سکتے؟ جانتے بوجھتے ہوئے کہ عمارت کے اندر خواتین اور بچے بھی موجود ہیں، اس نے فوج کو کارروائی کا حکم دیا۔ اس کے بعد درحقیقت کیا ہوا؟ کئی طرح کی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ مذہبی رہنماؤں کا ایک وفد بات چیت کے ذریعے معاملہ حل کرنے بھیجا گیا۔ اخبارات کے مطابق طالب علم کچھ مطالبات تسلیم کرنے پر ہتھیار ڈالنے کو تیار تھے۔ حتمی کارروائی سے کچھ دیر پہلے میڈیا کو بتایا گیا کہ مسجد میں صرف 14 رائفلیں موجود ہیں۔ قاف لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین مسجد کے اندر جانے والے آخری شخص تھے۔ اس کے بعد کارروائی شروع کر دی گئی۔ ان کا کہنا ہے کہ معاملات انہوں نے طے کر لیے تھے۔ معاہدے کے مطابق وہ ہتھیار ڈال کر مسجد سے باہر آ جاتے۔ جب انہیں پتا چلا کہ مشرف سمجھوتا کرنے پہ آمادہ نہیں تو وہ ششدر رہ گئے۔ انہوں نے وزیر اعظم شوکت عزیز کو فون کیا۔ پتا چلا کہ موصوف شب دو بجے خاندان کے ساتھ قلفی نوش فرمانے بازار تشریف لے جا چکے ہیں۔ اس واقعہ کا ذکر ہو تو چودھری شجاعت جذباتی ہو جاتے ہیں، آنسوؤں کے ساتھ رو دیتے ہیں۔ اب بھی ان طالب علموں کے

چہرے انہیں دکھائی دیتے ہیں جنہیں زندہ جلا دیا گیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کے بعد جو تباہی آئی اس میں کتنی جانیں گئیں۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ سو کے قریب دہشت گرد اور طالب علم جاں بحق ہوئے۔ جماعت اسلامی کے رہنما قاضی حسین احمد کے مطابق مرنے والوں کی تعداد سات سو سے زائد ہے۔ کوئی تحقیقات نہ ہوئی۔ اس جگہ کو سیل کر کے لاشوں کو بے نام قبروں میں دبا دیا گیا۔ یہ سانحہ رونما ہوا تو لندن میں اے پی ڈی ایم کی پہلی کانفرنس جاری تھی۔ قتل عام کے بعد کہرام مچا اور ملک بھر میں جذبات بھڑک اٹھے۔ مغرب کے معنوی فرزندوں کو مگر ادراک نہ تھا کہ نتیجہ کیا ہوگا۔

دن کی روشنی میں دیکھے جانے والے خواب اور مشرف کا جوش و خروش اس کے لیے تباہی لایا۔ لال مسجد پر حملے کے نتیجے میں پاکستانی عوام اس کے خلاف بپھر کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ فقط مذہبی مسلکے کی بجائے ان لوگوں نے خوں ریزی کو طبقاتی پہلو سے دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ مدرسے کے طلبا سے سفاکانہ رویے کا سبب یہ ہے کہ وہ غریب اور درماندہ بچے تھے۔ عوام کی رائے میں حکومت کا اندازِ فکر یہ تھا کہ اس قتل عام پر کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ اگر ان طلبا کا تعلق امیر زادوں کے انگریزی سکولوں سے ہوتا تو کیا ایسا ہی بہیمانہ سلوک کیا جاتا؟ 2008ء کے الیکشن پرویز مشرف کے لیے بربادی لے کر آئے۔ شیخ رشید قاف لیگ کے ممتاز ترین عہدیداروں میں سے ایک تھے مگر وہ بری طرح ہارے حالانکہ وہ چھ بار اسی حلقے سے شان و شوکت کے ساتھ جیتے تھے۔ شیخ صاحب نے بعد میں کہا کہ عوامی ذہنوں پر لال مسجد کے زخموں نے نمک چھڑکا۔ لال مسجد کے طلبا کی اکثریت کا تعلق سوات سے تھا۔ انتہا پسندوں نے فوراً ہی بم دھماکوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سانحہ کی وجہ سے سوات میں طالبان آگ کی طرح پھیل گئے۔ مولانا فضل اللہ کی شہرت اب دور دور تک پھیلنے لگی۔ اس شخص کو ''ریڈیو ملا'' کہا جانے لگا۔ اپنے غیر قانونی ایف ایم سٹیشن سے وہ آگ اگلتا رہا۔ وہ ایک بھڑکانے والا خطیب تھا۔ آگے چل

کر میں اس پر مزید بات کروں گا۔

بلوچستان میں مسلح جدوجہد کو بھی مشرف نے سختی کے ساتھ کچلنے کی کوشش کی۔ قیام پاکستان ہی سے کئی بلوچ، ریاست کے خلاف بغاوت کرتے چلے آئے ہیں۔ صوبے کے لیے وہ خودمختاری اور معدنی وسائل سے زیادہ حصے کے آرزومند ہیں۔ رقبے میں ملک کے سب سے بڑے اور آبادی میں سب سے کم صوبے کی آدھی آبادی رلا دینے والے افلاس میں مبتلا ہے۔

2005ء میں عسکریت پسندوں کی سرگرمیاں بڑھیں تو مشرف نے تباہ کن کارروائیوں کے ذریعے ان سے نمٹنے کی کوشش کی۔ 79 سالہ نواب اکبر بگٹی کے ساتھ جو کینسر کے مریض تھے، تنازعہ بڑھا تو پاک فوج کے سربراہ نے ارشاد کیا ''معلوم نہیں کہ کیا چیز اس سے ٹکرائے گی۔ وہ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔'' اسے مار ڈالا گیا، نفرت کے جذبات گہرے ہوئے اور مزید بھڑکے۔ عوامی حقوق کی جدوجہد مسلح جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ بگڑے ہوئے ان حالات نے بھارت کو موقع دیا کہ وہ بلوچستان میں سازشوں کا جال پھیلا دے۔ مقبوضہ کشمیر میں 1989ء کے جعلی الیکشن نے عوامی محرومیوں کے اسی طرح کے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے ہنگامے کی صورت گری کی تھی اسی لیے پاکستان بھارت کے خلاف پیدا ہونے والی صورت حال سے فائدہ اٹھا سکا تھا۔ پاکستانی معیشت آج بلوچستان میں برپا حالات کی بھاری قیمت چکا رہی ہے۔ کتنے قیمتی وسائل، گیس پائپ لائنوں کی حفاظت پہ ضائع ہو جاتے ہیں؟ صوبے میں آباد غیر بلوچ، خاص طور پر استاد اور ڈاکٹر ہراساں ہیں۔ آئے دن ان میں سے کسی کے قتل کی خبر آتی اور ملک بھر میں ہیجان پیدا کرتی ہے۔ اب تک ایک لاکھ غیر مقامی بلوچستان سے ہجرت کر چکے۔ زندگی نہیں اب تو محض جینا ہے، خوف اور اندیشوں کے ساتھ۔

2008ء کے الیکشن پرویز مشرف کا یومِ حساب بن کر آئے۔ بے نظیر بھٹو ڈیڑھ عشرے کے بعد لوٹ کر آئیں تو فوجی آمر سے انہوں نے این آر او کے تحت معاملہ کر لیا تھا۔ مقبولیت

دھندلا گئی مگر ان کے الم ناک قتل نے فضا بدل ڈالی۔ پیپلز پارٹی سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری اگرچہ اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ نواز شریف کو توقع سے زیادہ سیٹیں حاصل ہو گئیں۔ تیاری کا انہیں موقع نہ ملا تھا مگر اے پی ڈی ایم تحریک کا فائدہ انہیں پہنچا کہ ہم لوگوں نے بائیکاٹ کر دیا تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار، صدر مشرف کی سرپرستی کے باوجود اسٹیبلشمنٹ کی حامی جماعت ہار گئی۔

انتخابی عمل کے دوران مشرف نے تباہ کن غلطیاں کیں، فوجی اور سیاسی دونوں طرح کی۔ موصوف کی روشن خیال اعتدال پسندی نے معاشرے سے ان کا تعلق بہت کمزور کیا۔ انتہا پسندوں کو اسی کا فائدہ پہنچا۔

2004ء میں اس نے واشنگٹن پوسٹ کے لیے ایک مضمون لکھا تھا۔ مسلم ممالک کو اس نے نصیحت فرمائی کہ وہ انتہا پسندی اور مسلح جدوجہد ترک کر دیں اور سماجی، معاشرتی ترقی کے زینے چڑھتے جائیں۔ مغربی دنیا خاص طور پر امریکہ سے اس نے اپیل کی کہ وہ سیاسی جھگڑے عدل کے ساتھ طے کرے۔ احساسِ محرومی میں مبتلا مسلم ممالک کی معاشی ترقی کے لیے مغرب از راہ کرم امداد فراہم کرے۔ موصوف کے اس مؤقف سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ فلسطین، کشمیر اور چیچنیا میں انصاف کی ضمانت حاصل کیے بغیر ہتھیار ڈال دیئے جائیں، غیر ملکی تسلط کے خلاف عراق اور افغانستان کے عوام مسلح جدوجہد ترک کر دیں۔ وہ ماضی کے بدنام آمروں کا پیروکار تھا۔ ایران کے رضا شاہ پہلوی اور ترکی کے مصطفےٰ کمال اتاترک کا۔ ان دونوں کا نظریہ بھی یہ تھا کہ مغرب کی اندھا دھند پیروی سے، برق رفتاری کے ساتھ معاشی ترقی اور فروغ کی منازل طے کر سکتے ہیں۔ مغربیت ہی مشرف کے نزدیک جمہوریت تھی مگر مغرب کی پیروی بھی انہوں نے اپنی سہولت کے مطابق کی۔ سب جانتے ہیں کہ مغرب کی بے مثال ترقی سلطانیٔ جمہور، مضبوط اداروں، خود مختار عدلیہ، آزاد پریس اور تعلیم کے فروغ پر استوار ہے۔ مشرف کی راہ بالکل ہی

مختلف تھی۔ اگر کوئی غور کرنے پر آمادہ ہو تو عالم اسلام کے ارتقا کی حکمت عملی میں کوئی ابہام نہ ہونا چاہیے۔ سچی جمہوریت، اظہار رائے کی آزادی، اپنی ثقافت کا فروغ اور سب سے بڑھ کر قانون کی حکمرانی۔ ایسی مغربیت تباہ کن ہے، جس میں اشرافیہ اندھی نقالی پہ اتری رہے۔ مذہبی انتہا پسندی اسی سے بڑھتی ہے۔ اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کو اس سے فروغ کیسے مل سکتا ہے؟

ہماری نام نہاد اشرافیہ کا ایک بڑا حصہ، اردو اخبارات کے بعض کالم نگار جسے اب بدمعاشیہ لکھتے ہیں، اہلِ مغرب کا اندھا پیروکار ہے۔ مشرف نے اس اندازِ فکر کو انتہائی پستی تک پہنچا دیا۔ ایوانِ صدر اور ایوانِ وزیر اعظم میں غیر ملکیوں کے لیے فیشن شو برپا ہونے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سیاست دان کی اہلیہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے کتنی جذباتی ہو گئیں۔ انہوں نے کہا یہ سب دیکھتے ہوئے، کس قدر شرمندگی کا سامنا ہوتا ہے۔ بعض ٹی وی چینلز نے اپنی خواتین کو مغربی لباس پہننے کی تلقین کی۔ میڈیا پر انگریزی زبان کی حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ پریس کانفرنس میں مشرف انگریزی بولتے۔ وزیرِ خزانہ شوکت عزیز نے انگریزی ہی میں سالانہ بجٹ پیش کیا جسے 90 فیصد پاکستانی سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ٹی وی پر لڑکے لڑکیوں کی ملاقاتوں کا اہتمام کرنے کے لیے غائبانہ دوستیوں (Blind Dates) کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس چیز کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ عام پاکستانیوں کے نزدیک، مغرب کے زیر اثر یہ پرلے درجے کی بے حیائی تھی، جس سے خوف اور غصہ بڑھا۔ انہی دنوں میانوالی جانا ہوا تو برہمی سے لوگوں نے کہا: اب خاندان کے سب افراد ایک ساتھ ٹی وی نہیں دیکھ سکتے۔ ہر روز یہ مسئلہ سنگین تر ہوتا گیا۔

یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ ہے، جس نے پاکستان کو بدترین صورت حال میں الجھا دیا۔ زرداری حکومت ملکی تاریخ کی سب سے زیادہ ناپسندیدہ حکومت ہے۔ بے انتہا بدعنوان۔ بے نظیر بھٹو کی موت کے بعد آصف علی زرداری کاغذ کا، ایک ٹکڑا دکھا کر ملک کے صدر

بن گئے اور ان کے کمسن صاحبزادے پارٹی کے چیئر مین۔ ان کا دعویٰ تھا کہ یہ بے نظیر کی وصیت ہے۔ ان کی اس بات پر کوئی یقین نہیں کرتا۔ خود ان کی جماعت کے لوگ بھی نہیں۔ معلوم ہی نہیں کہ نام نہاد وصیت کب اور کہاں لکھی گئی اور زرداری تک کس طرح پہنچی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک نامعلوم آدمی نے انہیں دی تھی۔ وہ شخص کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟

تحریک انصاف واحد پارٹی تھی، جس نے زرداری ایسے شخص کے صدر بننے پر اسلام آباد میں احتجاجی مظاہرہ کیا۔ نئی نسل کو ہم بتا دینا چاہتے تھے کہ مجرمانہ پس منظر کے ایک شخص کو کم از کم میری جماعت قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ اس جلوس سے پہلے سرکاری افسروں نے مجھے اطلاع دی کہ دہشت گرد میرے درپے ہیں۔ بارود سے بھری ایک گاڑی مجھ سے آ ٹکرائے گی۔ میں نے مگر سنی ان سنی کر دی اور کسی کو بتایا تک نہیں۔ آبپارہ سے جلوس روانہ ہوا تو ابر برسنے لگا۔ ٹوٹ کر برستا رہا۔ شاہراہ فیصل سے ہوتے ہوئے، ہم مارگلہ روڈ پر آئے اور شاہراہ دستور پہنچ کر قوم کو بتایا کہ اس پر کیا بیتنے والی ہے۔ وہی شاہراہ جس پر کبھی چیف جسٹس افتخار چوہدری کی بحالی کے لیے میدان جنگ سجا تھا۔ رنج کا شکار اکثر دوسری پارٹیاں مایوسی کے عالم میں خاموش رہیں۔ ان میں سے کچھ خوف زدہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کرپٹ سیاستدانوں کی کسی بھی کمزوری کو آصف علی زرداری، کمال عیاری کے ساتھ ان کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ عجیب طرز عمل میاں محمد نواز شریف کا تھا۔ اپنے اقتدار میں انہوں نے زرداری کو جیل میں ڈالے رکھا۔ قومی خزانے سے کروڑوں روپے ان کے خلاف مقدمات پر صرف کئے۔ لیکن اب وہ ان کے سب سے بڑے اور خاموش حامی تھے۔ اس شخص کے کاغذاتِ نامزدگی پر کوئی اعتراض تک انہوں نے نہیں کیا۔ اپنا دل انہوں نے اس شخص سے صاف نہ کر لیا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ زرداری کو برت کر، پرویز مشرف سے نجات پائی جائے۔ انہیں خطرہ یہ بھی تھا کہ کہیں زرداری ان کے کرتوت منظرِ عام پر نہ لے آئیں۔

الیکشن کا ایک مثبت نتیجہ بھی نکلا۔ دہشت گردی کے واقعات میں حیران کن کمی آ گئی۔ اس لیے کہ زرداری اور نواز شریف انتخابی مہم کے دوران سیاسی حل پہ زور دیتے آئے تھے۔ یہ تاثر بھی انہوں نے دیا کہ خیبر پختون خواہ میں، فوجی کارروائی کے وہ خلاف ہیں۔ مئی 2005ء تک ایسی صورت رہی۔ امریکی دباؤ کے تحت جب زرداری نے باجوڑ ایجنسی میں فوجی کارروائی کی اجازت دے دی۔ کچھ دن بعد اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل پر خوفناک حملہ ہوا۔ یہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ افطاری کے وقت مارگلہ روڈ کی نگراں چوکی پر پولیس کی لاپرواہی سے فائدہ اٹھا کر بارود سے بھرا ٹرک ہوٹل کے مرکزی دروازہ سے جا ٹکرایا۔ وسیع و عریض عمارت کی وسعت میں آگ کے شعلے دور دور تک پھیل گئے۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ ایک کلومیٹر دور ایوانِ وزیر اعظم میں جاری افطار پارٹی میں افراتفری پھیل گئی۔ ہوٹل میں بہت سے غیر ملکی مقیم تھے۔ پچاس آدمی ہلاک ہو گئے اور دنیا بھر میں پاکستان کا تاثر اور بھی مسخ ہونے لگا۔ اس واقعے کو باجوڑ میں فوجی کارروائی کا ردِ عمل قرار دیا جاتا ہے۔ زرداری عہد میں نہ صرف دہشت گردی کے تمام پچھلے ریکارڈ ٹوٹ گئے بلکہ کرپشن بھی اس عروج کو پہنچی کہ دنیا میں اس کی مثالیں کم ہوں گی بلکہ شاید نایاب۔ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل نے پاکستان کو سب سے زیادہ بدعنوان ملکوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ سروے ہوئے تو پتہ چلا کہ 70 فیصد پاکستانی شہری زرداری اقتدار کو پرویز مشرف کی حکومت سے زیادہ کرپٹ سمجھتے ہیں۔ لوٹ مار، نااہلی، اقربا پروری، ٹیکس چوری اور اختیارات کے استعمال میں من مانی ملکی معیشت کو دیمک کی طرح چاٹنے لگی۔ سب سے زیادہ المناک بات یہ کہ کسی کو شرم ہی نہ آتی تھی۔

ریلوے، سٹیل ملز، واپڈا، تیل، معدنی گیس کی کارپوریشن اور پی آئی اے، ہٹے کٹے سفید ہاتھی بن گئے۔ ہر سال جو 250 ارب ہڑپ کر جاتے ہیں۔ کرپشن سے ہونے والا نقصان کسی طرح تو پورا کرنا تھا؛ چنانچہ یہ بوجھ عوام پر ٹیکسوں کی صورت میں ڈال دیا گیا۔

پاکستان میں ٹیکس ادا کرنے کی شرح صرف 9 فیصد ہے۔ صرف 25 لاکھ لوگ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ کل آبادی کا دو فیصد۔ قومی آمدن کا انحصار سیلز ٹیکس پہ ہے، جو امیر اور غریب یکساں چکاتے ہیں۔ غریبوں نے امیروں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ نہایت بے شرمی سے مالدار طبقہ فائدہ اٹھاتا اور رتی برابر حیا اسے آتی نہیں۔ 61 فیصد ارکان پارلیمنٹ ایک پیسہ بھی قومی خزانے میں جمع نہیں کراتے۔ 2009ء کے مالی سال میں ارب پتی نواز شریف نے صرف 5000 روپے ٹیکس دیا اور یہ کہا کہ وہ اپنے خاندان کے مقروض ہیں۔ زرداری نے ایک دھیلا بھی ادا نہ کیا۔ استحصال کے، خون چوسنے والے عمل میں جاگیردار پیش پیش ہیں۔ آدھی آبادی زراعت سے وابستہ ہے اور اس پر کوئی ٹیکس ہی نہیں۔ پانچ فیصد زمیندار 37 فیصد زمینوں کے مالک ہیں۔ کچھ بھی ان پر واجب الادا نہیں ہوتا۔ صرف جہانگیر ترین جیسے چند لوگ ہیں، جو رضا کارانہ طور پر ٹیکس دیتے ہیں، اس طرح یہ ملک چلایا جا رہا ہے۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ کی وجہ سے امریکہ جو امداد پاکستان کو دیتا ہے، اس غلیظ نظام کے پھلنے پھولنے میں، وہ مددگار ہے۔ سیاستدان اور حکمران کیوں ٹیکس دیا کریں۔ شاہانہ زندگی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے غیر ملکی امداد موجود ہے۔ وہ معیشت کو سنوارنے کی کوشش کیوں کریں کہ امریکی لیڈروں کی مدد سے وہ لیپا پوتی کر سکتے ہیں۔ یہ صورت ایک اور سوال کو جنم دیتی ہے۔ انکل سام کیا اس وقت بھی پاکستانی بدمعاشیہ کے اخراجات کا بوجھ اٹھاتا رہے گا جب خود اس کی معیشت ڈوب رہی ہے اور بے روزگاری بڑھتی جا رہی ہے۔

تباہی کے راستے پر پاکستانی معیشت بگٹٹ بھاگ رہی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ کا بوجھ وہ اُٹھا نہیں سکتی۔ 2011ء کے اوائل میں ترکی میں ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے آصف علی زرداری نے بتایا: امریکہ سے اب تک 20 ارب ڈالر ملے ہیں جبکہ پاکستان کو پہنچنے والا نقصان کہیں زیادہ ہے: 68 ارب ڈالر۔ فوجی مدد سے ظاہر ہے کہ

اقتصادی بہتری کا ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ غیر فوجی امداد، سیاسی رہنماؤں کے کھاتوں تک پہنچتی اور ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

ایک اور عذاب عالمی بینک اور عالمی مالیاتی فنڈ کے قرضے ہیں، بیمار معیشت کو جو علیل تر کرتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ پاکستان یہ قرضے واپس کرنے کے قابل نہیں۔ ان قرضوں کے علاوہ امریکہ اور یورپ سے حاصل ہونے والی مالی اعانت پاکستانی اشرافیہ کے لیے، مغرب کا تحفہ ہے تا کہ پاکستان امریکی جنگ کا آلہء کار بنا رہے۔ اکتوبر 2010ء میں وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے یورپین پارلیمنٹ سے کہا: اگر آپ اس جنگ میں واقعی فتح کے آرزومند ہیں تو پاکستان کی اقتصادی تعمیر کو ممکن بنائیے۔ پاکستانی اشرافیہ مغرب کو بنیاد پرستی سے خوف زدہ کرتی اور بھیک کا ہاتھ پھیلائے رکھتی ہے۔ باب وڈ ورڈ نے اپنی کتاب اوباما کی جنگ (Obama's War) میں صدر زرداری کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں: ”آپ جانتے ہیں کہ یہ ملک امریکہ سے نفرت کے بخار میں مبتلا ہے۔ وہ مجھے امریکی ٹاؤٹ سمجھتے ہیں آپ کو ہماری مالی مدد کرنا ہو گی تا کہ لوگوں کو کچھ ملے اور میں ان کی کچھ نہ کچھ حمایت حاصل کیے رکھوں۔“

معیشت کے بگاڑ سے عام آدمی کے لیے زندگی دشوار ہے۔ اشیاء صرف گراں تر ہوتی جا رہی ہیں اور افراطِ زر بے حساب۔ سرکاری اہلکار اور پولیس والے اب رشوت کے اور بھی زیادہ خوگر ہو چکے۔ عام آدمی نے امریکہ کی اندھی حمایت کو بہت بری طرح بھگتا ہے۔ کرپٹ سیاستدانوں کی جڑیں اور بھی گہری ہو گئیں، امیر لوگ زیادہ امیر ہو گئے غریب اور زیادہ غریب۔ دہشت گردوں کی تعداد بڑھی اور وہ زیادہ مؤثر ہونے لگے۔ گلیوں میں خون بہتا ہے اخبارات میں خودکشی کی خبریں چھپتی ہیں۔ بجلی اور گیس کے خوف زدہ کر دینے والے نرخ، بھوکے اور بیمار بیوی بچے، بالآخر کوئی تھک کے جان ہار دیتا ہے۔ 2003ء سے اب تک 34000 شہری دھماکوں اور خودکش حملوں اور فوجی کارروائیوں کی نذر ہو چکے۔ لاکھوں افراد فوجی کارروائیوں کے

طفیل بے گھر ہیں۔ قبائلی علاقوں میں خانہ جنگی ہے اور بلوچستان میں بغاوت۔

پاکستان کا دارالحکومت دشمن کے گھیرے میں آئے شہر کی مانند لگتا ہے۔ ناکوں پر ایسی تلاشی گویا ہر شہری مشکوک ہے۔ گویا ان میں کوئی بھی دہشت گرد ہو سکتا ہے۔ پولیس فائدہ اٹھاتی اور اِکا دُکا کمزور کو لوٹ رہی ہے۔ سیاستدانوں کی حفاظت پر کروڑوں لگا دیئے جاتے ہیں۔ اسلام آباد کی 41 فیصد پولیس اسی کام پر مامور ہے۔ لاہور میں شریف خاندان کے گرد 900 باوردی افراد کا حصار مستقل طور پر قائم رہتا ہے۔

اقتدار میں اپوزیشن کا حصہ ہے۔ چالاک زرداری نے کرپشن کے بہت سے مواقع حزب اختلاف کو فراہم کر رکھے ہیں۔ سندھ پیپلز پارٹی کا اور پنجاب نواز شریف کے حوالے۔ کراچی ایم کیو ایم کے سپرد۔ خیبر پختون خواہ کا مال غنیمت اسفندیار ولی خاں کی اے این پی کے لیے مختص۔ کچھ عرصہ پہلے تک مولانا فضل الرحمٰن بھی مرکزی حکومت کا حصہ تھے۔ اب بھی زرداری سے ان کی ملاقات رہتی ہے۔ این آر او کا ثمر یہ ہے کہ کرپٹ وزیر کابینہ میں شامل ہیں۔ رشوت خوری لوٹ مار کا میلہ بن چکی۔ ایسی خوں آشام مفاد پرستی میں انقلاب کا عمل کیسے بروئے کار آئے؟ یہ ہے وہ سوال، جس کا جواب ہمیں تلاش کرنا ہے۔

باب نہم

خانہ جنگی کا حل کیا ہے؟

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے، رہ و رسم شاہبازی

میں 1990ء میں اپنی والدہ کے برکی قبیلے کی دعوت پر پہلی بار وزیرستان گیا یہ افغان سرحد کے ساتھ واقع ہے۔ میری ماں اور والد دونوں کا تعلق پشتون قبائل سے ہے۔ والدہ برکی اور میرے والد آغا جان نیازی تھے۔ سب جانتے ہیں کہ قبائلی علاقہ، انگریزوں کی دست و برد سے محفوظ رہا۔ یہاں کے لوگ بہت غیرت مند اور بڑے ہی جنگجو ہیں۔ اس علاقے سے گزرنے والے عظیم فاتحین میں سے کوئی بھی ان پر حکومت نہ کر سکا۔ سکندر اعظم (323 تا 356 قبل مسیح)، محمود غزنوی (971-1030)، تیمور (1336-1405)، ظہیر الدین بابر (1483-1531)، سرزمین فارس کا نپولین کہلانے والا نادر شاہ (1698-1747) اور موجودہ زمانے کی دو عالمی طاقتیں برطانیہ اور روس، کوئی بھی انہیں شکست نہ دے سکا۔ سرحد کے آخری انگریز گورنر سر اولف کیرو (Sir Olaf Caroe) نے پشتون قبائل کے بارے میں اپنی مشہور

کتاب میں لکھا ہے ”اس خطے نے جو آج افغانستان اور پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے پر مشتمل ہے، پورے ایشیا بلکہ شاید پوری دنیا کے مقابلے میں سب سے زیادہ بیرونی حملہ آوروں کا سامنا کیا، تاریخ میں ایسی کوئی دوسری مثال نہ ہوگی۔

1898ء میں ونسٹن چرچل (Winston Churchill) نے، جو اس وقت جنگی نامہ نگار تھا، اس علاقے سے بھیجی جانے والی اپنی ایک رپورٹ میں کہا تھا ”سرحدی قبائل کبھی کسی کا تسلط قبول نہ کریں گے۔“

ابتداً میں قبائلی علاقوں کا رخ کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھا، لیکن میرے کزن سہیل خان نے جو فرنٹیئر فورس میں خدمات انجام دے رہا تھا، مجھے قائل کر لیا۔ (فرنٹیئر فورس برٹش انڈین آرمی کی رجمنٹوں سے ہی تشکیل دی گئی تھی، جس میں خالص پشتون قبائل سے تعلق رکھنے والے افسر اور جوان لیے جاتے)۔ ہم کانی گرام پہنچے، جنوبی وزیرستان میں میری والدہ کا آبائی علاقہ۔ برکی قبیلہ آج بھی یہاں آباد ہے۔ جیسے ہی میں وہاں پہنچا تو انہوں نے میرا شاہانہ استقبال کیا، ڈھول کی تھاپ پر انہوں نے رقص کیا۔ طیارہ شکن توپوں اور کلاشنکوف، رائفلوں سے بے پناہ ہوائی فائرنگ کی۔ گولیوں کا شور کانوں کو بہرہ کیے دیتا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے مسحور کر کے رکھ دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں ماضی میں سفر کرتا ہوا ان قدیم ادوار میں داخل ہو گیا ہوں، جب شہسواروں کے قافلے قوموں کے مقدر طے کرتے تھے۔ تاحد نظر سبزہ وگل اور پانیوں سے محروم سنسان پہاڑی سلسلے ہر مرد کے کاندھے پر ایک رائفل ہوتی ہے اور ہر ایک جنگجو ہے۔ یہ سب چیزیں اسے دنیا کی سب سے انوکھی اور بے مثال سرزمین بناتی ہیں۔ وہاں نوجوانوں کی کوئی ٹولی ملتی تو وہ مجھے مقابلے کی دعوت دیتے اور نشانہ بازی کا چیلنج کر دیتے۔ نشانہ لگانے کے لیے ہدف ایستادہ کر دیئے جاتے۔ مجھے ان کے مقابلے میں خود کو اہل ثابت کرنا پڑتا۔ کم عمر لڑکوں کو پتہ چل گیا تھا کہ میرا نشانہ اچھا ہے اور وہ بھی میرے ساتھ مقابلے کے خواہش مند

رہتے۔ یوں لگتا تھا کہ ہر مکین اسلحے اور اس کے استعمال سے ایک پیدائشی محبت میں مبتلا ہے۔

اس تندخوئی کے باوجود، پشتون ثقافت کا دوسرا پہلو مہمان نوازی ہے۔ مقامی زبان میں اسے ”مل مسیا“ کہا جاتا ہے۔ پورے اہتمام کے ساتھ آداب کی پاسداری ان قبائل کی نہ ٹوٹنے والی روایت ہے۔ ان کی مہمان نوازی محض بہترین کھانے پینے اور سہولتوں سے تواضع تک محدود نہیں بلکہ ہر قیمت پر حفاظت بھی ہے خواہ اس کے لیے جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ ”ناناوتی“، یعنی ”خون کا بدلہ خون“ کی روایت کو پشتون ثقافت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ برکی قبیلے کی جس شاخ سے میری والدہ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کوئی ساڑھے تین سو برس پہلے ایک خونی جھگڑے کے باعث یہ لوگ اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر جالندھر میں آباد ہوئے تھے۔ انتقامی کارروائیوں سے دامن بچانے یا پھر نسبتاً آسودہ زندگی بسر کرنے کی تمنا میں پشتون گاہے دہلی اور اس سے بھی دور پرے تک کے علاقوں میں آباد ہو جاتے۔ اپنی خواتین کا تحفظ کرنے میں وہ انتہائی سخت واقع ہوئے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ قبائلی علاقوں میں خواتین پردے کا ویسا اہتمام نہیں کرتیں جیسا شہروں میں نظر آتا ہے۔ فاٹا وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ ہے۔ وہاں آپ خواتین کو کھیتوں میں کام کرتا دیکھ سکتے ہیں لیکن جب یہ لوگ شہروں میں منتقل ہوتے ہیں تو خاندان سے باہر کے لوگوں سے میل ملاپ ختم کرنے کے لیے یا تو وہ برقعہ پہننے کی پابندی کرتی ہیں یا پھر گھر کی چار دیواری کے اندر ہی سارا وقت گزار دیتی ہیں۔

پشتونوں کا خاندانی نظام انتہائی مضبوط ہے، جو لوگ قبائلی سرزمینوں کو الوداع کہہ کر دوسرے علاقوں میں منتقل ہوئے وہاں بھی کسی نہ کسی شکل میں روایات کی پابندی لازم بنائی جاتی ہے۔ پشتونوں کی سرزمین افغانستان سے لے کر پاکستان کے قبائلی علاقوں اور وہاں سے پشاور تک پھیلی ہے۔ افغانستان میں پشتون سب سے بڑی نسلی قومیت ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ

پاکستان میں سب سے بڑا پشتون شہر صوبہ سندھ کا دارالحکومت کراچی ہے یہ پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہی نہیں بلکہ اسے ملک کی اقتصادی شہ رگ کا مقام بھی حاصل ہے۔ سمندر کے اس بڑھتے پھیلتے ساحلی شہر کی طرف پشتونوں کی ہجرت 1950ء سے جاری ہے۔ اس وقت کراچی میں لگ بھگ پچاس لاکھ پشتون آباد ہیں۔ اورنگی کی کچی آبادیوں میں سماجی اور ماحولیاتی بہتری کے لیے اورنگی پائلٹ پراجیکٹ کے ہمیشہ یاد رکھے جانے والے بانی ڈاکٹر اختر حمید خان کا کہنا یہ تھا کہ اپنے مضبوط اور مؤثر خاندانی نظام کے باعث قبائلی پشتون باقی نسلی گروہوں سے ہمیشہ آگے رہتے ہیں۔ جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے، قبائلی علاقوں کا سماجی ڈھانچہ اور ثقافت ملک بھر سے مختلف ہے۔ ان کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ وہ لاقانونیت پر کاربند وحشی لوگ ہیں، لیکن اس من گھڑت فرضی تصور میں کوئی حقیقت نہیں قبائل کے لوگ ایک قدیم جمہوری نظام پر کاربند ہیں جس کی بنیاد تمام لوگوں کی عزتِ نفس اور وقار کے تحفظ پر قائم ہے۔ غیرت کے نام پر انتہائی سفاکانہ قتل کی وارداتوں کے باعث جنوبی ایشیا کی ثقافت کو میڈیا میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پسندیدہ تو نہیں مگر ایسا کہ غربت کی دلدل میں دھنسے ہوئے غریب لوگ جو انتہائی مشکل زندگی گزارتے ہیں، ہمیشہ سے اسی طرح وہ اپنے وقار کی حفاظت کرتے آئے ہیں۔ یہ ان کا مزاج ہے اور یہی ان کا قانون بھی۔ قبائلی علاقوں کی جمہوریت عدم مرکزیت پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد جرگے کا نظام ہے۔ جرگہ گاؤں کے سرکردہ افراد کی ایک مقامی کونسل ہوتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے قدیم یونان کی بعض شہری ریاستوں میں ہوا کرتی تھی۔ وہاں آباد خاندان کو زندگی گزارنے کے حوالے سے تمام امور پر بات کرنے کا حق تھا اور ہر شخص کو یکساں اہمیت حاصل تھی۔ کیونکہ فیصلوں میں سب لوگ شریک ہوتے تھے اس لیے ہر فرد اپنی ذمہ داری پوری کرتا تھا اور ایسے معاشروں کو افسر شاہی اور مرکزیت پر مبنی حکومت کی ضرورت نہیں رہتی۔ جرائم سے نمٹنے کے لیے پشتون جرگہ ایک جیوری کی طرح کام

کرتا ہے۔ وہ مفت اور فوری انصاف کی ضمانت دیتا ہے۔ عام طور پر گاؤں کا ہر فرد ملزم سے واقف ہوتا ہے، چنانچہ ضرورت پڑنے پر گھیر گھار کر اسے جرگے کے سامنے لانا بھی مشکل نہیں ہوتا، جھوٹی گواہی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ہر شخص کو معلوم ہوتا ہے کہ کون کتنا بااعتبار ہے۔ قبائلی علاقوں کا نظام انصاف اس قدر کامیاب ہے کہ گزشتہ چند برسوں سے جاری خوں ریزی سے قبل اس علاقے میں جرائم کا تصور بھی کم ہی تھا۔ اس کے باوجود کہ ہر شخص مسلح ہے۔ ان کے نزدیک ہتھیار رکھنا، آزادی کی ضمانت ہے، بالکل اسی طرح جیسے امریکہ کے اولین قانون سازوں نے اپنے شہریوں کو اسلحہ رکھنے کی اجازت دی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، پشتونوں میں انتقام غیرت کا تقاضہ مانا جاتا ہے، کوئی قتل کر دیا جائے تو پورے کا پورا خاندان بدلہ لینے کا پابند ہو جاتا ہے۔ غیرت کا یہ تصور بہت سادہ ہے اور قبل از اسلام سے چلا آرہا ہے۔ یہ ان لوگوں کی فطرت کا حصہ بن چکا۔ 1872ء میں جزائر انڈیمان (Andaman Islands) میں قید کی سزا کاٹنے والے شیر علی آفریدی نے وہاں دورے پر آئے ہوئے وائسرائے لارڈ میو (Viceroy Lord Mayo) کو قتل کر دیا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی قید اس کی غیرت کی توہین ہے۔ اپنے آپ سے اس نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ اس کے بدلے میں کسی اہم برطانوی سرکاری افسر کی جان لے گا۔ اس پس منظر کا ادراک ان سے معاملہ کرنے والے ہر شخص کو ہونا چاہیے۔ جب بھی کوئی ان پر حملہ آور ہوتا ہے، خواہ امریکی ڈرون طیارے، دیہات پر بمباری کریں یا پاک فوج کارروائی کرے، تو صرف ہلاکتیں نہیں ہوتیں، بلکہ آپ نئے دشمن بھی پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔

کیرو (Caroe) لکھتا ہے کہ 1930ء میں فقط پشاور شہر کی حدود میں ایک ہفتے کے دوران قانون شکنی کے واقعات کی تعداد قبائلی علاقوں میں پورے سال کے دوران ہونے والے جرائم سے بھی زیادہ ہوتی۔ برابری اور انصاف پر مبنی اس نظام کے برعکس، سندھ اور پنجاب کی

صورت حال بالکل مختلف ہے جہاں ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' والی کیفیت ہے۔ جاگیردار ہر طرح سے غریبوں کی تذلیل کرنے کے باوجود صاف بچ نکلتے ہیں۔

انگریزوں نے 1901ء میں شمال مغربی سرحدی صوبہ تشکیل دیا۔ پورے علاقے کو انہوں نے قبائلی اور غیر قبائلی میں تقسیم کر دیا بیسویں صدی کے اوائل میں روس وسطی ایشیا کی مسلمان ریاستوں کو روندتا چلا آتا تھا۔ افغانستان کی سرحد تک وہ پہنچ گیا۔ اب برطانیہ اور سوویت یونین کے درمیان، ایک کشمکش کا آغاز ہوا، جسے عظیم کھیل (The Great Game) کہا جاتا تھا۔ روس اور برطانیہ کی آویزش میں بیچ کے اس علاقے کو اور زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔

برطانیہ قبائلی علاقوں پر براہ راست حکومت کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس مقصد کے لئے وہ مسلسل کوشش کرتا رہا تھا جو بالآخر 1870ء میں ایف سی آر، (Frontier Crimes Regulation) کی صورت میں سامنے آئیں۔ قبائلی قوانین پر مبنی یہ نظام آج بھی فاٹا میں رائج ہے۔ اس نظام کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مجرم کو سزا سے زیادہ مدعی کی تشفی پر توجہ دی جائے۔ علاقے میں حکومت کا نمائندہ پولیٹیکل ایجنٹ تنازعات طے کراتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں وہ جرگہ کے فیصلے اور طے شدہ روایات کو تسلیم کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ اس بات کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ ثالثی کے ذریعے امن قائم رکھا جائے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ایف سی آر کے نظام کے ذریعے پورے قبیلے کو بھی سزا دی جاسکتی ہے۔ 1947ء میں آزادی کے وقت صوبہ سرحد کے عوام نے ووٹ کے ذریعے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔ قبائلی علاقے کے عوام 1948ء میں اس شرط پر نئی قوم کا حصہ بنے کہ انہیں اپنے قوانین اور رواج کے تحت زندگی گزارنے کا حق بدستور حاصل رہے گا۔ خیبر پختونخوا مکمل طور پر پاکستان کا حصہ ہے۔ مگر فاٹا ایک نیم خودمختار علاقہ ہے جسے آج بھی نوآبادیاتی نظام کے تحت چلایا جا رہا ہے۔ پاکستانی

حکومت پولیٹیکل ایجنٹ اور قبائلی عمائدین کی مدد سے یہ نظام چلاتی ہے۔ یہ ایجنٹ وفاقی افسر شاہی کا حصہ ہیں۔ علاقے میں صرف 44 پاکستانی قوانین نافذ العمل ہیں، اس طرح مقامی لوگوں کے طرز زندگی میں عدم مداخلت کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی۔ قبائلی علاقے میں پولیس اور عدالتی نظام موجود نہیں جبکہ سڑکوں پر وفاقی قوانین کی عملداری ہے۔ میں خود کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے قبائلی علاقوں میں اپنائیت کے ایسے ماحول میں سفر کرنے کا موقع ملا۔ اس مقصد کے لیے ورنہ خصوصی اجازت نامے اور سرکار کے مسلح حفاظتی دستے کی ضرورت ہوتی ہے۔

قبائلی لوگوں کے بہت سے طور طریقے مسحور کن ہیں۔ خاص طور پر پاوندوں کے ساتھ وقت گزارنا ایک عجیب وجدانی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہ پشتون خانہ بدوش قبائل ہیں جو صدیوں سے موسم گرما وزیرستان اور افغانستان کے پہاڑی علاقوں میں بسر کرتے ہیں۔ موسم سرما کے دنوں میں وہ خیبر پختونخوا اور پنجاب کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ کانی گرام کا سفر کرتے ہوئے ہم نے ہجرت کرتے پاوندہ قبائل کے ایک قافلے کو جالیا۔ اس وقت جب سورج کی روشنی مدھم ہو رہی تھی۔ ہم ایک ندی کے کنارے پر خانہ بدوشوں کے ٹھکانے پر جا نکلے۔

ان قبائل میں بھیڑوں کی حفاظت کرنے والی کوچی کتوں کی اس نسل کو جنہیں ''گدی'' بھی کہا جاتا ہے، بہت شوق سے پالا جاتا ہے۔ اسی نسل کا ایک کتا اس عارضی کیمپ کی حفاظت پر مامور تھا۔ میری شدید خواہش تھی میرے پاس بھی ایسا ہی جانور ہو۔ ہمیشہ سے میں تعریف کرنے والوں سے اس کی تعریف سنتا آیا تھا۔ خود میرے والدین ہمیشہ کوچی نسل کا کتا پالنے کو ترجیح دیتے تھے کہ گھر کی حفاظت کے لیے اس سے بہتر کوئی جانور نہیں۔ خیموں کے پاس ہم پہنچے تو ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا۔ اس نے مجھے پہچان لیا، اور بولا کہ ایک مرتبہ ڈیرہ اسماعیل خان میں اس نے مجھے ٹیلی ویژن پر کرکٹ میچ کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مجھے اپنے

باپ اور چچا کے پاس لے گیا اور ان سے میرا تعارف کرایا۔ بدقسمتی سے ان کے پاس کتے کے پلے نہ تھے۔ پھر بھی ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میرے اردگرد جو منظر تھا وہ ناقابل یقین حد تک دلکش اور دل گداز تھا۔ قافلے نے پورے دن کی مسافت کے بعد ابھی ابھی خیمے یہاں گاڑے تھے۔ بچے بھیڑ بکریوں اور کتوں کے درمیان کھیل کود میں مصروف تھے۔ ایک دادی اماں کم عمر بچوں کو پکڑنے کی کوشش میں تھیں۔ چند عورتیں کھانا پکا رہی تھیں، ایک باپ اپنے بچوں کو ندی پر نہلا رہا تھا۔ میرے اردگرد ہر طرف مکمل اور سچی مسرت کا دل موہ لینے والا ماحول تھا۔

یہ لوگ ایسی سخت زندگی بسر کرتے ہیں، جس کا ہم محض تصور ہی کر سکتے ہیں، مال و دولت کی فراوانی سے محرومی کے باوجود ان کی زبان پر کوئی شکوہ کوئی شکایت نہ تھی۔ ان جفاکش لوگوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ پر یقین اور موت کے بعد زندگی کا تصور اتنا ہی واضح ہے جیسے سورج اور چاند کا وجود ہے۔ اپنے ایک اور سفر کے دوران مجھے پاوندہ قبائل کے ایک اور قافلے سے ملنے کا اتفاق ہوا، وہاں میری ملاقات ایک قبائلی سردار سے ہوئی جس کا بیٹا کچھ عرصہ پہلے افغانستان میں سوویت فوجوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوا تھا۔ اس کی تصویر پر پھولوں کے ہار پڑے دیکھ کر کہ وہ ایک بہت ہی تنومند اور پرکشش نوجوان رہا ہوگا۔ باپ نے کہا ''میرا بیٹا پورے قبیلے کی آنکھ کا تارا تھا۔'' میں نے کہا ''مجھے اس کی شہادت پر افسوس ہے۔'' اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا: تمہیں چاہیے تھا کہ مجھے مبارک دیتے۔ میرے بیٹے نے ایک عظیم مقصد کے لیے موت کو گلے لگایا تھا۔''

پشتونوں کے بارے میں اپنی کتاب ''غیرت مند لوگ'' (The Warrior Race) کے لیے تحقیق کی غرض سے 1990ء اور 1992ء کے دوران میں کئی مرتبہ ان علاقوں میں آیا، جو بات مجھے تکلیف دہ لگی، وہ یہ تھی کہ تعلیم کی سہولیات سرے سے موجود ہی نہیں۔

یہ لوگ اپنی رسوم و رواج کا اس شدت سے دفاع کرتے ہیں کہ برطانوی راج کے

دوران اپنے علاقوں میں انہوں نے سکول بنانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میں جہاں کہیں گیا لوگوں نے مجھے بتایا کہ اب وہ سکولوں کا قیام چاہتے ہیں۔ اس تمام عرصے میں پاکستان کی مختلف حکومتیں وہاں صرف چند تعلیمی ادارے ہی قائم کر سکیں۔ تعلیم کے بغیر قبائلی علاقوں کا کلچر ارتقائی مراحل طے نہیں کر سکتا۔ یہ بات اس لیے اور بھی افسوسناک ہے کہ ان میں تعلیم حاصل کرنے کا بے پناہ شوق اور لگن موجود ہے۔

پشتون ہزاروں برس سے اپنے طرزِ زندگی کے ساتھ احساس کی پوری شدّت سے چمٹے چلے آئے ہیں۔ پاکستان کے دوسرے علاقوں، خاص طور پر پنجابی اور سندھی عوام کے برعکس، صدیوں سے جنہیں جاگیردارانہ نظام کے جبر نے طاقتوروں کے سامنے جھکنے کی عادت ڈال دی ہے، قبائلی لوگ طاقتوروں سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ ان کا جمہوری نظام انہیں اعتماد عطا کرتا ہے۔ اسی خود اعتمادی نے انہیں ایسا بنایا کہ پورے ہندوستان میں صدیوں سے ان لوگوں میں سے عظیم جنرل اور حکمران پیدا ہوتے رہے۔

جاگیردارانہ نظام کی چکی میں پسنے والے غریب لوگ قائدانہ کردار کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس قبائلی پشتونوں کی پرورش ہی کسی پیدائشی لیڈر کی طرح ہوتی ہے۔ یہ ماحول اور مزاج کا فرق ہے کہ برصغیر کے دوسرے حصوں کے برعکس پشتون علاقوں کو فتح کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی جارحیت کا خطرہ ہوا، آپس میں برسرِپیکار قبائل بھی اپنے باہمی تنازعات کو بھول کر ایک ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی مسلّط کردہ دہشت گردی والی جنگ میں چند سو القاعدہ جنگجوؤں کا پیچھا کرتے ہوئے حکومت نے قبائلیوں میں بغاوت پیدا کر دی ہے۔ یہ دس لاکھ مسلح جنگجوؤں کو اپنے درپے کرنے والی بات ہے۔ امریکہ کے دباؤ پر پاک فوج کو قبائلی علاقوں میں بھیج کر، ہم نے پہاڑ ایسی غلطی کا ارتکاب کیا۔ اپنے وجود کو گویا خطرے میں ڈال دیا۔

قبائلی علاقوں کے عوام کا سیاسی قومی دھارے سے واجبی سا تعلق رہا ہے۔ انہیں ووٹ کا حق 1997ء میں دیا گیا۔ اس سے پہلے صرف ملک اور قبائلی عمائدین ہی الیکشن میں حصہ لینے کے اہل تھے۔

اہم سیاسی جماعتوں میں سے اکثر کی نمائندگی قبائلی علاقوں میں موجود ہے لیکن امیدوار الیکشن میں صرف غیر جماعتی بنیادوں پر ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ علاقے ترقی کی دوڑ میں سارے ملک سے پیچھے رہے۔ ایک تو ریاست نے انہیں نظر انداز کیا، ثانیاً پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں پر سڑکوں، پلوں اور عمارتوں کی تعمیر اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ 60 فیصد آبادی غربت کی زندگی گزار رہی ہے۔ کہا جاتا ہے فی کس آمدن پورے ملک کی اوسط سے بھی ایک تہائی ہے۔ زیادہ تر علاقوں میں آمدن کے مواقع محدود اور کاشت کاری دشوار ہے۔ تجزیہ اور تحریک پیدا کرنے کے ایک منصوبے پر کام کرنے والی رضا کار تنظیم The Community Appraisal and Motivation Programme (CAMP) نے علاقے میں کئی سروے کیے۔ مقامی لوگوں سے سوال کیا گیا کہ موجودہ لیڈروں میں وہ کس کو جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے اچھا کون ہے۔ 50 فی صد لوگوں کو یا تو کوئی رہنما سرے سے پسند ہی نہ تھا یا پھر وہ کسی کو جانتے ہی نہ تھے۔ چند سال قبل جب یہی سروے کیا گیا تو میں سرفہرست تھا۔ 13.1 فی صد لوگوں نے میرے حق میں رائے دی۔ زرداری 4.4 فی صد کے ساتھ دوسرے نمبر پر تھے۔ New America Foundation اور Terror Free Tomorrow نے 2010ء ہی میں ایک اور سروے کا اہتمام کیا۔ ان نتائج کے تحت تحریک انصاف 28 فیصد ووٹوں کے ساتھ پہلے نمبر پر رہی۔ دوسری مقبول ترین جماعت نون لیگ کی حمایت 10 فیصد تھی۔ مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علمائے اسلام تھوڑے سے فرق کے ساتھ تیسرے نمبر پر رہی۔

خیبر پختونخوا سے متصل صوبہ بلوچستان کے قبائل بھی اپنی قوت اور تندخوئی کے لیے

معروف ہیں۔ بھلا ہو ان حکمرانوں کا، خواہ وہ برطانوی ہوں یا پاکستانی، سب نے عوام کو کنٹرول کرنے کے لیے ہمیشہ قبائلی سرداروں کو استعمال کیا؛ چنانچہ معاشرتی مساوات پر مبنی یہ معاشرہ انحطاط کا شکار ہو کر جاگیردارانہ سماج میں تبدیل ہوتا گیا۔ بلوچ سردار شیر باز خان مزاری نے اپنی کتاب رائیگانی کا سفر، (A Journey to Disillusionment) میں بالکل درست بات کہی ہے ”اس کے برعکس پشتون اگر دیکھتے کہ کوئی سردار یا ملک برطانوی حاکموں یا مرکزی حکومت کے لیے کام کر رہا ہے تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو جایا کرتے۔ جرگہ کے نظام کے باعث یہ لوگ بحث مباحثہ کی روایت سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ گفتگو کی باریکیوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“ میں نے خیبر پختونخوا سے متصل میانوالی میں جو یونیورسٹی قائم کی ہے لوگ اس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔ نہ صرف مقامی لوگ بلکہ وزیرستان کے عوام بھی اپنے بیٹے بیٹیوں کو تعلیم دلانے کے خواہش مند ہیں۔

قبائلی علاقوں میں خواتین میں ناخواندگی کا تناسب تشویش ناک حد تک زیادہ ہے۔ یعنی صرف تین فیصد عورتیں پڑھی لکھی ہیں جو قومی سطح پر خواتین کی خواندگی اوسط شرح کا ایک تہائی بنتا ہے۔ فاٹا کے مردوں میں تعلیم کی شرح 29.5 فی صد ہے۔

یہ کہنا غلط ہے کہ پاکستان کے قدامت پسند علاقوں کے لوگ اپنی بچیوں کو تعلیم نہیں دلانا چاہتے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بچیوں کو تعلیم کے لیے دور دراز نہ جانا پڑے اور تحفظ کے مناسب انتظامات ہوں۔ سب سے بڑا خوف یہ ہے کہ مغربی تعلیم انہیں اپنی اقدار سے بیگانہ کر دے گی۔ یہ اندیشہ بھی انہیں دامن گیر رہتا ہے کہ غیر ملکی طاقتیں خواتین کو اپنی روایات، ثقافت اور دین سے دور کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ نمل یونیورسٹی میں ہم نے ثقافتی اقدار کے احترام کو یقینی بنایا ہے۔ یہ بات بھی مددگار رہی کہ علاقے میں لوگ مجھے جانتے ہیں اور مجھ پر اعتبار کرتے ہیں۔ ایک محدود سا انقلاب برپا کرنے میں ہم کامیاب رہے۔ لڑکے ہی نہیں

اب قدامت پرست خاندانوں کی لڑکیاں بھی ذوق وشوق سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

بات کو اس سے زیادہ اور کس طرح واضح کیا جائے کہ ان میں سے بعض بڑی حد تک الگ تھلگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ قبائلی علاقوں میں کچھ گاؤں ایسے بھی ہیں جو برسوں سے اپنے حال پر چھوڑے جا چکے۔ افغان سرحد کے ساتھ ساتھ آباد دیہات کے لوگ کھلے عام سرحد کے آر پار آتے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں حکومت نام کی کسی چیز سے کوئی غرض نہیں۔ سرحد کی دوسری جانب افغانستان میں بھی صورت حال مختلف نہیں۔

امریکہ اور اس کے اتحادی تاریخی شعور سے بے بہرہ ہیں۔ پشتونوں کے کردار کو بھی وہ سمجھ نہ پائے۔ استعماری تکبر کی بنیاد پر اکتوبر 2001ء میں انہوں نے افغانستان پر چڑھائی کر دی۔ وہ ایک ایسی سرزمین کو فتح کر لینے کے آرزومند ہیں، جہاں 19 ویں صدی میں برطانیہ اور 20 ویں صدی میں روس کو خاک چاٹنا پڑی۔ یہ جنگ اول روز سے بدقسمتی کا شکار ہے۔ کبھی کسی کو یہاں سے کچھ نہ ملا اور کبھی کسی کو کچھ ملے گا بھی نہیں۔ ممتاز مورخ ٹائن بی نے کہا تھا کہ قوموں کی قسمت کے ستارے یہاں ڈوب جاتے ہیں۔

ایک ایسی فوجی مہم جسے اسلامی انتہا پسندی کے خلاف مقدس جنگ بنا کر پیش کیا گیا تھا، جلد ہی بیرونی حملہ آوروں کے خلاف افغان عوام کی جنگ آزادی میں تبدیل ہو گئی۔ قابض افواج سے افغانستان کے ڈیڑھ کروڑ پشتونوں کی لڑائی پاکستان میں موجود ڈھائی کروڑ افغانوں کو بھڑکانے کا باعث بنی ہے۔ ویت نام اور کمبوڈیا کی طرح امریکہ نے جنگ کو ہمسایہ ملک تک پھیلنے دیا۔ پہلے پرویز مشرف اور بعدازاں آصف علی زرداری نے پاک فوج کو قبائلی علاقوں میں آپریشن پر مجبور کیا۔ تاثر یہ ہوا کہ ہمارے فوجی امریکہ کے لیے بھاڑے کے سپاہیوں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ جہاں کہیں وہ جاتے ہیں، انہیں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی بنا پر قبائلیوں نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ ہم ایک غیر اعلانیہ، تباہ کن خانہ جنگی میں گھر گئے۔

امریکیوں کو شکوہ یہ ہے کہ پاکستان کی جانب سے سرکاری طور پر یا پھر حکومت کے علم میں لائے بغیر عسکریت پسندوں کی مدد کی جاتی ہے جو افغانستان میں اتحادی افواج سے نبرد آزما ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ پشتونوں کے مزاج کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ بدقسمتی سے پرویز مشرف کا معاملہ بھی یہی تھا بلکہ وہ اس معاملے میں آخری درجے کی لاپرواہی یا بددیانتی کا مرتکب ہوا۔ افواج پاکستان اور حکومت میں شامل لوگوں سمیت قوم کی اکثریت اوّل دن سے افغانستان پر حملے کی مخالف تھی۔ جہاں تک پشتونوں کا تعلق ہے ان کے طرزِ فکر میں ہرگز کوئی ابہام نہیں۔ جو کوئی اس خطے کی تاریخ کے بنیادی حقائق سے آگہی رکھتا ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی تعلق کی بنا پر پشتون قبائل سرحد پار اپنے بھائیوں کی مدد کرنا اپنا بنیادی فرض سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بین الاقوامی سرحدیں بے معنی ہیں؛ لہٰذا آج تک کوئی بھی حکومت، خواہ وہ برطانوی ہوں یا پاکستانی، انہیں 2400 کلومیٹر طویل سرحد کے اس پار اپنے بھائیوں کی اعانت سے روک نہیں سکی۔ نہ ہی اُدھر سے اِدھر آنے والے افغانوں کو پناہ دینے سے کسی کو باز رکھا جا سکا۔

افغانستان پر حملے کے فوراً بعد امریکہ نے سفید پہاڑوں میں تورا بورہ غاروں کے سلسلے پر بمباری کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں اسامہ بن لادن (Osama Bin Ladin's) کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ القاعدہ کے چند سو عسکریت پسند سرحد پار کر کے پاکستان کے قبائلی علاقے میں داخل ہو گئے۔ پشتون قبائل نے شاید قدیم روایات کی پاسداری کرتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا۔ امریکیوں کا دعویٰ ہے کہ انہی عسکریت پسندوں نے پاکستانی علاقے میں اپنے ٹھکانے بنا لیے اور وہیں سے امریکی اور نیٹو افواج کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔

مزید برآں انکل سام کو یقین تھا کہ اسامہ بن لادن اور ایمن الزواہری (Ayman -al- Zawahiri) انہی علاقوں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ اتنی سی بات واشنگٹن کی سمجھ نہیں آتی کہ قبائلی

علاقوں پر پاکستان کا کنٹرول محدود اور بالواسطہ ہے۔ مسلسل اور متواتر وہ پاکستان کو قبائل کے خلاف کارروائی پر اکساتا اور دھمکی پہ دھمکی دیتا۔ جو لوگ اس علاقے کو اور اس خطے کے مکینوں کا مزاج سمجھتے تھے پرویز مشرف کو انہوں نے خبردار کیا تھا کہ بغاوت کو ہوا نہ دی جائے۔ 2004ء میں مگر پاک فوج کے گن شپ ہیلی کاپٹروں کی مدد سے ہزاروں فوجیوں نے جنوبی وزیرستان میں پہلے بڑے فوجی آپریشن کا آغاز کر دیا۔ سبکدوش لیفٹیننٹ جنرل اورکزئی (Lieutenant General Aurakzai) کے مطابق شبہ یہ تھا کہ پرویز مشرف پر قاتلانہ حملے کی منصوبہ بندی جنوبی وزیرستان میں ہوئی۔ اسی بات نے اس شخص کو فوجی آپریشن پر آمادہ کیا۔ آپریشن کے وقت پرویز مشرف نے اس علاقے میں غیر ملکی انتہا پسندوں کی تعداد پانچ، چھ سو بتائی تھی۔

جنرل اورکزئی کا کہنا ہے کہ فوج جب قبائلی علاقے میں گئی اور فوجی حکام کا عمائدین سے رابطہ ہوا تو انہوں نے 250 کے قریب القاعدہ جنگجو حکام کے حوالے کر دیئے۔ شکر ہے کہ امریکی دباؤ کے تحت آپریشن کرنے والی فورس کو بھیجنے سے پہلے پشتون افسروں کو الگ کر دیا گیا۔ خود جنرل اورکزئی کو جو قبائلی علاقے میں اسی نام کی ایک ایجنسی سے تعلق رکھتے ہیں، مقررہ وقت سے ایک ماہ قبل سبکدوش ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ ان کی جگہ ایک پنجابی، جنرل میجر جنرل صفدر حسین کو ذمہ داری سونپ دی گئی۔ یہ آپریشن تباہ کن ثابت ہوا اور دونوں طرف بڑے پیمانے پر ہلاکتیں ہوئیں۔ کئی ہفتے کی لڑائی کے بعد معاہدہ ''شکئی'' وجود میں آیا۔ یہ طے پایا کہ اگر غیر ملکی عسکریت پسند رجسٹریشن کرا لیں تو امن کے ساتھ انہیں یہاں رہنے کی اجازت ہوگی۔ یہ معاہدہ زیادہ دیر نہ چل سکا، جس کی وجہ 2004ء میں امریکی ڈرون حملے میں نیک محمد کی ہلاکت تھی۔ اگلے دو برس تک وزیرستان میں آپریشن اور معاہدوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ جب امریکی دباؤ بڑھتا تو یہ سمجھ لیا جاتا کہ علاقہ واقعی دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہ ہے۔

2006ء سے 2008ء تک خیبر پختونخوا میں گورنر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے

والے جنرل اورکزئی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ معاہدے زیادہ تر حکومت کی طرف سے توڑے گئے۔ طالبان نے وعدوں سے انحراف نہ کیا۔ 2006ء میں شمالی وزیرستان میں ہونے والا معاہدۂ میران شاہ بھی، حکومت نے توڑا۔ بعض تجزیہ نگاروں نے اس سمجھوتے پر سخت تنقید کی تھی۔ ان کا موقف تھا کہ اس طرح طالبان کو پاکستان کے مختلف انتہا پسند گروپوں کو ساتھ ملا کر ''تحریک طالبان پاکستان'' کو منظم کرنے، بنیادی ڈھانچے کو وسیع تر کرنے اور اپنی قوت بڑھانے کا موقع مل جائے گا۔ جنرل اورکزئی کے مطابق قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشن الٹا نقصان دہ ثابت ہوا کیونکہ عام لوگوں کی اموات کے باعث مزید لوگ عسکریت پسندوں سے جا ملے۔ مخالف قوتیں متحد ہو گئیں جبکہ حکومت پاکستان اور پشت پناہ امریکہ کے خلاف نفرت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ان کا کہنا ہے ''میں اس بات کے حق میں تھا کہ خاص مقامات کو نشانہ بنانے کی بجائے، قابل اعتبار خفیہ اطلاعات کی بنیاد پر کارروائی کی جائے۔ اس طرح بے گناہ شہری متاثر نہ ہوں گے۔ اگر مقامی لوگ طالبان کے حامی ہوں تو انہیں ڈھونڈ نکالنا ممکن نہ ہوگا۔'' اس حوالے سے جنرل اورکزئی نے ایک واقعہ سنایا: ایک بار وہ ایک امریکی وفد کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے، طالبان کے ساتھ امن معاہدے کی صورت میں ممکن فوائد پر روشنی ڈال رہے تھے۔ انہوں نے کہا ''ہمارا بہت جانی نقصان ہو رہا ہے اور فوجی آپریشن میں شہری اموات کی وجہ سے الٹا دہشت گردی میں اضافہ ہوا ہے'' اس پر ایک امریکی نے صاف صاف کہا ''ہم جو پیسہ تمہیں دے رہے ہیں، وہ لڑنے کے لئے ہے، امن معاہدوں کی وکالت کے لئے نہیں۔'' پاکستان کو قبائلی علاقوں میں اور مسلسل مزید کارروائی کے امریکی دباؤ کی بھاری قیمت چکانا پڑ رہی ہے۔

ہمارے غلام حکمران بار بار امریکی دباؤ کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ فوجی آپریشن وہ پھر سے شروع کر دیتے ہیں۔ قبائلی دیہات پہ بمباری کی جاتی ہے۔ جواب میں پاکستانی شہروں

کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہم لوگ اس صورت حال کے عادی ہو چکے۔ جب بھی اعلیٰ امریکی حکام کا کوئی وفد پاکستان کے دورے پر ہوتا ہے، یا تو قبائلی علاقوں میں کسی نہ کسی مقام کو بمباری کا نشانہ بنایا جاتا ہے یا پھر القاعدہ کے کسی اہم رکن کو گرفتار کرنے کی خبر آ جاتی ہے۔ ایک مرتبہ سابق وزیر خارجہ کونڈا لیزا رائس (Condoleezze Rice's) کے دورۂ پاکستان کی رات ایک وزیر نے مجھے بتایا: کل امریکی مہمان کو پانچ تحفے ملنے والے ہیں۔ بالکل ایسا ہی ہوا، اگلی صبح پتہ چلا کہ پانچ القاعدہ جنگجو ''مقابلے'' میں مارے گئے۔ یہ خبر اس کی آمد پر شہ سرخیوں کے ساتھ چھپی۔ جس دن جارج ڈبلیو بش (George W Bush) پاکستان کے دورے پر تھے، اس دن اخبار کی سرخی وزیرستان میں 40 غیر ملکی دہشت گردوں کی ہلاکت کے موضوع پر تھی۔ بعد میں سچائی یہ سامنے آئی کہ شمالی وزیرستان کے سیدگئی گاؤں کے لوگ خلیج سے واپس آنے والے ایک مقامی تاجر کا استقبال کرنے جمع تھے کہ بمباری کا نشانہ بن گئے۔

سر اولف کیرو (Sir Olaf Caroe) نے صدیوں سے نافذ انتقام کے پشتون فلسفے کے بنیادی خدوخال کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ ''جب بھی برطانیہ نے قبائل کے خلاف آپریشن کا آغاز کیا، یہ لوگ پہاڑوں میں چلے جاتے۔ ان کی کارروائیاں وقتی طور پر رک جاتیں۔ پھر جنگجو منظم ہو کر لوٹ آتے۔ ہر مرنے والے قبائلی کے خاندان اور قبیلے کے لوگ انتقام کا عہد کر کے ان سے آ ملتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی تعداد بڑھتی چلی جاتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی گاؤں پر بمباری سے پہلے اس جگہ پر چیاں گرائی جاتیں، لوگوں کو حملے سے خبردار کر دیا جاتا اور یوں بمباری میں صرف مالی نقصان ہی ہوتا۔''

فوجی کارروائی کے نتیجے میں متاثر ہونے والے بہت سے بے گناہ لوگوں کی کہانیاں مجھ تک پہنچی ہیں۔ ان میں میری پارٹی کا ایک کارکن بھی شامل ہے۔ تحریک انصاف باجوڑ کا ضلعی صدر خلیل الرحمٰن اپنے گھر والوں کے ساتھ قبائلی علاقے میں سفر پر تھا۔ فضا میں پاک فوج کا

ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا۔ مقامی لوگوں کو فوج کی جانب سے دی گئی ہدایات کے مطابق وہ سب کار سے باہر نکل آئے اور ہاتھ اٹھا لئے لیکن اس کے باوجود ہیلی کاپٹر نے ان پر فائر کر دیا۔ خلیل کے چھ سالہ بیٹے کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئیں۔ اس کا بھائی اور بھتیجا جاں بحق ہوئے۔ میں خلیل کو پاکستان میں سب سے زیادہ دیکھے جانے والے ٹاک شوز میں سے ایک ''کیپٹل ٹاک'' میں لے کر آیا۔ اس نے میزبان حامد میر سے کہا ''ہم پاکستان کے لئے جان تک دینے کو تیار ہیں لیکن اس واقعہ کے بعد میں اپنے خاندان کو طالبان کے ساتھ شامل ہونے سے کیسے روک سکتا ہوں''۔

فوجی آپریشن کے نتیجے میں دشمنیاں پروان چڑھیں اور قبائل کے باہمی تعلقات میں تناؤ پیدا ہوا۔ ایک دوسرے کے مقابل آ گئے کیونکہ ایک قبیلہ طالبان کا حامی ہے تو دوسرا فوج کے ساتھ کھڑا ہے۔ جو قبائلی حکومت کی مدد پر آمادہ تھے، حکومت نے طالبان کے خلاف ان کے لشکر کھڑے کرنے کی حوصلہ افزائی کی تا کہ وہ عسکریت پسندوں کا مقابلہ کر سکیں۔ طالبان نے ان لشکروں کو تباہ کر کے رکھ دیا کیونکہ ان کے نزدیک ان میں شامل لوگ امریکی پٹھو ہیں۔ اگر ان علاقوں میں امن قائم ہو جائے، پھر بھی اپنے پیاروں کی موت کا بدلہ لینے کا سلسلہ، آنے والے برسوں میں بھی جاری رہے گا۔ میرے جاننے والے وزیر قبیلے کے ایک رہنما، سابق سینیٹر فرید اللہ خان کو 2005ء میں اس لئے قتل کر دیا گیا کہ انہیں حکومت کا حامی سمجھا جاتا تھا۔ برطانوی دور میں یہی ہوا کرتا تھا۔ خاص طور پر وزیرستان میں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں قبائلی علاقے کے سب سے سخت گیر لوگ بستے ہیں۔ جب کسی قبائلی ملک کے بارے میں یہ تاثر عام ہو جاتا کہ وہ نوآبادیاتی قوتوں کا مددگار ہے تو اسے قتل کر دیا جاتا۔ میرے پاس فرید اللہ کی وہ تصویر پڑی ہے جس میں وہ جمی گولڈ سمتھ [Jimmy Goldsmith (Jemima's Father)] کے ساتھ کھڑا ہے۔ یہ تصویر اُس وقت لی گئی تھی جب ہم 1995ء میں قبائلی پٹی کے دورہ پر نکلے تھے۔

قبائلی سرداروں کے قتل سے فاٹا پر بہت منفی اثرات مرتب ہوئے۔ قبائلی ڈھانچے کی اہمیت نظر انداز کرنے سے طاقت کا خلا پیدا ہوا، جسے پاکستانی طالبان نے پر کیا۔ چند سو غیر ملکی عسکریت پسندوں کو نکال باہر کرنے کی دھن میں ہم نے کیا کیا؟ طالبان کے حامی ہزاروں جنگجو پیدا کر دیئے، بہت سے بے گناہ شہریوں کو قتل کر ڈالا۔

انتہائی شرم کی بات ہے کہ حکومت نے اپنی فوج کو اپنے ہی لوگوں کے تعاقب میں لگا رکھا ہے۔ اب تک فاٹا میں 26 پاکستانی صحافی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ الزام یہ ہے کہ انہیں حکومت نے راستے سے ہٹایا۔ وہ نہیں چاہتی کہ قبائلی علاقوں کی غیر جانبدارانہ خبر نگاری ہو، جیسے کہ مشرقی پاکستان کے معاملے میں ہوا تھا۔ پراپیگنڈے، جھوٹ اور دھوکہ دہی سے کیا قوم کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے؟

جو چیز فوجی کارروائیوں سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی، وہ قبائلی علاقوں میں سی آئی اے کے ایما پر ڈرون طیاروں کے خفیہ حملے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ المناک بات یہ کہ حملے ہماری حکومت کی مرضی اور اجازت سے ہوتے ہیں۔ یہ بات زاہد حسین نے اپنی کتاب "The Scorpio's Tail" میں بیان کی ہے ''دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جب کسی ملک کی انٹیلی جنس ایک ایسے ملک کے اندر روبوٹس کے ذریعے لوگوں کو ہلاک کر رہی ہے جس کے ساتھ وہ حالت جنگ میں بھی نہیں۔''

2004ء میں جب ملٹری آپریشن کا معاملہ قومی اسمبلی میں زیر بحث آیا تو میں ان چند ارکان پارلیمنٹ میں شامل تھا، جنھوں نے ان لوگوں کے لئے آواز بلند کی جن کے علاقوں میں بیتے دنوں کا ابھی ان اوراق میں تذکرہ ہو رہا تھا۔ تقریباً تمام کے تمام ارکان پارلیمنٹ قبائلی علاقوں کے بارے میں یکسر بے خبر تھے۔ انہیں اس بات کی کچھ خبر نہ تھی کہ کیسی تباہی وہاں مچی ہے۔ میں نے اسمبلی میں کھڑے ہو کر کہا تھا ''اگر آپ نے اس علاقے کی تاریخ پڑھی ہوتی تو

آپ کبھی بھی اس دلدل میں نہ پھنستے۔'' اس پر مجھے یہ کہہ کر تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ میں معاملے کو افسانوی رنگ دے رہا ہوں۔ بعد ازاں مجھے طالبان کا ہمدرد قرار دے دیا گیا۔ جو کوئی اس علاقے کو سمجھتا ہے، یہ بات اس پر عیاں ہے کہ قبائلی علاقوں پر حملے ملک کے لئے تباہ کن ہوں گے۔ ستمبر 2004ء میں جنوبی وزیرستان میں مسلسل دو دنوں میں دو ڈرون حملوں کے نتیجے میں 100 افراد جاں بحق ہوئے۔ اسی کے نتیجے میں حکومت کے خلاف محسود قبائل کی بغاوت کا آغاز ہوا تھا۔

حکومت کے ان دعووں نے معاملات کو اور بھی خراب کیا کہ مرنے والے سب کے سب ''غیر ملکی عسکریت پسند'' تھے۔ یہ جھوٹ کیوں گھڑا گیا؟ تا کہ لوگ ایک ہولناک سچائی کو آسانی سے ہضم کر لیں کہ ہم ڈالروں کے عوض اپنے ہی لوگوں پر بمباری کے مرتکب ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ حکومت انہی غلطیوں کو دہرا رہی ہے جو 1971ء میں مشرقی پاکستان کے بحران کے دوران کی گئی تھیں۔ آج ہم اپنے لوگوں کے خلاف جنگ کے لئے ''غیر ملکی عسکریت پسندوں'' کا نام لیتے ہیں۔ تب ہم ''بھارت کے حمایت یافتہ'' کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔ جاں بحق ہونے والوں کی مصدقہ تعداد معلوم کرنا مشکل ہے۔ ہلاکتوں کے بارے میں فوج اور طالبان کے دعوے مختلف ہیں۔ اخبار نویسوں کو قبائلی علاقے میں جانے کی اجازت نہیں۔ اخبار نویس مقامی آبادی کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ لاشیں جل کر مسخ ہوتی ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ کون تھا جسے موت کی نیند سلا دیا گیا۔ ڈرون حملے کے بعد کوئی زخمیوں کی مدد نہیں کرتا۔ لوگ اس خوف کا شکار ہوتے ہیں کہ دوبارہ حملہ ہو جائے گا۔ گھنٹوں تک وہاں چیخ و پکار گونجتی رہتی ہے۔ 2011ء میں میجر جنرل غیور محمود نے دعویٰ کیا تھا کہ ڈرون حملوں میں مرنے والے کم و بیش تمام کے تمام دہشت گرد ہوتے ہیں۔ اسی سے ظاہر ہے کہ شرمناک ڈرون حملوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ہماری حکومت کس قدر پستی میں گر چکی۔ پوری ڈھٹائی

سے صاف صاف جھوٹ بولنے پر اتراتی ہے۔ مجھے ریٹائرڈ فوجیوں کی تنظیم ''ایکس سروس مین ایسوسی ایشن'' (Ex- Service Men Association) کے ایک اجلاس میں شرکت کا موقع ملا جس میں شمالی وزیرستان کے ایک قبائلی رہنما خلابت خان نے ان دعووں کو چیلنج کیا کہ ڈرون حملوں میں مرنے والوں کی اکثریت دہشت گردوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس نے کہا: اگر 20 لوگ مارے جائیں تو ان میں کم از کم 18 سویلین ہوتے ہیں۔ اس نے سوال کیا کہ حکومت مرنے والوں کو کس طرح پہچان سکتی ہے، جب کہ ڈرون حملے صرف ان علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں پاک فوج موجود ہی نہیں۔ ''نیو امریکہ فاؤنڈیشن'' کے پیٹر برگن (Peter Bergen) اور کیتھرین ٹائیڈمن (Katherine Tiedemann) نے ڈرون ڈیٹا بیس کی بنیاد پر حساب لگایا ہے کہ 2004ء سے 2011ء تک ڈرون حملوں میں 1492 سے لے کر 2328 لوگ ہلاک ہوئے۔ ان کے بقول سویلین ہلاکتوں کا تناسب 20 فیصد ہوتا ہے۔ دوسری طرف انگریزی روزنامہ ''دی نیوز'' کے تجزیے کے مطابق 2010ء میں ڈرون حملوں کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے شہریوں کا تناسب 59 فیصد تھا۔ ''دی نیوز'' کے مطابق 2010ء کے دوران سو سے کچھ اوپر انتہائی مطلوب عسکریت پسندوں کا محض پانچواں حصہ ہی ہلاک کیا جا سکا۔ یہ مہم صدر بش نے شروع کی۔ اوباما کے حکم سے مزید تیزی لائی گئی۔ ''دی نیوز'' نے اعداد و شمار کی بنیاد پر بتایا کہ 2010ء میں ڈرون حملوں سے ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد 124 تک جا پہنچی جو ایک ریکارڈ ہے۔ 2009ء کے مقابلے میں دوگنا۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کتنی بڑی تعداد میں بے گناہ شہری ہلاک اور زخمی ہوئے ہوں گے۔ ہوائی حملوں کے ذریعے لوگوں کی ہلاکتوں پر پاکستان سراپا احتجاج ہے۔ شمالی وزیرستان کے کریم خان نے اپنے بیٹے اور بھائی کی ہلاکت پر سی آئی اے کے مقامی سربراہ کے خلاف مقدمہ دائر کرانے کی کوشش کی۔ اس نے 5 کروڑ ڈالر ہرجانے کا دعویٰ دائر کیا تھا۔ سی آئی اے چیف پاکستان چھوڑ کر چلا گیا۔

پاکستان کی سلامتی اور قومی خودمختاری کے چیتھڑے اڑائے جا رہے ہیں۔ اس بے پناہ سفاکی میں خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے امریکہ نے پاکستان کو بدنام کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ امریکہ کے اعلیٰ عہدیدار اور تجزیہ نگار پاکستان کو ''دنیا کا خطرناک ترین ملک'' قرار دیتے ہیں۔ ایک ایسا ایٹمی ملک جو ان کے بقول جہادی کلچر کی نرسری بن چکا ہے۔ وہ یہ الزام لگاتے ہیں کہ پاکستان ہمسایہ ممالک کو غیر مستحکم کرنے کے لئے دہشت گرد داخل کرتا ہے۔ ہم پر الزام ہے کہ ہم نے خطرناک ترین تنظیم القاعدہ کو پناہ دے رکھی ہے۔ وہ پاکستان کو دنیا کا سب سے زیادہ امریکہ مخالف ملک قرار دیتے اور کہتے ہیں کہ اگر امریکہ پر کوئی اور دہشت گرد حملہ ہوا تو پاکستان میں موجود دہشت گردوں کے ملوث ہونے کا امکان سب سے زیادہ ہوگا۔ سینیٹر بوب گراہم (Senator Bob Graham) سے لے کر کلنٹن کے سابق مشیر برائے قومی سلامتی بروس ریڈل (Broce Riedel) اور نائب صدر جو بائیڈن (Joe Bidedn) تک سب کے سب پاکستان پر الزامات کی اس مہم میں ایک کورس کے گلوکاروں کی طرح شریک ہیں۔ امریکہ جس بات کو سمجھ نہیں پا رہا وہ یہ ہے: ملک کے چند علاقوں میں انتہا پسند عسکریت پسندوں کی موجودگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ پاکستان پر مذہبی بنیاد پرستوں کا قبضہ ہونے والا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف یہ جنگ کچھ لوگوں کو انتہا پسندی کی طرف دھکیل رہی ہے، جو لوگ پاکستان کو سمجھتے ہیں، یہ بات بھی وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پاکستان میں طالبانائزیشن ممکن نہیں۔ افغانستان میں طالبان کی فتح کی بنیاد ان کے نظریات نہ تھے۔ سبب یہ تھا کہ انہوں نے برسوں پر محیط جنگی سرداروں کے ظلم و بربریت، جنگ اور کرپشن سے تنگ آئے ہوئے لوگوں سے قانون کی حکمرانی قائم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مغربی دنیا میں غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ طالبان نے ایک سیکولر حکومت سے اقتدار چھینا تھا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے آپس میں دست و گریباں ''مجاہدین'' کو مار بھگایا تھا۔ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جنہیں شروع

میں سی آئی اے کی مدد حاصل تھی جب وہ سوویت فوج سے برسر جنگ تھے۔ تب روسی انہیں مذہبی انتہا پسند سمجھتے تھے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی اسلام پھیلا وہاں وہاں مقامی لوگوں کے کردار نے اسلامی ثقافت اور مزاج کی صورت گری کی۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ پس منظر میں مقامی کلچر پوری شان سے بروئے کار رہتا ہے۔ صرف وہ رسوم ورواج ترک کر دیئے جاتے ہیں جو اسلام سے متصادم ہوں۔ پشتون سرزمین مسلسل بیرونی حملوں کی زد میں رہی؛ چنانچہ وہاں کی ثقافت، ہمیشہ سے قدامت پرستی اور سادگی کے حصار میں ہے۔ اسلام پشتونوں کی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے، جیسا کہ پاکستان کے عوام کی غالب اکثریت کا۔ اگر یہ لوگ شرعی قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں تو اس کا بنیادی سبب ان کا یقین ہے کہ صرف اسی طرح عدل وانصاف پر مبنی عدالتی نظام اور معاشرتی مساوات نصیب ہو سکتی ہے۔ نائن الیون کے بعد سے امریکہ جس طرح اسلامی دہشت گردی سے نمٹنے کی کوشش کر رہا ہے وہ اس پر برہم ہیں۔ وہ افغانستان میں ہونے والی جنگ کو غیر ملکی قابض فوجوں کے خلاف آزادی کی لڑائی سمجھتے ہیں۔ یاد رہے کہ 30 برس قبل افغانستان پر غیر ملکی قبضہ کے خلاف لڑنے والے لوگوں کو امریکی صدر رونالڈ ریگن (Ronald Reagan) نے ''بانیان امریکہ کے اخلاقی ہم پلہ'' قرار دیا تھا۔ 2002ء کے الیکشن میں مذہبی جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلس عمل کو جس کی قیادت جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کو حاصل تھی، بے مثال کامیابی ملی۔ اس اتحاد نے افغانستان پر امریکی حملے کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ملک کی غالب اکثریت طالبان کے فکر ونظر کی حامی ہے۔ عسکریت پسندوں کی طرف سے لڑکیوں کے سکولوں پر حملے اور اولیاء کے مزاروں کی بے حرمتی پر عوام میں شدید غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ 2009ء میں این جی او 'کیمپ'' نے ''قبائلی علاقوں کا ادراک'' (Understanding FATA) کے عنوان کے تحت ایک سروے کیا۔ لوگوں کی اکثریت نے جمہوریت، عدلیہ کی آزادی اور خواتین کے حقوق کو پاکستان کے سب سے اہم مسائل قرار دیا۔

''پاک انسٹیٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS)'' کی انتہا پسندی اور عسکریت پسندی پر مرتب کی جانے والی رپورٹ سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا گیا: مقامی ثقافت عسکریت کی مزاحمت کرتی ہے حتیٰ کہ ان علاقوں میں بھی جہاں انتہا پسندی نے قوت اور اختیار سے روایات کو دبا ڈالا تھا۔ جیسے ہی انتہا پسندوں کی گرفت کمزور پڑتی ہے مقامی ثقافت ایک مرتبہ پھر سے پھوٹ پڑتی اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ رپورٹ میں سوات کی مثال دی گئی ہے۔ 2009ء میں جیسے ہی فوجی آپریشن کے ذریعے طالبان کو نکال باہر کیا گیا، مقامی روایات اور رسوم ورواج ایک مرتبہ پھر بحال ہو گئے۔ 19ویں صدی میں، جب مغل سلطنت زوال پذیر تھی، سیّد احمد شہید نے ایک انقلابی اسلامی تحریک شروع کی تھی لیکن یہ تحریک کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ سیّد احمد بریلوی غیر مسلموں کے خلاف جہاد کی تبلیغ کرتے۔ انہوں نے پشتون قبائل کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ پشتونوں نے ان کے سخت گیر اسلام کو پسند نہ کیا اور انہیں چھوڑ دیا۔ سکھوں نے جب اپنے زیر انتظام تمام پشتون علاقوں کو فتح کر لیا تو سیّد احمد شہید ان کے ہاتھوں مارے گئے۔ پاکستان میں صوفیوں کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ یہ کشمکش پاکستان میں موجود سُنی مسلمانوں کے دو مکتبہ ہائے فکر کے مابین ہے۔ بریلوی مکتبہ فکر کا رجحان وسط ایشیائی صوفی اسلام کی طرف ہے جس میں اولیاء اور مزارات کے تقدس اور برداشت کو اہمیت حاصل ہے۔ دوسری جانب دیو بندی مکتبہ فکر ہے جو نظریاتی اعتبار سے سخت گیر سمجھا جاتا ہے چنانچہ ان میں سے بعض کی ہمدردیاں اس مسلک کے ساتھ وابستہ ہیں جس کی ترویج طالبان کرتے ہیں۔

القاعدہ کے مکمل خاتمے کے لئے پاکستان اس سے کہیں زیادہ موثر حکمت عملی اختیار کر سکتا تھا۔ جو لوگ قبائل کے بارے میں کچھ آگاہی رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ بہتر حل کیا ہوتا۔ انہیں اعتماد میں لے کر، ان کے ساتھ مل کر کام کیا جاتا۔ اُنہیں قائل کیا جاتا اور ان کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں ساتھ ملایا جاتا۔ سب جانتے ہیں کہ ماضی میں وہ پاکستان کے قومی

مفادات کا تحفظ کرنے میں اکثر پیش پیش رہے۔ پشتون قبائل نے 1948ء کی جنگ میں اپنے لشکر کشمیر بھیجے۔ 1965ء میں بھی ان کے رضا کار شریک رزم تھے۔ مگر ایک کے بعد دوسری پاکستانی حکومت اپنے مفادات کے تحفظ میں ناکام رہی۔ بوب وڈورڈز (Bob Wood Ward's) نے اپنی کتاب ''اوباما کی جنگ'' (Obama's War) میں زرداری کے وہ الفاظ نقل کئے ہیں جو سی آئی اے کے ڈائریکٹر مائیک ہائیڈن (Mike Hayden) سے ڈرون حملوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اس نے کہے تھے ''شہریوں کی ہلاکتوں پر آپ امریکی پریشان ہوں گے، مجھے ہرگز کوئی پرواہ نہیں''۔ درحقیقت اسے یہ بات اس طرح کہنی چاہئے تھی ''میرے لئے امریکی ڈالر پاکستانی شہریوں سے زیادہ اہم ہیں''۔ وکی لیکس کے انکشافات نے اس قتل عام کے حوالے سے حکومت پاکستان اور امریکہ کی ساز باز کو پوری طرح بے نقاب کیا۔ وکی لیکس کے ایک ٹیلی گرام میں ڈرون حملوں پر وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کا حوالہ اس طرح دیا گیا ''مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس وقت تک وہ یہ حملے جاری رکھیں، جب تک مطلوب لوگوں تک نہیں پہنچ جاتے، ہم قومی اسمبلی میں (دکھاوے کا) احتجاج کیا کریں گے اور پھر حملوں کو بھلا دیں گے''۔ مطلوب لوگ نشانہ بنتے ہی نہیں۔ آسمان سے گر کر ایک گاؤں میں پھٹنے والا بم، دہشت گرد اور سویلین میں کیسے تمیز کر سکتا ہے؟ وکی لیکس پیغامات سے ایک اور انکشاف سامنے آیا کہ قبائلی علاقوں میں مصروف عمل پاک فوج کے علاوہ امریکہ کی خصوصی افواج کے جوان بھی خفیہ طور پر تعینات ہیں۔ وہ دہشت گردوں کی تلاش اور ڈرون حملوں کو منظم کرنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ اس بات کو ہماری حکومت نے عوامی سطح پر کبھی تسلیم نہ کیا۔ ان پیغامات میں، اس سے بھی بڑھ کر یہ بات سامنے آئی ہے کہ پاکستانی حکام اپنے امریکی ہم منصبوں سے یہ کہتے ہیں کہ مقامی لوگ ڈرون حملوں کے بالکل خلاف نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل ہی سفید جھوٹ ہے۔ نیو امریکن فاؤنڈیشن اینڈ ٹیرر فری ٹومارو، (New America Foundation and terror free tomorrow) کے مطابق 75 فیصد سے زیادہ مقامی

لوگ ڈرون حملوں کے حامی ہیں۔ درحقیقت صرف 16 فیصد لوگ ایسے تھے جنہوں نے کہا کہ یہ حملے واقعی دہشت گردوں کو ہدف بناتے ہیں باقیوں نے برعکس رائے دی۔ وکی لیکس سے یہ بھی آشکار ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے اندر بلیک واٹر جیسی کمپنیوں کے ہزاروں قاتل موجود ہیں۔ یہ تاثر عام ہے کہ بھاڑے کے یہ غنڈے ہمارے شہروں میں بلند دیواروں والے قلعہ نما گھروں میں رہتے ہیں۔ بڑی بڑی جیپوں کے قافلوں میں سفر کرتے ہیں۔ ان گاڑیوں کے کالے شیشوں کے پار جھانکنا ممکن نہیں ہوتا۔ پاکستانیوں کی اکثریت بالخصوص ریمنڈ ڈیوس (Raymond Davis) والے واقعے کے بعد یہی سمجھتی ہے کہ دہشت گردی کے واقعات میں کرائے کے قاتل خود ملوث ہوتے ہیں۔

مشرف اور زرداری دونوں کو اشرافیہ کی حمایت حاصل رہی۔ یہ لوگ طالبان سے خوفزدہ ہیں۔ ایک چینی مقولہ ہے ''ہر کسی کو چاہیے کہ اپنے دشمن کو اچھی طرح پہچانے۔'' بوب وڈورڈز اپنی کتاب ''اوباما کی جنگ'' (Obama's Wars) میں مہمان نواز اور انتقام پر ایمان رکھنے والے پشتون کردار سے ناواقفیت کو امریکہ کی ہولناک جہالت قرار دیتا ہے۔ امریکیوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ پاکستان کا قبائلی علاقوں پر کنٹرول ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وفاقی حکومت کو وہاں محدود سی دسترس حاصل ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک حقیقت یہ ہے کہ حکمران اشرافیہ بھی اس حوالے سے اتنی ہی کوری ہے جتنا خود امریکہ۔ پاکستان کے دوروں پر آنے والے امریکی سیاستدانوں کو بار بار میں نے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ امریکہ کو قبائلی علاقوں کی صورت حال پر متبادل نقطۂ ہائے نظر پر بھی توجہ دینا ہوگی۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ قبائلی علاقوں سے آنے والے لوگوں سے خود بات کر کے براہ راست معلومات حاصل کریں۔ وکی لیکس کے انکشافات سے یہ بات واضح ہو چکی کہ ہماری ڈالروں کی بھوکی حکمران اشرافیہ اپنے ذاتی مفادات کے لئے جنگ جاری رکھنا چاہتی ہے۔ ترسیل تا کہ جاری رہے اور وہ مزے اڑاتی رہے۔

امریکہ کے کٹھ پتلی حکمرانوں نے پاکستانی لوگوں پر بھی خوف مسلط کرنے کی حکمت عملی اختیار کی ہے تاکہ رائے عامہ کو ہموار کر سکیں۔ عوام کی اکثریت حکومتی پراپیگنڈا کے اصل محرکات سے واقف ہے۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ یہ پاکستان کی جنگ نہیں بلکہ ڈالروں کی خاطر ہم اپنے ہی لوگوں کو قتل کرنے کے مرتکب ہیں۔ لال مسجد کے واقعے سے پیدا ہونے والی بے چینی اور بدامنی کے بعد مولوی فضل اللہ ابھر کر سامنے آیا۔ حکومت نے قوم کو خوفزدہ کرنا چاہا کہ اب طالبان کی نظریں اسلام آباد پر ہیں۔ بہت سے لوگ خاص طور پر رائے عامہ پر اثر انداز ہونے والی بعض شخصیات، جنہیں دیہی پاکستان کے بارے کچھ معلوم نہیں، وہ سوات اور قبائلی علاقوں میں فرق سے قطعاً آگاہ نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تمام پشتون ایک جیسے ہیں۔

سوات کا علاقہ سیاست، تاریخ اور جغرافیائی اعتبار سے قبائلی علاقوں سے یکسر مختلف ہے۔ قبائلی علاقے بنجر اور پہاڑی ہیں۔ سوات ایک سرسبز وزرخیز وادی ہے، گویا مشرق کا سوئٹزر لینڈ۔ 1969ء تک یہ ایک خود مختار ریاست تھی، والیٔ سوات قبائلی روایات اور شرعی قوانین کے تحت ایک ذاتی جاگیر کی طرح جس پر حکومت کرتا۔ یہ علاقہ بدھ تاریخ کا بیش قیمت ورثہ رکھتا ہے۔ سوات پاکستان میں بلند شرح خواندگی رکھنے والے علاقوں میں سے ایک ہے۔ یہاں جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ اس قدر محفوظ علاقہ تھا کہ 1970ء کے عشرے میں ہپی لوگ خوشگوار موسم میں منشیات سے دل بہلانے یہاں آیا کرتے۔ 2007ء تک بھی یہ کوہ نوردی کے شوقین لوگوں کے لئے مقبول تفریحی مقام تھا۔ ہفتہ وار چھٹی پر اسلام آباد کی اشرافیہ ادھر کا رخ کیا کرتی۔ اس کے برعکس قبائلی علاقوں میں سرکار کے صرف 44 قوانین لاگو ہیں۔ سیاسی اور قانونی اعتبار سے سوات بھی پاکستان کے دیگر علاقوں جیسا ہے۔ قبائلی علاقوں کے برعکس سوات کی کوئی سرحد افغانستان سے نہیں ملتی۔

1969ء میں والیٔ سوات کو معزول کر کے سوات کو صوبہ سرحد کی سول انتظامیہ کے تحت

کر دیا گیا۔ تب سے اس علاقے میں احساس محرومی اور بے چینی ہے۔ بعد میں برسراقتدار آنے والی مختلف حکومتیں سیاسی مداخلت اور جوڑ توڑ کا کھیل کھیلتی رہیں۔ سرکاری اہلکاروں کی کرپشن نے آہستہ آہستہ روایتی قبائلی جمہوریت کو برباد کر کے رکھ دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سوات میں جرائم کی سطح بھی بلند ہونے لگی۔ میرے کزن جمشید برکی نے جو مالاکنڈ ڈویژن کا کمشنر رہ چکا، یہ بتایا: 1974ء میں پاکستان کا عدالتی نظام سوات میں نافذ ہوا تب قتل کے واقعات کی تعداد صرف 10 تھی، 1977ء میں قتل کے 700 واقعات ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عدالتی نظام کے خلاف عوام کی نفرت بڑھتی چلی گئی جو اسے کرپٹ، مہنگا اور غیر موثر قرار دیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہی نفرت نفاذ شریعت کی تحریک میں ڈھل گئی۔ مولانا فضل اللہ کے سسر مولانا صوفی محمد نے اس مطالبے کی بنیاد پر ''تحریک نفاذ شریعت محمدی'' نامی تنظیم قائم کر لی۔ وہ افغان جہاد میں شامل رہے تھے۔ جب 2002ء میں صوفی محمد کو جیل میں بند کر دیا گیا تو ان کے زیادہ سخت گیر نظریات رکھنے والے داماد فضل اللہ نے تحریک کی قیادت سنبھالی۔ فضل اللہ نے اپنے نظریات کی ترویج کے لئے علاقے میں ایک ریڈیو سٹیشن قائم کر رکھا تھا؛ چنانچہ اسے ''ریڈیو ملا'' کا نام دیا گیا۔ یہ بالکل ویسا ہی طریقہ ہے جیسے مسیحی ٹیلی وینجلی عیسائی فرقے کے مذہبی رہنما اپنے عقائد کی ترویج کے لئے ٹیلی ویژن کا استعمال کیا کرتے۔ مولوی فضل اللہ کے پیروکاروں میں بڑی تعداد خواتین کی تھی۔ وہ تحریک کے لئے اپنے زیورات تک عطیہ کر دیتیں۔ لال مسجد کے خون خرابے پر شدید ردعمل میں اس نے لوگوں پر زور دیا کہ وہ حکومت پاکستان اور سکیورٹی فورسز کے خلاف بغاوت کر دیں۔ اس نے معاشرے کے غریب ترین طبقات کو اکسایا اور یہ دلیل پیش کی کہ پرویز مشرف امریکہ کا غلام بن کر اسلام کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ مقامی زمینداروں کے خلاف عوامی نفرت کو بھی اس نے استعمال کیا۔ ان زمینداروں میں سے بعض نے اس وقت زرعی زمینوں پر قبضے کر لئے تھے جب ریاست کو

پاکستانی قانون کے تحت لایا گیا۔ عسکریت پسندوں نے کئی بڑے زمینداروں کو نشانہ بنایا اور ان کی فصلوں سے حاصل ہونے والا منافع بعض علاقوں کے بے زمین کسانوں میں تقسیم کر دیا۔

فضل اللہ کے حواریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کی غیر قانونی سرگرمیوں سے تشویش لاحق ہوئی تو مشرف نے 2007ء کے موسم خزاں میں عسکریت پسندوں کو کچلنے کے لئے سوات میں فوج داخل کر دی۔ 2008ء میں پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت نے امن بات چیت کا آغاز کر دیا اور یہ سلسلہ طویل مدت تک جاری رہا۔ صوفی محمد کو رہا کر دیا جنھوں نے ثالثی کے ذریعے ایک معاہدے کو حتمی شکل دی۔ اس معاہدے کے مطابق طالبان کو ہتھیار ڈالنا تھے جس کے بدلے وادیٔ سوات میں شرعی قانون نافذ کر دیا جاتا۔ پاکستان کے مغرب زدہ طبقات نے شریعت کے نفاذ کو پسماندگی کی جانب ایک قدم قرار دیا لیکن صوفی محمد اور سواتی عوام کے نزدیک یہ حصولِ انصاف کے دیرینہ مطالبہ کی تکمیل تھی۔ سوات کی ایک یونین کونسل کا سابق ناظم اور میری جماعت کی طرف سے صوبائی انتخابات کا امیدوار شیر خان بھی بات چیت کے اس عمل میں شریک تھا۔ اس نے مجھے بتایا: اس معاہدے کے بعد 1500 عسکریت پسندوں نے فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ انہیں حراست میں لے کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس سلوک نے مزید نوجوانوں کو بنیاد پرستی کی جانب دھکیل دیا۔ ان میں سے زیادہ تر بعد ازاں عسکریت کی طرف مائل ہو گئے۔ شیر خان نے امن کے لئے اچھی نیت سے کوشش کی۔ اب وہ صدمے کا شکار تھا۔ ایک مرتبہ پھر آہنی ہاتھ سے نمٹنے کی حکومتی پالیسی الٹا نقصان کا باعث بن گئی تھی۔ جب فوج سوات سے واپس آ گئی اور عسکریت پسندوں کو رہائی مل گئی تو انتقام کی آگ میں جلتے ان نوجوانوں نے فوج کے جانے سے پیدا ہونے والا خلا پُر کر دیا۔ شیر خان کے مطابق اس دوران بدترین واقعات ان لوگوں کے ہاتھوں ہوئے جو حراست کے دوران تشدد کا نشانہ بنے تھے۔

فضل اللہ کے ساتھ بھانت بھانت کے لوگ آن ملے۔ ان میں جہادی اور نسلی گروہ، تقریباً تمام جرائم پیشہ افراد، نفاذ شریعت کے حامی اور ناراض کسان سبھی شامل تھے۔ یوں اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا۔ مقامی لوگ طالبان کے خلاف ہو رہے تھے کیونکہ وہ تشدد کے ذریعے وحشیانہ قوانین نافذ کر رہے تھے۔ جو بھی ان کی مخالفت کرتا یا جس پر حکومت کا جاسوس ہونے کا شبہ ہو جاتا اس کا سر قلم کر دیا جاتا۔ لوگوں کو اغوا کر لیا جاتا، سکولوں کو جلایا جاتا، سی ڈی اور حجاموں کی دکانوں پر حملے کیے جاتے۔

حکومت پاکستان نے اس صورت حال کو امن و امان کی مکمل تباہی قرار دیا۔ عوام کو اس بات کا یقین دلانا مقصود تھا کہ جو کچھ سوات میں برپا ہے، دراصل وہ قبائلی علاقوں کے حالات ہی کا پھیلاؤ ہے اور یہ کہ طالبان اب وفاقی دارالحکومت پر چڑھائی کرنے والے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر میڈیا پر اثر انداز ہو کر اسے فوجی آپریشن کے لئے رائے عامہ ہموار کرنے کے کام پر لگا دیا گیا۔ سوات کے ایک صحافی نے مجھے بتایا انٹیلی جنس ایجنسیوں کے لوگ کہتے کہ طالبان کے ظلم و ستم پر مبنی زیادہ سے زیادہ خبریں لگائی جائیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایجنسیاں طالبان کے ساتھ فکری قربت رکھنے والے دیوبندی مکتبہ فکر کو بے دست و پا کرنے اور فرقہ وارانہ ٹکراؤ کو ہوا دینے کے درپے تھیں۔ عسکریت پسندوں کے خلاف عوامی قوت مجتمع کرنے کے لئے طالبان کے ہاتھوں مزارات کی بے حرمتی کے واقعات کو وہ استعمال کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ زرداری نے 2009ء کے امن معاہدے کو پورے دو ماہ تک لٹکائے رکھا۔ دو ماہ بعد کہیں اپریل میں جا کر نفاذِ شریعت کے قانون پر اس نے دستخط کئے۔ صدر کے اس تذبذب نے سوات کو مزید انتشار کی جانب دھکیل دیا۔ چند ہفتے بعد سوات کے جنوب میں واقع ضلع بونیر میں طالبان کی کچھ جیپیں دیکھی گئیں۔ اس اطلاع نے اخبارات کی شہ سرخیوں میں جگہ پائی۔ ہر طرف خوف کی لہر دوڑ گئی کہ طالبان اسلام آباد سے صرف 60 میل دور رہ گئے۔ فوجی آپریشن کے وقت کا انتخاب

زرداری کے دورۂ امریکہ کی مناسبت سے کیا گیا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ وہاں سوات کی فوجی کارروائی پر صدر کی تعریف کی گئی۔ اور ظاہر ہے کہ حکومت نے اس چیز کو مزید امداد بٹورنے کے لئے استعمال کیا۔ کچھ ہفتوں کے بعد جاپان میں احباب پاکستان (Friends of Pakistan) کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے زرداری کا کہنا تھا ''ہم دنیا کو بچانے کے لئے لڑ رہے ہیں'' جیسے پاکستان کے چند ہزار طالبان لاکھوں کی تعداد میں پاک فوج کو تباہ کر کے پوری دنیا کے لئے خطرہ بننے والے ہوں۔ دراصل جو کچھ سوات میں ہوا وہ پیشہ ور مجرموں کے غیر منظم گروہ کی بغاوت تھی جسے مقامی لوگوں کی حمایت حاصل نہ تھی۔ حکومت کو چاہئے تھا کہ وہ مخصوص اہداف پر مرکوز کمانڈو ایکشن کے ذریعے تحریک کی قیادت پر قابو پالیتی۔

بڑے پیمانے پر فوجی آپریشن کے نتیجے میں 20 لاکھ کے قریب لوگ بے گھر ہوئے، بہت سے بے گناہ مارے گئے اور مقامی معیشت کا کباڑہ ہو گیا۔ حالات کو بگڑتے پا کر میں اس وقت سوات گیا جب لوگ وہاں سے بھاگ رہے تھے۔ مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ نکلنے والوں کو صرف ایک گھنٹے کی مہلت دی گئی، جس کے بعد گولہ باری شروع ہو گئی۔ ایک نوجوان لڑکے نے بتایا کہ اس نے گولہ باری کے نتیجے میں مرنے والے شہریوں کی لاشیں دیکھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ طالبان کے کرتوتوں سے وہ سخت نفرت کرتے تھے مگر اب وہ فوج کے سخت گیر روّیے سے بھی نالاں تھے۔ اس کارروائی کے باوجود فضل اللہ اور اس کے قریبی ساتھی بچ نکلنے میں کامیاب رہے اور افغانستان کی طرف بھاگ نکلے۔ مجھ سمیت جس کسی نے حکومتی حکمت عملی پر تنقید کی اسے طالبان کا ہمدرد قرار دے دیا گیا۔

میرا دوست ندیم اقبال سوات کے فوجی کارروائی سے بے گھر لوگوں کے کیمپ میں تین ماہ تک کام کرتا رہا۔ کیمپ میں موجود لوگوں اور فوجی افسروں سے بات چیت کے بعد وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچا یعنی سوات آپریشن امریکہ سے اور امداد بٹورنے کے لئے شروع کیا گیا۔

مخصوص مقامات پر چھاپہ مار کارروائیوں سے مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ ندیم کا کہنا تھا کہ زندگی میں یہ واحد موقع تھا جب اس نے سوچا کہ وہ پاکستان چھوڑ دے اور کینیڈا کا پاسپورٹ لے کر وہیں بس جائے۔

امریکہ کی جانب سے ہر جائز ناجائز طریقے سے پاکستانی سیاست پر اثر انداز ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ الٹا ان کے کٹھ پتلی حکمران بدنام ہوئے اور بے اعتبار قرار پائے۔ مقصد پاکستان کو استعمار پر انحصار کے لئے بے بس ولاچار رکھنا ہے۔ لوگ جب یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے حکمران کس حد تک امریکہ پر انحصار کرتے ہیں تو بچی کھچی ساکھ بھی برباد ہو جاتی ہے۔ اپنی حکومت پر پاکستانی عوام کا غصہ بالکل قابل فہم ہے، جس نے امریکی ایجنٹوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ اس بات کا ثبوت ریمنڈ ڈیوس کے معاملے میں سامنے آیا، یہ شخص سی آئی اے کا کارندہ تھا جس نے جنوری 2011ء میں لاہور میں دو معصوم شہریوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس واقعے میں ایک اور پاکستانی اُس امریکی کار کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا تھا جو ریمنڈ کی مدد کے لئے الٹے ہاتھ ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھی۔ پنجاب حکومت نے اس دوسری کار میں سوار افراد کو پولیس کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا تو امریکیوں نے انہیں پاکستان سے بھگا دیا۔ گو کہ ریمنڈ ڈیوس کو وہیں موقع پر گرفتار کر لیا گیا، امریکہ نے دعویٰ کیا کہ اسے سفارتی استثنیٰ حاصل ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ریمنڈ کو لوٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اپنی جان بچانے کے لئے اسے گولی چلانا پڑی۔ درحقیقت اُس نے مقتولین کو عقب سے نشانہ بنایا تھا۔ اس ایک بات سے امریکی کہانی کا پول کھل گیا۔ امریکی حکام نے میڈیا کے سامنے اعتراف کیا کہ ریمنڈ سی آئی اے کا خفیہ ایجنٹ تھا۔ وہ سی آئی اے کی اس خفیہ ٹیم کا حصہ تھا جو ملک کے طول و عرض میں عسکریت پسندوں کا پتہ لگانے پر مامور ہے۔ ہلاک ہونے والے ایک شخص کی بیوہ، انیس سالہ شمائلہ کنول نے مایوسی کے عالم میں چوہے مار دوا کھا کر خودکشی کر لی۔ اسے یقین تھا کبھی اسے انصاف نہ ملے گا۔ خودکشی کرنے

والی جواں سال معصوم صورت خاتون کو پاکستان کے ٹی وی چینلز پر بار بار دکھایا گیا۔ موت سے کچھ دیر پہلے ہسپتال میں اپنے بستر کے کنارے کھڑے رپورٹروں سے بات کرتے ہوئے اس نے کہا تھا ''میں خون کا بدلہ خون چاہتی ہوں'' اس نے کہا ''میں خودکشی کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کبھی انصاف نہ ملے گا''۔ ڈیوس کے معاملے پر پورے ملک میں احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے، سفارتی سطح پر ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور امریکہ مخالف جذبات اتنے شدید ہو گئے کہ ماضی میں ایسی کوئی مثال نہ تھی۔

شمائلہ کنول کے دکھ میں ڈوبے ہوئے الفاظ اسی مایوسی کا مظہر تھے، جس کے تحت ڈرون حملوں میں، رشتے داروں کی اموات کا بدلہ لینے کے لئے اپنے آپ کو برہم لوگ اڑا لیتے ہیں۔ جنرل پیٹریاس (David Petraeus) کے ایک سابق مشیر انڈریو ایگزم (Andrew Exum)، اور سینٹر فار نیو امریکن سکیورٹی (Center for new American Security) نامی تھنک ٹینک کے لیے کام کرنے والے انسدادِ عسکریت پسندی کے ماہر ڈیوڈ کلکولن (David Kilcullen) اور اینڈریو ایکسم (Andrew Exum) نے ''نیویارک ٹائمز'' میں لکھا ''ڈرون حملوں میں جب کوئی سویلین ہلاک ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک پورا خاندان معاشرتی دھارے سے الگ ہو گیا۔ انتقام کی نئی خواہش پروان چڑھتی ہے اور عسکریت پسندوں کی صفوں میں مزید جنگجوؤں کا اضافہ ہونے لگتا ہے۔'' جتنے زیادہ ڈرون حملے ہوتے ہیں اتنے ہی عسکریت پسند مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جتنے زیادہ ڈرون حملے پاک فوج کی کارروائیوں میں اُتنی شدت زیادہ، اُسی تناسب سے دہشت گردوں کی تعداد بڑھتی ہے، اسی تناسب سے خودکشی حملے بھی۔

دی سنٹر فار ریسرچ اینڈ سکیورٹی سٹڈیز (The Center for Research and Security Studies) نامی تھنک ٹینک کے ساتھ منسلک فرخ سلیم کہتے ہیں کہ 2003ء

میں دہشت گردی سے ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد 189 تھی لیکن 2009ء میں 11585 لوگ دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس برس قبائلی علاقوں میں فوجی کارروائی عروج پر تھی۔ دہشت گردی میں عام شہری سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ انتہا پسندوں نے حکمت عملی تبدیل کر لی۔ وردی والوں کے دفاتر کی بجائے اب وہ دارالحکومت کی اسلامی یونیورسٹی، لاہور اور پشاور کی مارکیٹوں جیسے آسان اہداف کو نشانہ بنانے لگے۔ حکومت کی پالیسی کے نتیجے میں دہشت گردی کی ایک واضح مثال قبائلی علاقوں کی سب سے چھوٹی ایجنسی باجوڑ میں سامنے آئی جو افغان سرحد کے قریب واقع ہے۔ 2006ء میں وہاں ایک مدرسے پر ہوائی حملہ ہوا، کہا گیا کہ یہ دہشت گردوں کا ٹھکانہ تھا۔ کم از کم 80 لوگ مارے گئے۔ اخبارات نے بعد میں انکشاف کیا کہ ان میں 60 طلبہ شامل تھے۔ ان میں سے اکثر کی عمریں 18 برس سے کم تھیں۔ عسکریت پسندوں نے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے چند دن بعد ایک فوجی چھاؤنی پر حملہ کیا۔ 42 زیر تربیت جوان جاں بحق ہوئے۔ جس شخص نے خودکش حملہ کیا اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ باجوڑ کے مدرسہ میں جاں بحق ہونے والے ایک بچے کا رشتہ دار تھا۔ اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ پرویز مشرف کی حکومت نے امریکہ کو معصوم قرار دینے کی کوشش کی۔ پاک فوج کی قیادت نے حملے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ مقامی لوگوں اور سیاستدانوں کا کہنا تھا کہ حملہ ایک امریکی ڈرون طیارے سے ہوا تھا۔ ''نیویارک ٹائمز'' کی رپورٹ کے مطابق مقامی لوگوں نے بتایا تھا کہ اصل دھماکے ہو جانے کے بعد پاک فوج کے گن شپ ہیلی کاپٹر فضا میں نمودار ہوئے۔ انہوں نے اس مقام پر راکٹ فائر کیے۔ حکومت پاکستان ان الزامات کی تردید کرتی رہی۔ ''سنڈے ٹائمز'' کی کرسٹینا لیمب (Christina Lamb) نے بعد ازاں خبر دی کہ مشرف کے ایک قریبی ساتھی نے اس بات کا اقرار کیا تھا۔ ان کے بقول: اس کی بجائے کہ امریکہ نے حملہ کیا اگر ہم خود پر ذمہ داری ڈال لیتے تو یہ نسبتاً کم بدنامی کا باعث بنتا۔

امریکہ کی خارجہ پالیسی اور جنگی حکمت عملی نے افغانستان میں بھی المناک نتائج پیدا کئے۔ افغانستان کے ریاستی اداروں کی کمزوری نے کرزئی حکومت کو بے دست و پا کر دیا۔ کرزئی پر الیکشن میں دھاندلی کے الزامات تھے۔ عام تاثر یہ ہے کہ حکومت بدعنوانی کو روک نہ سکی اور امریکہ کی آلۂ کار بن کر بدامنی کی آگ کو ہوا دیتی گئی۔ کھیتوں، باغات اور گھروں پر بمباری کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی ہے جو امریکی اور نیٹو افواج کی حکمت عملی ہے۔ ان کارروائیوں میں فاش غلطیاں ہوتی ہیں عام شہری ان میں مارے جاتے ہیں۔ اس بارے میں بھی شکوک و شبہات ہیں کہ افغانستان کے لئے امریکی کانگریس نے 56 ارب ڈالر کا جو ترقیاتی بجٹ منظور کیا تھا وہ کہاں اور کیسے صرف ہوا۔ اس رقم کا صرف پانچواں حصہ افغان حکومت کی صوابدید پر تھا، باقی تمام رقم امریکی محکمہ خارجہ، دفاع اور یو ایس ایڈ کے ذریعے خرچ ہونا تھی۔ یہ سب طالبان کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں۔ اس دلیل کو کون رد کر سکتا ہے کہ وہ امریکہ کی نسبت کرزئی حکومت کے کارندوں کو زیادہ، تحفظ دے سکتے ہیں۔ طالبان ملک کے مختلف حصوں میں اپنی متبادل حکومتیں قائم کر کے ریاست کے بچے کھچے انتظامی ڈھانچے کے درپے ہیں۔ امریکہ اور اس کے اتحادی ایک وقت افغانستان پر حملے کو درست ثابت کرنے کے لئے یہ کہا کرتے تھے کہ وہ افغان خواتین کا تحفظ چاہتے ہیں۔ افغان سیاستدانوں اور خواتین کے لئے کام کرنے والی مالالائے جویا (Malalai Joya) نے یہ حقیقت طشت از بام کر دی ہے کہ بہت سے جنگی سردار کرزئی حکومت کا حصہ ہیں۔ خواتین کے بارے میں وہ طالبان جیسے ناگوار احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ جویا نے برطانوی اخبار ''انڈیپنڈنٹ'' سے بات کرتے ہوئے کہا ''تمہاری حکومتیں دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہیں، تم لوگوں کو سچ نہیں بتایا جا رہا، آج بھی خواتین کے لئے افغانستان کے حالات اُتنے ہی تباہ کن ہیں جتنے طالبان کے دور اقتدار میں ہوا کرتے تھے۔ تمہاری حکومتوں نے بنیاد پرست طالبان کو ہٹا کر بنیاد پرست جنگی سرداروں کو ہم پر مسلّط کر

دیا''۔ بدنام زمانہ جنگی سرداروں کی حمایت حاصل کرنے پر جویا نے حکومت کو سخت ترین تنقید کا نشانہ بنایا تو ارکان پارلیمنٹ کی طرف سے قتل کی دھمکیاں اس خاتون کو دی جانے لگیں۔

اس بات پر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک سادہ سا سوال کوئی نہیں پوچھتا: جس قوم نے روسی فوج کی ڈٹ کر مزاحمت کی۔ آخری فتح کے لئے 10 لاکھ جانیں قربان کر دیں، امریکہ سے وہ کیوں نہ لڑے گی؟ امریکی حکومت شاید اپنے عوام کو دھوکہ دے پائے کہ روسی برے لوگ تھے اور وہ خود بہت اچھے ہیں مگر افغانوں کے لئے تو دونوں ایک ہی جیسے سفاک حملہ آور ہیں۔

بوب وڈورڈ نے لکھا ہے: جب بھی افغانستان میں مزید فوج بھیجنے کے معاملے پر بحث ہوتی تھی تو اوباما ہمیشہ موزوں سوال پوچھا کرتے: ''کس مقصد کے لئے ہم لڑ رہے ہیں؟ ہمیں کیا حاصل ہو گا اور یہ کہ فتح سے آپ لوگوں کی مراد کیا ہے؟'' جرنیل ہمیشہ خوف کو ہوا دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے افغانستان میں اسلامی انتہا پسندوں کو شکست نہ دی تو کل ہمیں نیویارک کے گلی کوچوں میں ان سے لڑنا پڑے گا۔ حقائق مسخ کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ امریکہ جنگ آزادی کے جیالوں سے نہیں ''طالبان نظریات'' سے نبرد آزما ہے۔ یہ الفاظ بالکل ان اصطلاحات سے پوری مشابہت رکھتے ہیں، جو ویت نام پر حملے کے حامی برتا کرتے۔ وہ یہ ارشاد فرمایا کرتے کہ اگر امریکہ ویت نام میں لڑے گا نہیں تو بہت سے دوسرے ممالک بھی کمیونزم کی گود میں جا گریں گے، حتیٰ کہ وہ امریکہ کے دروازے پر وہ پہنچ جائیں گے۔ ویت نام واقعی کمیونزم کی گود میں جا گرا۔ ان لوگوں کا تجزیہ غلط ثابت ہوا۔ اس کے بعد کیا سوشلزم کو دنیا میں فروغ حاصل ہوا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔

ویت نام کے ساتھ مشابہت کے اور بھی پہلو ہیں۔ افغانستان میں امریکی شکست نے پاکستان کو امریکہ کے لئے تختۂ مشق بنا کر رکھ دیا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے ویت نام میں ہزیمت کا نزلہ انکل سام نے کمبوڈیا پر گرایا تھا۔ شمالی وزیرستان میں نام نہاد ''محفوظ ٹھکانوں'' اور

حقانی گروپ کی موجودگی کو امریکہ خطے میں سب سے بڑا خطرہ قرار دیتا ہے، کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد 5000 ہے، حالانکہ یہ تعداد اس سے کہیں کم ہوگی۔ کیا اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ اپنی اندھی فوجی طاقت کے باوجود امریکہ ان پانچ ہزار جنگجوؤں کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہے۔ کیا ہمیں ان پانچ ہزار آدمیوں کا شکر گزار ہونا چاہئے؟ امریکہ حل من مزید (Do more) کے لئے پاک فوج پر مسلسل دباؤ ڈالے رکھتا ہے۔ افغانستان میں ناکامی کا ذمہ دار وہ پاکستان کو ٹھہراتا ہے کہ حقانی گروپ کو سنبھال نہیں سکا۔ یہ بات بے حد اہم ہے کہ پاکستان کا انجام کمبوڈیا جیسا ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ اگر پاک فوج ان پانچ ہزار عسکریت پسندوں سے نمٹنے کے لئے شمالی وزیرستان کا رخ کرتی ہے تو یہاں بسنے والے ساڑھے تین لاکھ شہریوں کا کیا بنے گا؟ کیا جنگجوؤں کے ساتھ ساتھ وہ بھی اس کا ہدف ہوں گے؟

بوب وڈورڈز کے مطابق سی آئی اے کے ڈائریکٹر لیون پنیٹا نے اوباما پر دباؤ ڈالا یہ کہا کہ کوئی بھی جمہوری صدر فوج کے مشورے کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اوباما نے اپنی شخصیت میں بروئے کار تمام مثبت رجحانات کو سلا دیا۔ کولن پاول (Colin Powell) کی بجائے انہوں نے پنیٹا کی بات سنی۔ کولن پاول کا مشورہ یہ تھا کہ ہمیشہ جنرلوں کے مشورے کو ماننا ضروری نہیں ہوتا۔ مجھے اس بات پر اور زیادہ افسوس ہوا کہ اس وقت پاکستان میں ایسی ذمہ دار حکومت نہ تھی جو اوباما کو ڈھنگ کا مشورہ دے سکتی۔ پاکستان میں قابل اعتبار اور خودمختار حکومت، افغانستان کے لئے موزوں حکمت عملی وضع کرنے میں اوباما کی مدد کر سکتی تھی۔ اس بات کی ضمانت دی جا سکتی تھی کہ القاعدہ مغرب پر حملوں کے لئے پاکستانی سرزمین استعمال نہ کرے۔ بات چیت کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے پاکستان مختلف اور متحارب فریقوں کو قریب لانے میں کلیدی کردار ادا کر سکتا تھا۔ پاکستان امریکہ کو افغانستان سے نکل جانے کا باعزت راستہ فراہم کرتا۔ افغانستان کے بعد پاکستان ہی وہ ملک ہے جسے دوسروں کے مقابلے میں

سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ افغانستان میں امریکی حکمت عملی کی تشکیل پر جب مباحثہ جاری تھا، تو حکومت پاکستان نے اس میں کوئی حصہ نہ ڈالا۔ زرداری کو صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ ہر وہ مشورہ اوباما تک پہنچایا جائے جس کے نتیجے میں امریکی امداد ملتی رہے تاکہ اس کی کرپٹ حکومت کو مصنوعی سہارا حاصل رہے۔ سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ امریکہ ہی تھا جو پاکستان میں اپنی کاسہ لیس، گھٹنوں کے بل جھکی حکومت قائم کرانے کے لئے 2008ء کے انتخابی نتائج پر اثر انداز ہوا۔ واشنگٹن کے بزرجمہر یہ سمجھتے رہے کہ اس حکومت کے ذریعے وہ اپنے مقاصد حاصل کر لیں گے۔

امریکہ اور پاکستان اس وقت جس حکمت عملی پر عمل پیرا ہیں، وہ صرف بنیاد پرستی کو فروغ دے سکتی ہے۔ پاکستان جیسا ملک آبادی جہاں تیزی سے بڑھ رہی ہو، نوجوان بڑی تعداد میں ہوں اور بے روزگاری کا دور دورہ ہو وہاں پر یہ رجحان خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اس وقت ایک ایسی نسل پاکستان میں موجود ہے جو برہمی کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہے۔ ایسے نوجوانوں کی ایک فوج جو امریکی ڈرون حملوں اور پاک فوج کی کارروائیوں کے نتیجے میں اپنے عزیز، رشتہ دار کھو چکے۔ بنیاد پرستی محض غریبوں اور ناداروں تک محدود نہیں۔ خوشحال خاندانوں کے نوجوان بھی قومی خودمختاری کے مجروح ہونے پر توہین کے احساس میں مبتلا ہیں۔ سی این این کے ایک سروے کے مطابق پاکستان کے 80 فیصد لوگ امریکہ کو ملکی سالمیت کے لئے بھارت سے بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ پاکستان بھارت کے ساتھ تین جنگیں لڑ چکا ہے امریکیوں کا کارنامہ کتنا بڑا ہے۔ کیسا کمال انہوں نے کر دکھایا۔ امریکہ کی جانب سے دھونس اور دھمکی کے ذریعے استعماری مقاصد کے حصول کی کوشش اور مغربی ثقافتی یلغار کے ذریعے مقامی ثقافت کی شکست و ریخت۔ اگر اس پر پاکستانی عوام بھڑک نہ اٹھتے تو اور کیا کرتے۔ یہ ایک دھماکہ خیز صورت حال ہے۔ دنیا بھر کے دوسرے مسلمانوں کی طرح پاکستانیوں کی کچھ تعداد بھی مغربیت کو ایک بڑا خطرہ سمجھ کر روایتی طرز زندگی میں پناہ لینے پر مجبور ہے۔

2011ء کے آغاز میں گورنر پنجاب کے افسوسناک قتل نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ پاکستانی معاشرہ کس تیزی سے تقسیم ہو رہا ہے۔ سلمان تاثیر نے ایک مسیحی خاتون کا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی، جسے توہین رسالت کے الزام پر سزائے موت سنائی گئی تھی۔ تاثیر نے بے گناہ اقلیتوں اور مسلمانوں کے خلاف اس قانون کے امتیازی استعمال کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ نتیجے میں ان کے اپنے ہی محافظ نے دن دہاڑے فائرنگ کر کے انہیں ہلاک کر دیا۔ دہشت گردی کی جنگ نے پورے ملک کو امریکہ کے اسلام مخالف حامیوں اور اسلام پسند امریکہ مخالفین میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ نائن الیون سے پہلے توہین رسالت قانون کے غلط استعمال سے متعلق تاثیر کے بیانات کو اخبارات میں بھی نمایاں جگہ نہ مل پاتی۔ زیادہ سے زیادہ مذہبی رہنماؤں کی جانب سے اپنے موقف کے حق میں اپنے لوگوں کو متحرک کرنے کے لئے کچھ بیانات سامنے آجاتے۔ آج ہمارا معاشرہ جس طرح خود نمایاں ہے، اس میں کسی بھی شخص کا ایک دھڑے سے تعلق، اس کی زندگی خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ طالبان اپنے ہر مخالف کو امریکی پٹھو قرار دیتے ہیں۔ مساجد کے ایسے امام بھی ہیں جو خودکش حملوں کو اسلامی تعلیمات کے منافی سمجھتے ہیں۔ امریکی آلۂ کار ٹھہرا کر انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے یا پھر خودکش بمبار انہیں اڑا دیتے ہیں۔

خیبر پختونخوا میں برسر اقتدار امریکہ کی حامی جماعت اے این پی، طالبان کی کھلی مخالفت کے سبب عسکریت پسندوں کی زد میں ہے۔ ان میں سے بعض شیعہ مکتب فکر کے لوگوں کو غیر مسلم قرار دیتے ہیں۔ ان کی عبادت گاہوں کا احترام نہیں کرتے۔ دوسری طرف ہم جیسے لوگ ہیں جو امریکہ کے ساتھ غیر ضروری تعاون اور فوجی کارروائیوں کے خلاف بات کرتے ہیں انہیں طالبان کا ہمدرد قرار دے دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ دہشت گردی کی جنگ کے معاملے پر بامعنی مباحثے کے امکانات کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ گاہے بعض لوگ کسی ایک فریق کے حق میں دلائل دینے سے بھی ڈر جاتے ہیں۔

سلمان تاثیر کے قتل سے ایک اور بات سامنے آئی۔ ریاست مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ تاثیر کا قاتل جب عدالت میں پیشی کے لئے آیا تو بہت سے وکلاء نے ایک ہیرو کی طرح اس کا استقبال کیا۔ پھولوں کی پتیاں اس پر نچھاور کی گئیں۔ ان مذہبی رہنماؤں کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی جا سکی جو مساجد، ریلیوں اور ٹی وی پروگراموں میں بحث کے دوران لوگوں کو اکساتے رہے۔ زرداری نے جو سلمان تاثیر کے قریبی دوست تھے، ان کے جنازے میں شرکت سے گریز کیا۔ دو ماہ بعد اقلیتوں کے وزیر شہباز بھٹی کو اسلام آباد میں ان کی والدہ کے گھر کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ ریاست جوں جوں کمزور ہوتی جاتی ہے، مقتدر اور بااختیار شخصیات کے درمیان زیادہ سے زیادہ دولت اور اختیار سمیٹنے کے لئے کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جیسے عظیم مغل سلطنت کے زمانہ زوال میں مختلف جنگی سردار اور گورنر اپنے علاقوں کو خود مختار بنانے لگے تھے۔ جب سیاستدان اپنی سکیورٹی کے تہہ در تہہ حصار میں قید ہو جائیں تو پہلے ہی سے محدود وسائل عوام کے بجائے امراء کی حفاظت پر ضائع ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں کراچی اور بلوچستان میں ہونے والے قتل نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ ہماری مغربی سرحد کا بڑا حصہ خانہ جنگی کی لپیٹ میں ہے جبکہ جرائم اور کرپشن بلندی کی نئی حدوں کو چھو رہی ہیں۔ امریکہ واویلا کرتا ہے کہ ریاست پاکستان کی ناکامی کی صورت میں ایٹمی ہتھیار غلط ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے۔ خود امریکہ کی اپنی حکمت عملی پاکستان میں دھڑے بندی، بنیاد پرستی اور انتشار کو بڑھاوا دے کر ملک کو عدم استحکام کی طرف دھکیل رہی ہے، جس کا اندیشہ وہ ظاہر کرتا رہتا ہے۔

ریاست جس قدر کمزور ہوتی جائے گی، انتہا پسندی پر قابو پانا اتنا ہی مشکل ہوتا جائے گا۔ 2010ء میں کچھ خطرناک خبریں منظر عام پر آئیں۔ یہ کہ افغانستان میں موجود امریکی فوجی قیادت طالبان کے تعاقب میں پاکستان کے قبائلی علاقوں پر حملے کی خواہش رکھتی ہے۔ اس پر کنگز کالج لندن میں شعبہ وار سٹڈیز کے پروفیسر اور واشنگٹن کی نیو امریکہ فاؤنڈیشن (New

America Foundation) کے سینئر فیلو اینا ٹول لائی ون (Anatol Lieven) نے اس
انداز فکر کو پاگل پن کہا تھا۔ اپنے ایک مضمون میں، جو پاکستان کے کئی اخبارات میں چھپا، انہوں
نے لکھا ''جو چیز پاکستان کو واقعی ناکامی سے دوچار کر سکتی ہے اور جس کے نتیجے میں انتہا پسندوں
اور دہشت گردوں کی قوت میں غیر معمولی اضافہ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ پاک فوج میں تقسیم
گہری ہو جائے۔ پھر ممکن ہے کہ فوج کا ایک حصہ امریکہ کے ساتھ اتحاد کے خلاف بغاوت کر
دے''۔ انہوں نے کہا، پاک فوج کے بہت سے افسروں نے انہیں خبردار کیا تھا کہ طالبان اور
القاعدہ کے تعاقب میں امریکی فوج پاکستان میں داخل ہوئی تو یہ نہ صرف پاک امریکہ تعلقات
بلکہ خود پاک فوج کی یکجہتی کے لئے خطرناک ہوگا۔

پاک فوج کے ایک سابق جنرل کا کہنا ہے ''گو کہ ڈرون حملوں کو پاک فوج کے عام
افسر اور جوان ذلت آمیز خیال کرتے ہیں لیکن یہ اس لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں کیونکہ پاک فوج اس
بارے میں کچھ نہیں کر سکتی''۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ مشرف پر قاتلانہ حملے اور آرمی
ہیڈ کوارٹر راولپنڈی پر عسکریت پسندوں کا حملہ اندرونی نوعیت کے معاملات تھے جبکہ اپنے ہی
محافظ کے ہاتھوں سلمان تاثیر کے قتل نے پاکستان کی سکیورٹی فورسز کے اندر بنیاد پرستی میں
اضافے کو واضح کر دیا۔

2 مئی کو اسامہ بن لادن کی پناہ گاہ کا انکشاف ہر پاکستانی کے لئے شرم کی بات تھی لیکن
اس کی موت پاک فوج کے لئے بہت بڑا دھچکا ثابت ہوئی۔ پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ لوگ میڈیا پر
کھلے عام فوج کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے۔ مسلسل یہ سوال پوچھا جا رہا تھا ''ایک ایسی فوج پر اپنے
بجٹ کا اتنا بڑا حصہ کیسے خرچ کیا جا سکتا ہے جو ملک کی خودمختاری کا دفاع نہیں کر سکتی؟ فوجی
اکیڈمی سے اتنا قریب امریکی ہیلی کاپٹر 45 منٹ تک اڑتے رہے، دھماکے اور فائرنگ ہوتی
رہی۔ اس کے باوجود فوج نے جوابی کارروائی کیوں نہ کی؟ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جس عمارت پر

دھاوا بولا جا رہا ہے، وہ اسامہ بن لادن کا گھر ہے۔ تو پھر یہ کسی کا بھی گھر ہو سکتا تھا۔ ایسے میں
فوج کہاں تھی؟ گھر کے اندر موجود لوگوں کی پہچان ظاہر ہونے سے پہلے کم از کم اپنے لوگوں کو
تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کیوں نہ کی گئی؟ پورا ملک غصے کی آگ میں جل رہا تھا۔ مجھے یہ فکر
کھائے جا رہی ہے کہ اگر معاملات اسی طرح خرابی کی طرف بڑھتے رہے تو ایسا نہ ہو کہ ہمیں
فوج کے اندر کسی بغاوت کا سامنا کرنا پڑ جائے۔ یہ اندیشہ پاکستان کے لئے بدترین ڈراؤنا
خواب بن چکا ہے۔

امریکہ کی ہٹ دھرمی اور گمراہ کن حکمت عملی سے پاکستان اور افغانستان کو پہنچنے والے
بے پناہ نقصان سے قطع نظر، یہ بات خود امریکی مفادات کے لئے بھی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ یہ
حقیقت بار بار واضح ہو کر سامنے آ چکی ہے۔ ٹائمز سکوائر میں بم دھماکے کی بچگانہ کوشش کرنے
والے پاکستانی نژاد فیصل شہزاد کا مقدمہ امریکہ کے لئے بڑی بدنامی کا باعث ہوا۔ شہزاد نے اس
حرکت کو درست قرار دینے کے لئے امریکی خارجہ پالیسی کو حوالے کے طور پر پیش کیا۔ اس نے
عدالت میں کہا ''میں مجرم ہوں اور 100 بار اپنے اس جرم کا اقرار کرنے کو تیار ہوں کیونکہ جب
تک امریکہ عراق اور افغانستان سے اپنی فوجیں واپس نہ بلائے گا، صومالیہ، یمن اور پاکستان
میں ڈرون حملے بند نہ کیے جائیں گے، مسلم ممالک پر تسلط جمانے کا سلسلہ بند نہ ہوگا، اور جب
تک مقامی مسلمانوں کی جاسوسی بند نہ کی جائے گی، ہم امریکہ کے خلاف حملے کرتے رہیں
گے''۔ جب جج نے اس سے سوال کیا کہ تمہارا حملہ کامیاب ہو جاتا تو اس میں بچے بھی ہلاک ہو
سکتے تھے، تو اس نے ڈرون حملوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا ''افغانستان اور عراق میں حملے
کرنے والے بچوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، وہ کسی کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ڈرون
طیارے عورتوں کو، بچوں کو، سب کو جلا کر مار ڈالتے ہیں۔''

ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ بنیاد پرستی کی وہ لہر جو امریکی پالیسیوں کی وجہ سے

افغانستان، پاکستان اور پھر صومالیہ اور یمن جیسے ملکوں میں خون خرابہ اور انتشار دیکھ کر خود مغرب میں مقیم مسلمانوں میں اٹھ رہی ہے وہ کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

20ویں صدی میں نوآبادیاتی تسلط کے خلاف تحریک آزادی کی قیادت انہی لوگوں نے کی جنہوں نے مغرب میں تعلیم پائی تھی۔ قائداعظم، گاندھی اور نہرو سب کو مغرب کے جمہوری معاشروں کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ اپنے عوام کے لئے بھی انہی حقوق کے خواہشمند تھے۔ خود مجھے بھی جمہوریت، قانون کی حکمرانی اور فلاحی ریاست کے تصور کا درست ادراک اسی وقت ہوا جب میں تعلیم حاصل کرنے برطانیہ گیا۔ وہ مسلمان جو مغربی ممالک میں پروان چڑھتے اور تعلیم حاصل کرتے ہیں انہیں انسانی حقوق کے اصولوں کی کہیں بہتر آگہی حاصل ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں قانون اجازت نہیں دیتا کہ سی آئی اے ڈرون حملوں سے کسی کے بیوی بچوں اور ہمسایوں کو محض شبہ کی بنیاد پر ہلاک کردے۔ سی آئی اے خود ہی شک میں مبتلا ہوتی، خود ہی تصدیق کرتی اور خود ہی بمباری کا حکم دے کر خطا کاروں اور بے گناہوں کو مار ڈالتی ہے۔ امریکہ یہ سمجھتا ہے کہ دہشت گردی کے منصوبے پاکستان میں تیار ہوتے ہیں لیکن ان منصوبوں پر عملدرآمد تو وہاں کے مقامی مسلمانوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ بڑی بدقسمتی ہوگی کہ کوئی دوسرا فیصل شہزاد اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جائے۔ اس خوں ریز جنگ میں پاکستان کو غیر جانبدار رہنا چاہئے تھا۔

ہم امریکہ کو تعاون کی پیشکش کر سکتے تھے، لیکن اپنی فوج کو کرائے کے سپاہیوں کے طور پر ہرگز استعمال نہ کرنا چاہئے تھا۔ قتل و غارت اس لئے جاری ہے کہ پاک فوج کو امریکہ کا ایجنٹ سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرف امریکہ اور دوسری طرف دہشت گرد، ہماری فوج ان دونوں کے درمیان پس کر رہ گئی ہے۔ ایک طرف امریکہ مخالف انہیں امریکہ کے کٹھ پتلی قرار دے کر نشانہ بناتے ہیں۔ دوسری طرف امریکی انہیں مجبور کرتے ہیں کہ اپنے ہی لوگوں کے خلاف کارروائی

کریں۔ جب سے عسکریت پسندوں نے اعلان جہاد کیا ہے، پاک فوج کے اہلکاروں اور تنصیبات پر 40 بڑے حملے ہو چکے ہیں۔

سب سے پہلے امریکہ کو یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ وہ افغانستان سے جس قدر جلد ممکن ہو، اپنی فوج واپس بلالے۔ اُسامہ بن لادن کی ہلاکت کے بعد صدر اوباما کے لئے بہترین موقع تھا کہ وہ فتح کا اعلان کرتے ہوئے افغانستان سے نکل جائیں اور امن کو ایک موقع دیں۔ آخر امریکی اسامہ کے تعاقب ہی میں افغانستان میں داخل ہوئے تھے۔ یہ واحد اہم ترین قدم ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا بھر کے مسلمانوں کا غصہ ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی افغان عوام کو خود اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع میسر آ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسی سے استحکام جنم لے گا۔

اس اقدام کے نتیجے میں پاکستان بھی تشدد کی دلدل میں مزید دھنسنے سے بچ جائے گا۔ ایسے کسی اقدام کو انتہائی دانشمندی کے ساتھ روبہ عمل لانے کی ضرورت ہوگی تاکہ افغانستان کو اس طرح کے خون خرابے اور انتشار سے بچایا جا سکے جو سوویت افواج کے اچانک نکل جانے سے شروع ہوا تھا۔ 30 ہزار فوجیوں کی کمک افغانستان بھیج کر جنگ کا پانسہ پلٹ دینے کا منصوبہ بھی ناکام ہو چکا۔ اوباما نے خود کو جرنلوں کی رائے کا اسیر بنالیا۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ فوجی افسروں کی سمجھ بوجھ میدان جنگ کے ادراک تک محدود ہوتی ہے۔ ان میں یہ صلاحیت نہیں کہ افغانستان کے پیچیدہ معاملے کی گہرائی تک پہنچ سکیں۔ غیر ملکی فوجوں کے خلاف مزاحمت کی جنگ اور دینی بنیادوں پر اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے جدوجہد نے افغانستان میں، انکل سام کی کامرانی کے امکان کو ناممکن بنادیا۔ افغانستان میں ایسے لوگوں کی کبھی کمی نہ ہوگی جو اپنے ملک پر جان قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ یہ کوئی ایسی جنگ نہیں جس کا فیصلہ عددی برتری اور بہتر ہتھیاروں کی بنیاد پر ہوگا۔ پاکستانی صحافی میر عدنان عزیز کے الفاظ یہ ہیں ”افغانستان کی لڑائی ایک ہاری ہوئی جنگ ہے۔ اپنی تاریخ، جغرافیائی خدوخال اور ثقافت کے باعث یہ علاقہ

ہر اس غیر ملکی قوت کا قبرستان رہا ہے، جس نے اس خطّے کے مکینوں پر اپنی مرضی مسلّط کرنے کی کوشش کی"۔

افغان طالبان سے مذاکرات اور سمجھوتے کی ضرورت کا احساس 2010ء اور پھر 2011ء کے اوائل میں زیادہ ابھر کر سامنے آیا۔ امریکہ اہم طالبان رہنماؤں کے ساتھ سیاسی تصفیے تک پہنچنے کے لئے براہ راست خفیہ مذاکرات کر رہا ہے۔ امریکہ کا اتحادی برطانیہ بھی پرامن حل کی کوششوں میں شریک ہے۔ برطانوی افواج کے سربراہ جنرل سر ڈیوڈ رچرڈ (General Sir David Richard) کا کہنا ہے "اسلامی عسکریت پسندوں پر مکمل فتح کا حصول نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی ممکن البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ انہیں محدود کر دیا جائے۔" اس دوران برطانوی پارلیمان کے لیے ایک پارلیمنٹری رپورٹ میں خبردار کیا گیا کہ مذاکرات کا وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود طالبان کی تحریک ایک افغان تنظیم ہے، بین الاقوامی نہیں۔ افغان طالبان القاعدہ کی طرح کسی عالمی جہاد میں شریک نہیں۔ امریکہ اور یورپ میں ہونے والی کسی بھی دہشت گردی میں بھی کوئی افغانی ملوث نہیں پایا گیا۔

اس بات کا بھی ہرگز کوئی امکان نہیں کہ افغان عوام ایک بار پھر طالبان طرز کی حکومت قائم کرنے کی اجازت دیں یا پھر سے القاعدہ کو حکومت پر اثر انداز ہونے کا موقع میسر آئے۔ اس بات کی تصدیق قندھار میں مصروف عمل محقق ایلکس سٹرک کان لنشاٹن (Alex Strick Kan Linschoten) اور فیلکس کیوہن (Felix Kuehn) بھی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ طالبان قیادت جارحیت کے خاتمے کے لئے القاعدہ کے ساتھ اپنے روابط منقطع کرنے اور اسے قائل کرنے کے لئے تیار ہے کہ افغانستان کی سرزمین کو دہشت گردی کا اڈہ نہیں بنایا جائے گا۔ طالبان کے ساتھ افغان سیاسی نظام کے ذریعے ہی نمٹا جا سکتا ہے۔ یہ پاکستان، ایران اور سعودی عرب کی ثالثی میں اتفاق رائے سے وجود میں لایا جائے اور یہی لوگ طالبان

سے معاملات طے کریں۔ القاعدہ سے علیحدگی اختیار کرنے کے لئے انہیں کئی طرح کی پیشکشیں کی جا سکتی ہیں۔ اس وقت امریکہ بیک وقت "جنگ اور مذاکرات" کی بدحواسی پر مبنی حکمت عملی پر گامزن ہے۔ مذاکرات وہ بھی کرنا چاہتے ہیں اور بمباری بھی روکتے نہیں۔ یہ طریق کار ناکام رہا۔ امریکی فوجی عام لوگوں کو طالبان سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ایک بار تو طالبان سمجھ کر پکڑے جانے والے 80 فیصد افراد دو ہفتے کے اندر رہا کر دیئے گئے۔ وہ سب کے سب غیر متعلق نکلے۔ جولائی 2011ء میں اقوام متحدہ نے بھی تسلیم کیا کہ افغانستان پر حملے کے بعد سے امسال سب سے بڑی تعداد میں عام شہری قتل ہوئے۔

پاکستان کی جغرافیائی صورت حال نے اس کے لئے معاملات کو اور بھی زیادہ خراب کیا ہے۔ ملک کے جنوب اور مشرق میں روایتی حریف بھارت ہے۔ دوسری طرف ایران ہے جو امریکہ نواز عراق اور امریکہ نواز افغانستان کے درمیان پھنسے رہنے کے خوف میں مبتلا ہے۔ قریب ہی روس بھی ہے جو نہیں چاہتا کہ افغانستان اور پاکستان میں جاری بدامنی اس کے حاشیے پر واقع مسلم ریاستوں تک جا پہنچے۔ امریکہ کو القاعدہ کا خطرہ دامن گیر ہے۔ خطے میں تمام ممالک کے مفادات داؤ پر لگے ہیں امن اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے، سب ممالک کے تحفظات جب پیش نظر رہیں۔ افغانستان میں کونسی حکومت ہونی چاہیے؟ فیصلہ افغان عوام کو کرنا ہے اور اس میں ہرگز کوئی بیرونی مداخلت نہ ہونی چاہیے۔

پاکستان میں جاری عسکری کارروائیاں ختم ہو سکتی ہیں، اگر افغانستان سے امریکی افواج نکل جائیں۔ کابل میں سی آئی اے کے سابق سٹیشن چیف اور معروف کتاب "سیاسی اسلام کا مستقبل" (The Future of Political Islam) کے مصنف گراہم فلر (Graham Fuller) نے 2009ء میں ہفنگٹن پوسٹ (Huffington Post) میں لکھا تھا "پاکستان میں غصے اور نفرت کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے جذبات کو صرف ایک صورت میں ٹھنڈا کیا

جا سکتا ہے۔ افغانستان میں موجود افواج افغان سرزمین سے نکل جائیں۔ اس اقدام سے خطے
میں موجود تناؤ کی کیفیت کم ہونا شروع ہو گی۔ پاکستان حکمرانی کا خاطر خواہ تجربہ رکھتا ہے۔
حالات معمول پر آجائیں تو وہ اپنے ہاں موجود اسلامی بنیاد پرستوں اور مسائل پیدا کرنے والے
عناصر سے بخوبی نمٹ سکتا ہے۔ اب تک تو یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ پوری اسلامی دنیا میں،
پاکستان وہ ملک ہے، جہاں مذہبی جماعتوں کے ووٹ سب سے کم ہیں۔ لیکن امریکی پالیسیوں
نے مقامی سطح پر قوم پرستی، غیر ملکیوں سے نفرت اور اسلامی بنیاد پرستی کو دھماکہ خیز حالت میں پہنچا
دیا ہے۔ امریکی مطالبہ یہ ہے کہ افغانستان میں ناکام امریکی پالیسیوں کی قیمت پاکستان ادا
کرے، اسی لئے پاکستان اپنے اندرونی بحران سے نمٹنے کے قابل نہیں۔"

جنرل اورکزئی، کے علاوہ فاٹا سے تعلق رکھنے والے دو پاکستانی سفیر رستم شاہ مہمند اور ایاز
وزیر، ان کے سوا قبائلی علاقوں کے سبکدوش پولیٹیکل ایجنٹوں سے بات چیت کے بعد میرا تجزیہ
یہ ہے، قبائلی علاقے میں موجود عسکریت پسندوں میں 90 فیصد لوگ نہ تو مذہبی انتہا پسند ہیں اور نہ
ہی دہشت گرد۔ یہ ہمارے اپنے عام قبائلی لوگ ہیں جو فوجی مداخلت، ڈرون حملوں اور
افغانستان میں امریکی تسلط کے خلاف برسر پیکار ہیں۔ ہمیں دراصل باقی 10 فیصد سے نمٹنے کی
ضرورت ہے۔ ان میں کچھ لوگ وہ ہیں جو جہادی تنظیموں کا حصہ تھے، جو کبھی سوویت فوج کے
ساتھ لڑے اور آج خود کو طالبان سمجھتے ہیں۔ باقی القاعدہ کے ارکان ہیں۔ ان میں کچھ کٹر نظریاتی
بھی شامل ہوں گے جو اسلامی امارات قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ کچھ ایسے لوگ بھی
جنہیں لال مسجد جیسے خون خرابوں اور ناانصافیوں نے انتہا پسندی کی طرف دھکیل دیا۔ مسئلے کا حل
مزید فوجی کارروائی نہیں بلکہ ان 10 فیصد کو تنہا کر دینے میں پوشیدہ ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب
امریکہ افغانستان سے نکل جائے یا پاکستان دہشت گردی کی جنگ سے باہر آئے اور قبائلی
علاقے سے پاک فوج کو واپس بلا لیا جائے۔ اس موضوع پر آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل پاشا

سے میری بات ہوئی تھی۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر امریکی جنگ سے ہم الگ ہو جائیں،
قبائل سے مذاکرات کا آغاز کر دیں اور قبائلی علاقوں سے فوج واپس بلا لیں تو ان 10 فیصد کا 90
دن کے اندر صفایا کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی امریکہ افغانستان سے نکلے گا، بنیاد پرستی کو فروغ دینے
والے امریکہ مخالف جذبات کم ہونے لگیں گے۔ پاکستان آزاد ہو گا کہ وہ اپنی شرائط پر دہشت
گردی کا مسئلہ حل کر سکے۔ اپنی تمام تر توجہ اس بات پر مرکوز کرتے ہوئے، معاملے کے سب
فریق یکجا کر کے قبائلی علاقے میں امن اور افہام و تفہیم کے طریق کار پر اتفاق رائے ممکن ہو
جائے گا۔ پاکستان میں ایک قابل اعتبار حکومت ہی، عوام جسے امریکی پٹھو نہ سمجھتے ہوں
عسکریت، پسندوں سے بامعنی مذاکرات کرنے کے قابل ہو گی۔ قبائل کو وہی مطمئن کر کے
دہشت گردوں سے نمٹنے میں حکومت کی امداد پر آمادہ کر سکے گی۔ افغانستان میں صورت حال
بدل جائے تو ہم ایک تاریخ ساز امکان کی دہلیز پہ کھڑے ہوں گے۔ تبھی ہم اس بات کا فیصلہ
کر پائیں گے کہ اپنے وطن کو کس طرح تعمیر کرنا چاہتے ہیں؟ اسے کیا بنانا چاہتے ہیں؟

باب دہم

جیسے پتھر کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے

کلام اقبالؔ ہمارے لیے رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے اور پھر شروع کے برسوں میں یہی ہمارا اندازِ فکر یہی تھا۔ ریڈیو پاکستان سے ہر صبح علامہ اقبال کی لکھی ہوئی بچوں کی دُعا سنائی جاتی۔ ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اقبالؔ کے یہ الفاظ، فقط زبانوں سے ادا نہ ہوتے بلکہ بچوں کے دِلوں پر نقش ہوتے چلے جاتے۔ پھر یہ دعا نشر کرنے کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ بیشتر کم سن اب اس نورانی کلام سے آشنا ہی نہیں۔

اقبالؔ کا زمانہ ہم سے مختلف تھا مگر جو کچھ انہوں نے کہا وہ آج بھی سچ ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ اقبالؔ کا پیغام آج ہمارے لئے اہم ہے۔ ماضی اور حال کے کسی بھی مفکر سے بڑھ کر، انہوں نے کمال بے خوفی سے بیک وقت تقلید اور جدت پرستی کا مقابلہ کیا۔ اس سے بھی زیادہ

اہم بات یہ کہ وہ قرآن کریم کا بہت ہی گہرا فہم وادراک رکھتے تھے۔ یہی ان کی مربوط بصیرت کی بنیاد ہے۔ اقبال نے ہمیں بتایا کہ اسلام کی بہترین تعلیمات اور اعلیٰ ترین نظریات کے مطابق ایک مسلمان معاشرہ اپنی اجتماعی زندگی کو کیونکر منظم کر سکتا ہے۔ وہ اسلام کے روحانی اصولوں کی روشنی میں زندگی گزارنے کا سلیقہ بتاتے ہیں۔ زمینی حقیقتوں کو اسلام کی اخلاقی اقدار کے مطابق ڈھالنا۔ اقبال کا مقصدِ اولیٰ ہے۔

زمانہ بدلتا ہے تو مسائل بھی بدل جاتے ہیں لیکن اصول وہی رہتے ہیں۔ بنیاد وہی ہے اور آنے والی نسلوں کی اسی طرح رہنمائی کر سکتی ہے۔ پاکستانیوں کے قلوب واذہان میں جو مقام اقبال کو حاصل ہے وہ کسی اور کو کبھی نصیب نہ ہو سکا۔ کم ہی لوگ، ان کے علم کی گہرائی اور وسعت کو پا سکتے ہیں۔ ان کی خیرہ کن خلاقیت اور ان کے مربوط فلسفے کو سمجھنا مشکل ہے، اس کے باوجود قاری کو ان سے الفت ہو جاتی ہے۔ ان کے افکار میں ایسا سحر اور قلم میں ایسا جادو ہے کہ کروڑوں لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے ان کے چند ہی اشعار سنے ہوں گے۔ پھر بھی پاکستان میں سب سے زیادہ انہی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ انہی کی شاعری سب سے زیادہ مقبول ہے حتیٰ کہ ان کی علامتیں بھی۔ مثال کے طور پر ''شاہین'' کہ نیم خواندہ لوگوں سے بھی یہ لفظ آپ سنیں گے۔ ان کی شاعری اور ان کی نثر میں بیان کردہ فلسفہ ملک کے ہر تعلیمی ادارے میں پڑھایا جانا چاہیے مگر افسوس کہ وہ اب بیشتر خارج از نصاب ہے، صرف بعض خاص مضامین کے طلبا ہی کو اقبال کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے۔

اُن کے مشہور اشعار سیاق وسباق سے جدا کر کے پڑھے جاتے ہیں مگر ان کی شاعری کا بنیادی پیغام جو انقلابی روح، جدتِ خیال، انسانی وقار اور خودی سے عبارت ہے کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا گیا ہے۔

بار بار علامہ اقبال قرآن کی اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں، ''اللہ کسی قوم کی حالت کبھی

نہیں بدلتا جب تک وہ خود کو بدلنے پر آمادہ نہ ہو۔'' (13:12)

وہ اپنے دور کے مسلمانوں کی مایوسی اور گہرے رنج سے آشنا تھے۔ حالات کے اندوہ نے جنہیں بے بس کر دیا کہ وہ اپنے حالات بدل سکیں، اور انہوں نے اپنی زندگیاں بدلنے کے لیے عبادت پر قناعت کر لی۔ اقبال دعا اور عبادت کے قائل تھے مگر بنیادی طور پر وہ عمل کے قائل ہیں کہ تقدیر صرف عمل ہی سے بدلی جا سکتی ہے اور اپنی خودی کی تعمیر سے۔ اقبال کے نظریات وافکار کی بنیاد عمل پر ہے۔ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں انفرادی اور سماجی سطح پر مثبت تبدیلی کا حصول ہے۔ آج جب پاکستانی معاشرہ اخلاقی بحران کا شکار ہے، ایسے میں یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اقبال کے ہمہ جہت فلسفے کی بنیاد پر جامعہ تعلیمی پالیسی مرتب دی جائے، پاکستان کے نوجوانوں کے لیے اپنے دین اور تشخص کو سمجھنے کے لیے اقبال کے افکار بنیادی رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ولولہ انگیز ہیں اور انہیں شاہین بننے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ جو خود شکار کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ گدھ کی طرح نہیں جو مردار پر گزر بسر کر لیتا ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

پاکستان کے روحانی خالق (Spiritual founder) کو اس طرح کیوں بھلا دیا گیا۔ یہ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اُس ذہنی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی انحطاط کو سمجھیں، پاکستان کی تاریخ جس سے عبارت ہے۔ جاگیردارانہ سماج اور طاقتور مفادات نے پاکستانی معاشرے سے آزادیٔ فکر وعمل چھین لی۔ آمرانہ حکومتوں نے ہماری روحوں کو کچل کر رکھ دیا۔ ظلم اور جبر کی مزاحمت سے ہم گھبراتے ہیں۔

اقبال وہ بے باک مفکر تھے جس نے پسے ہوئے طبقات کو ہر طرح کی آمریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا شعور بخشا۔ مذہبی، سیاسی، ثقافتی، فکری، معاشی یا کسی بھی اور طرح کا

جبر اقبال کے نزدیک قابلِ قبول نہ تھا۔ اسی شعور نے برصغیر کے مسلمانوں کو وہ قوت فراہم کی جسے بروئے کار لاکر وہ داخلی اور خارجی زنجیروں کو کاٹ سکتے تھے۔ اقبال کے الفاظ ان کے اشعار اور ان کی فکر کو پاکستان کے اہلِ اقتدار اپنے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ عوام ان کے محتاج رہیں تاکہ ان کے سامنے سر نہ اٹھائیں اور اپنے حقوق کا مطالبہ ان کی زبان پر کبھی نہ آسکے۔ ان مقاصد کے لیے جس حد تک ان سے ممکن ہو سکا انہوں نے اقبال کے ان افکار پر پردہ ڈالے رکھا جو ظالمانہ اقتدار اور سرمایہ داری کے خلاف تھے۔ اقبال کے افکار و نظریات کا اوجھل ہو جانا اتفاقی امر نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کا حصّہ ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

میں تحریکِ انصاف کے جوانوں کو یہ شعر اکثر سناتا ہوں کہ صداقت بہادری اور انصاف ہی انسان کی بہترین اوصاف ہیں۔

ہمیں سماجی انصاف کے لیے اقبال کے عزم پہ توجہ دینی چاہیے اور اس کرب کو محسوس کرنا چاہیے جو اقبال دیسی محنت کشوں کو دیکھ کر محسوس کرتے۔ مثال کے طور پر ان کی وہ یادگار نظم جس میں وہ اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ اس نظم میں انہوں نے اللہ کے عدل اور دنیا میں کسمپرسی کی زندگی جینے والوں کے استحصال میں موجود المیے کی نشاندہی کی۔ وہ محنت کشوں کا استحصال کرنے والے لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

اقبال جیسی عظمت کا حامل کوئی دوسرا شاعر اور مفکر تلاش کرنا محال ہے جس نے آبِ رواں ایسے تسلسل اور جوش و جذبے کے ساتھ پسے ہوئے طبقات کے لیے آواز بلند کی ہو۔ اگر

اقبال کی تعلیمات کو اپنا کر مغرب زدہ امیروں اور بنیاد پرستی کا ایندھن بننے والے غریبوں کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے ختم ہونے لگیں۔ بنیاد پرستی کے خلاف سب سے اہم ہتھیار اسلام کی روشن خیالی ہے۔ دونوں طرف موجود انتہا پسندوں کو تاریخ اسلام کا ادراک حاصل کرنے کی کوشش تو کرنی چاہیے کہ کس طرح اس دور میں جب یورپ میں جہالت اور تعصب کا راج تھا، اسلام کے زیرِ سایہ تمام مذاہب اور مختلف نقطہ ہائے نظر کو برداشت کیا جاتا۔ آٹھویں صدی کے نصف سے تیرھویں صدی کے وسط تک کا زمانہ اسلام کا سنہری دور کہلاتا ہے، جب اسلامی دنیا سپین، پرتگال، جبرالٹر اور شمالی افریقہ سے آگے جنوب مغرب میں وسط ایشیا تک پھیلی تھی۔ علمی وسائنسی دریافتیں اور مذہبی رواداری مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ اسلام دینی اداروں کے جبر پر یقین نہیں رکھتا۔ علامہ اقبال نے بارہا اس طرف اشارہ کیا کہ قرآن پاک میں بیان کردہ قانونی اصولوں میں وسعت اور ارتقا کی زبردست گنجائش موجود ہے۔

نویں صدی عیسوی کے اوائل میں مسلم مفکرین میں بچوں کے حقوق پر غور و فکر اور بحث و مباحثے کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان مباحث میں رکھ رکھاؤ کا یہ عالم تھا کہ ہر دانش ور اپنے دلائل کا آغاز ان کلمات سے کرتا ''ممکن ہے کہ میری بات درست نہ ہو۔'' آزادانہ مکالمے کا یہ ماحول اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک آزادیٔ فکر کی ضمانت مہیا اور موجود نہ ہو۔

مکہ کے لوگوں نے انسانی تاریخ کے سب سے سچے آدمی کو آزادیٔ اظہار کا حق دینے سے انکار کیا حالانکہ وہ خود انہیں صادق و امین کہتے تھے۔ مدینہ منورہ کی ریاست قائم ہوئی تو ہر ایک کو اپنی بات کہنے کے پورے مواقع مہیا کر دیئے گئے۔ رسول کریمؐ کا ارشاد ہے کہ میری امت میں اختلاف باعث رحمت ہے۔ آزادیٔ فکر کے ہی اعجاز نے اسلامی تہذیب کو فروغ دینے کے لیے سازگار ماحول پیدا کیا۔ آنے والی کئی صدیوں تک چوٹی کے تمام سائنس دان

مسلمان تھے۔ وہ منطق، مابعد الطبیعات، علمِ کیمیا، الجبرا، فلکیات اور طبی علوم کے میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے۔ اسلام کے غلبہ سے قبل کئی صدیوں سے عالمِ عرب میں علوم کی ترویج کا عمل جمود کا شکار تھا۔ آٹھویں صدی میں فلسفے اور طبی علوم کی تمام اہم کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کیا جا چکا تھا۔ عربوں کے لیے اب یہ ممکن ہوا کہ ماضی کے ان علوم کی بنیاد پر پیش رفت ممکن بنا سکیں۔ آنے والی صدیوں میں مسلمان مفکرین نے اہلِ یورپ کے نظریات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ دسویں صدی تک قدیم یونان میں ہونے والا تمام علمی کام عربی زبان میں میسر تھا۔ مسلمانوں کے ثقافتی عروج کے زمانے میں ہی مسلم تاجر چیک، لیٹر آف کریڈٹ اور جائنٹ سٹاک کمپنیوں جیسے جدید تجارتی نظام مرتب کر چکے تھے۔

ابن سینا (1027-980ء) ابن رُشد (1126-98ء) اور الغزالی (وفات 1111ء) ان جید اسلامی فلسفیوں میں شامل ہیں جنہوں نے یورپی افکار پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ مغربی دنیا کے عظیم تر مفکرین میں شامل راجر بیکن (Roger Bacon) ابن سینا کو فلسفے کا شہزادہ اور سالارِ قافلہ کہتا ہے۔ بیکن نے تجرباتی سائنس اور ارسطو کے فلسفیانہ افکار سے آگاہی عرب دانش وروں کے ذریعے حاصل کی تھی۔ عرب افکار کو کلیدی یورپی نظریات میں شامل کرنے کا سہرا بیکن ہی کے سر ہے۔ گیارھویں صدی کے آخری حصے میں سائنسی علوم پر عربی تخلیقات کے لاطینی تراجم مسلم سپین، عراق اور سسلی سے یورپ پہنچنا شروع ہوئے۔ یورپ کی جن درس گاہوں نے اسلامی علوم کو یورپ کے دیگر علاقوں میں پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ان میں جنوبی فرانس کا سکول ماؤنٹ پیلیر (Arabist School at Montpellier) بھی شامل تھا۔ اس سکول سے فارغ التحصیل ہونے والے سکالرز یورپ کے تمام علاقوں میں پھیل گئے۔ نادرِ روزگار مسلمان فلسفی امام غزالی نے اسلامی دنیا اور یورپ کے مفکرین پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ قدیم یونانی فلسفیانہ افکار کو آگے بڑھایا خاص طور پر ارسطو کے افکار کی تفہیم نے

یورپ میں ویسے ہی اثرات مرتب کیے جیسے یورپی مفکرین تھامس ایکوائنس (Thomas Aquinas) اور سینٹ فرانسس (St. Francis of Assisi) کے علمی کام سے سامنے آئے تھے۔ ایکوائنس کے افکار کے زیرِ اثر ہی یورپ میں سوال اٹھانے کا رجحان بڑھا۔ اسی عمل نے اصلاحات کے راستے کھولے۔ مؤرخ ڈبلیو منٹگمری واٹ (W. Montgomery Watt) کے مطابق:

> "جب ہم عربوں کے تجربات، ان کی تحریروں اور ان کے افکار سے آگاہ ہوئے تو یہ احساس ہوا کہ اگر یورپ کے اہلِ علم کو ان افکار تک رسائی حاصل نہ ہوتی تو آج یورپ کی سائنس اور فلسفہ اس بلندی پر نہ پہنچتے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ عربوں نے محض یونانی افکار کو آگے منتقل کیا بلکہ وہ نئے افکار کے بھی نقیب تھے۔ انہوں نے نہ صرف ان علوم کو زندہ رکھا جو انہیں سکھائے گئے بلکہ انہیں وسعت بھی عطا کی۔ 1100ء کے لگ بھگ یورپی لوگوں کا دشمنوں سے پالا پڑا تو ان کے ہاں یہ علوم اپنے عروج پر تھے۔ اس سے پہلے کہ ان علوم کو اہل یورپ نئی بلندیوں سے روشناس کراتے، انہیں سب کچھ عربوں سے سیکھنا پڑا۔"

حصولِ علم سے مسلمانوں کی بے پناہ محبت کا اندازہ ان لائبریریوں سے لگایا جا سکتا ہے جو اسلامی شہروں بغداد، دمشق اور قرطبہ میں قائم تھیں۔ 1171ء میں جب عظیم جرنل صلاح الدین ایوبی بغداد میں داخل ہوا تو عوامی لائبریری میں ڈیڑھ لاکھ کتابیں موجود پائیں۔ قرطبہ کی الحکیم لائبریری میں چار سے چھ لاکھ کتب موجود تھیں۔ اس زمانے میں شاید ہی یورپ کی کسی یونیورسٹی کو کتابوں تک رسائی حاصل ہو۔ جارج میک ڈیسی (George Makdisi) اپنی کتاب "The Rise of Humanism in Classical Islam and the

"Christian West" میں لکھتا ہے کہ ہیومن ازم (انسانی مسائل اور ضروریات کا علم) کے حوالے سے جو علمی جواہر پارے اس وقت یورپی یونیورسٹیوں میں موجود ہیں، ان کا منبع عروج کا اسلامی زمانہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ آٹھویں صدی سے شروع ہونے والے اس دور میں اسلامی دنیا کے تعلیمی اداروں میں حصول علم کے لیے ماحول بہت اچھا تھا۔ اس دور میں اختلاف رائے اور استدلال کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ گیارھویں صدی کے اختتام تک مسلمانوں کے اکثر شہروں میں یونیورسٹیاں قائم ہو گئی تھیں۔

اقبالؔ کے نزدیک اسلامی فکر میں زوال کا عمل پانچ سو سال پہلے اس وقت شروع ہوا جب اجتہاد کے دروازے بند کر دیے گئے۔ قرآنی اصول مسلمانوں کے لیے دائمی حیثیت رکھتے ہیں۔ بدلتے وقت میں نئے علوم اور معلومات کی روشنی میں ان کی از سر نو تفہیم درکار ہوتی ہے۔ اپنے خطبہ ''تشکیل الٰہیات جدید'' (Reconstruction of Religious Thought in Islam) میں اقبالؔ نے اس جمود کی تین وجوہات بیان کی ہیں:

اول، دسویں صدی میں دو مکتبہ ہائے فکر، جدّت اور قدامت پسندوں کے درمیان قرآن کی دائمی حیثیت پر تنازع کھڑا ہو گیا۔ اس وقت کے عباسی حکمرانوں نے قدامت پسندوں کا ساتھ دیا۔ انہیں خوف تھا کہ منطق کی بنیاد پر تمام امور کو پرکھنے کی کھلی آزادی سے اسلامی بنیادوں پر استوار معاشرتی نظام کے تار و پود بکھر جائیں گے۔

دوسری وجہ راہبانہ تصوف کا ظہور تھا جو دراصل قدامت پرستانہ ضوابط پر استوار تھا۔ سنّی مکتبۂ فکر کے صوفی سخت گیر ظاہری اصولوں پر اصرار کے بجائے روحانی بالیدگی پر مصر تھے۔ اقبالؔ کے نزدیک ان کے افکار میں اسلامی سماج اور اس کی سیاست کو منظم کرنے کا عمل نظر انداز کر دیا گیا۔ اقبالؔ کو شکوہ ہے کہ اسلام کے بہترین دماغ تصوّف راغب ہوئے اور اس نظریے میں گم ہو گئے۔ عوام نے ابو حنیفہؒ اور مالک ابن انسؒ جیسے اہلِ علم کی تقلید شروع کر دی۔ اقبالؔ

کے نزدیک دنیا سے منہ موڑنا اسلام کی حقیقی تعلیمات کے منافی ہے، جس کو بعض صوفیا نے اختیار کیا۔ اقبالؔ کہتے ہیں۔

''دوسری اقوام کو اگر تم اپنے دین کی تعلیم دینا چاہتے ہو تو اپنی قوم کو یہ مت سکھاؤ کہ وہ دنیا سے بے زار رہے۔''

تیسری اور فیصلہ کن وجہ 1258ء میں منگولوں کے ہاتھوں اسلام کے فکری مرکز بغداد کی تباہی تھی۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو ہماری تاریخ مختلف ہوتی۔ منگولوں نے شہر اجاڑ دیے اور وسطی ایشیا، جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ میں کروڑوں مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔ دولت، تجارت اور علم و حکمت میں پوری اسلامی دنیا کے مرکز بغداد کی تباہی اسلام کے سنہری دور کے لیے مہلک وار ثابت ہوئی۔ مشہور لائبریریاں جلا دی گئیں ان کے ساتھ صدیوں کی ریاضت اور علمی خزانہ بھی خاک ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی تہذیب کے مکمل انہدام سے خوف زدہ ہو کر مسلمان اور بھی زیادہ قدامت پرستی کی طرف مائل ہو گئے۔ چودھویں صدی کے آغاز میں منگولوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے سخت گیر طرزِ حکمرانی نے علما سے اظہار رائے کی آزادی چھین لی۔ اجتہاد کے دروازے بند کر دیے گئے۔ یکسانیت زدہ اتحاد جو کہ غیر ضروری ہوتا ہے ہر بات پر مقدم ٹھہرا۔ اختلاف رائے کی حوصلہ شکنی دستور بن گئی اور غیر ملکیوں کو گاہے بے سبب بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ دوسروں کا مقاطعہ جب ہم کرتے ہیں تو غور و فکر کے دروازے آپ سے آپ بند ہو جاتے ہیں۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں، برصغیر کے مسلمانوں کو جب داخلی اور خارجی چیلنجوں سے واسطہ پڑا تو فکر مندی اور درد کی ایک بے کراں لہر اٹھی۔ سر سید احمد خان سے لے کر اقبالؔ تک تمام جدید مفکرین نے ایک ہی اصول پر زور دیا ''واپسی، قرآن کریم کی طرف واپسی اور پیش رفت اجتہاد کے ذریعے۔'' قرآن کی طرف واپسی کا مطلب تھا ان بنیادی اصولوں سے

وابستگی جو اللہ کی آخری کتاب میں ثبت ہیں اور ابدالآباد تک کے لیے مسلّم اور معتبر۔ اجتہاد سے پیش رفت کا مفہوم یہ کہ سچے اسلامی اصول قدیم قبائلی معاشرے کے بجائے نئے زمانے کی ضرورت کے مطابق ڈھال دیے جائیں۔ اقبال اس جمود اور زوال پر متفکر تھے، مسلمان معاشرے کی تخلیقی توانائیاں جس نے برباد کر دی تھیں چنانچہ وہ قرآن سے جڑے رہنے پر زور دیتے کہ اسلام کی حقیقی توانائی برقرار رہے۔ دوسری طرف اجتہاد پر بھی اسی قدر زور، جو ان کے بقول اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے پیش رفت کا جائز اور بنیادی اصول ہے۔ مسلمانوں کو یہ حق اللہ نے عطا کیا اور کسی کو اختیار نہیں کہ اسے منسوخ کرنے کی کوشش کرے۔

اقبال کے بقول اسلام کے مستقبل سے خوف زدہ قدامت پسند مفکرین نے بہت سختی کے ساتھ سماجی اور فقہی قوانین کی پاسداری کی، ان تصورات کے مطابق جو ابتدا سے چلے آئے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ امت کے مستقبل کا انحصار غور و فکر اور سوچ بچار کرنے والے افراد کی ذہنی توانائی پر ہے۔ سماج کو اگر فرد پر غیر معمولی برتری حاصل ہو جائے تو فرد کی کوئی حیثیت ہی باقی نہ رہے گی۔ ان کا خیال تھا کہ فرد اگر ماضی کا اسیر ہو کر رہ جائے تو زوال لازم ہے۔ انہوں نے کہا کہ صرف آزادیٔ اظہار ہی سے زوال آمادہ علمی ماحول کو روشن کر دینا ممکن ہے۔

مشرق کے بے مثال مفکر نے کہا کہ ابتدائی علم کے مکرم اصولوں کی سطحی توثیق، علمی زوال کا ہرگز کوئی علاج نہیں۔ خوف سے اوپر اٹھ کر سچا ادراک بروئے کار لانے کا عمل ہی شافی علاج ہے۔ صرف اسی صورت میں اسلام کی تفصیلی روح بروئے کار آ سکے گی۔ تقلید کی صدیوں میں ایک جامد ڈھانچہ وجود پا چکا۔ نتیجہ یہ کہ مسلم معاشرے کے علما کی قوت آفریں صلاحیت دب گئی۔ انہیں اسلام کی ابدی سادگی اور عالمگیریت کے مطابق آزادی اور مساوات کے اصولوں کو فروغ دینا ہوگا۔ استحکام اسی سے جنم لے گا اور بازیافت کا عمل بھی۔

اقبال اپنی کتاب ''تشکیل الٰہیات جدید'' کے چھٹے خطبے میں ارشاد کرتے ہیں، ''اجتہاد

کی ضرورت اس لیے ہے کہ دنیا بدل گئی ہے۔ عالم اسلام کو نئے چیلنجز درپیش ہیں۔ تمام جہات میں انسانی فکر نئے مرحلے طے کر چکی۔'' ایک ایسی بات انہوں نے کہی، جس کا تعلق ہم سے بہت گہرا اور جس کی اہمیت بہت ہے۔ اقبال نے کہا: ''روشن خیال مسلمانوں کی نئی نسل کا یہ دعویٰ کہ اپنے تجربے کی روشنی میں بنیادی قوانین کی از سرِ نو تعبیر ان کا حق ہے۔ ان کا یہ مطالبہ، کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے فقہی ضابطے نئے سانچوں میں ڈھالنا ضروری ہے، بالکل جائز ہے۔ قرآن کی یہ تعلیم کہ زندگی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، تقاضا کرتی ہے کہ ہر نئی نسل کو پرانی نسل کے کام پر نظرِ ثانی کا پورا حق حاصل ہو۔'' انہوں نے لکھا ''علم کی ہر جستجو عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔''

مغرب کی سائنسی ترقی کو مسترد کرنے کی بجائے اس کے اچھے پہلوؤں کو ہمیں زندگی میں سمو لینا چاہیے۔ اجتہاد کی بجائے ہم نے پاکستان کو جمود کا شکار رہنے دیا، روز اوّل ہی سے۔ برطانوی استعمار کی وارث مغرب نواز اشرافیہ کو، اسلامی اصولوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ سائنسی ترقی سے۔ وہ طاقت کے بھوکے تھے اسی لیے انہوں نے جمہوریت کو پھلنے پھولنے کے مواقع عطا نہ کیے۔ ہمارے قدامت پسند مولوی صاحبان ردعمل کا شکار رہے۔ مذہب کے باب میں قدامت پسندی کے روّیے پر وہ ڈٹے رہے۔ اسلام کے بعض مسخ شدہ تصورات کو انہوں نے سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا۔

اقبال نے زور دے کر کہا تھا ''اجتہاد اس لیے کہ شرعی قوانین کو جدید فکر اور تجربات کی روشنی میں از سرِ نو مدوّن کیا جائے۔'' ان کا کہنا تھا کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ نے ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں اور صلیبی جنگوں سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔ اسی طرح مذہبی افکار کی تعمیر نو میں مغرب کے تجربے سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اقبال کی ہی طرح انیسویں صدی کے مصری سکالر محمد عبدہ نے بھی اس امر کی نشان دہی

کی کہ تقلید اور ماضی کے معروف مسلم دانش وروں کی پیروی عالمِ اسلام کے زوال کا اصل سبب بنی۔ افسوس کہ یہ روش آج بھی جاری ہے۔ ترک اقتدار نے اپنی رعایا میں غلامانہ اندازِ فکر کی پرورش کی، دلیل اور بحث کی حوصلہ شکنی کی۔ علم ان کا حریف تھا کہ اگر لوگ اس کے خوگر ہوتے تو حکمرانوں کے طرز عمل پہ سوال اٹھاتے۔ علما میں اپنے کارندے انہوں نے داخل کر دیے۔ مذہبی افکار میں جمود کی قبولیت پر انہوں نے زور دیا کہ سیاسی اشرافیہ کا اقتدار قائم رہ سکے۔ شمال مغرب میں ترکوں کے بعد یہ غزنوی، غوری اور مغل تھے جنہوں نے دسویں صدی کے وسط سے جنوبی ایشیا برصغیر میں مسلم اقتدار کی بنیاد رکھی۔

مغلوں کے بعد اس سرزمین پر انگریزی اقتدار قائم ہوا۔ اس اجنبی تہذیب نے بھی ایک طرح سے بنیاد پرستی کے فروغ میں بالواسطہ بہت اہم کردار ادا کیا۔ مسلمانوں کو اس خوف نے آلیا کہ مغربی تہذیب اسلامی ثقافت پر غلبہ نہ پالے۔ ایک ہزار برس پہلے یورپ بھی انہی اندیشوں سے گزرا تھا، جب عالم اسلام کو فوقیت تھی۔ بنیاد پرستی، استعمار کا ردعمل تھی۔ خاص طور پر ان مسلمانوں میں جن کے نزدیک مذہب اور ثقافت ایک ہی چیز تھے۔ مغرب سے پیدا ہونے والے چیلنج کے جواب میں، جسے جدیدیت کا ہم معنی سمجھا گیا، عالم اسلام میں بالعموم دو طرح کے ردعمل ابھرے۔ ایک یہ کہ مغرب کو خود اس کے میدان میں شکست دی جائے۔ مشرق کے مسائل حل کرنے کے لیے مغرب کے ہتھیار برتے جائیں اور مذہب کو ذاتی زندگی تک محدود کر دیا جائے۔ مشرق وسطیٰ میں بیسویں صدی کے اندر اُٹھنے والی سوشلزم اور قوم پرستی کی تحاریک یورپی استعمار کے مقابل اسی طرز فکر کی پیداوار تھیں۔ دوسرے مکتبۂ فکر نے ماضی مرحوم کے مقبول اور مسلمہ انداز کی طرف لوٹ جانے کی پرجوش وکالت کی۔ قبائلی زندگی کا وہ زمانہ جب اسلام ایک صحرا سے اٹھا تھا۔ اس خالص دین کی طرف مراجعت جو بعد ازاں اپنے فروغ میں مختلف اور متنوع ثقافتوں کو اپنے اندر سمونے میں کامیاب رہا۔ برطانوی ہند میں ایک دوسرے کے حریف یہ دونوں تناظر 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ابھر کر سامنے آئے۔ جب آخری مغل بادشاہ

نہایت ہی توہین آمیز طور پر اقتدار سے الگ کر دیا گیا اور جلا وطن کر کے ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔ ولیم ڈالرمپل (William Dalrymple) کی کتاب ''آخری مغل'' دو مختلف تعلیمی مکاتب فکر کے تذکرے پر تمام ہوتی ہے۔ ایک علی گڑھ محمڈن اینگلو انڈین کالج (Aligarh Mohamedan Anglo-Oriental College) جو انگریز سے متاثر سر سید احمد خان نے قائم کیا جنہوں نے چاہا کہ مغربی تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کا مستقبل محفوظ کیا جا سکے۔ دوسرا دیوبند کا مدرسہ جو مغربیت کے تمام تر اطوار کو مسترد کرتا ہے۔ دوسری طرف آج بھی یہ بریلوی مکتب فکر کا مدمقابل ہے، جس کی اکثر تعلیمات تصوف سے اکتساب کرتی ہیں۔ ڈالرمپل کا کہنا یہ ہے کہ طالبان پاکستان اور افغانستان کے دیوبندی مدارس سے ابھرے۔

خود اپنے زمانے میں اپنی آنکھوں سے ہم نے دیکھا ہے کہ کوئی چیز اسلام کی اصل حقیقت اور ترقی پسند انداز کے لیے اس سے زیادہ خطرناک نہیں جتنی کہ مغرب کی یلغار۔ ردعمل یہ ہوتا ہے کہ عام مسلمان انتہا پسندی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ بنیاد پرستی اور استعماری جارحیت میں اکثر چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ بہت قریب کا، خطرناک، ایسا تعلق گویا ایک ہی تصویر کے دو رُخ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وسیع تر تناظر میں سوچنے والے جدید مسلمان مفکرین کا مطالعہ کریں جو پاکستان کے بانی تھے اس لیے کہ پاکستانی کو ایک علمی، ثقافتی اور اخلاقی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت ہے۔ ایسا معاشرہ ہمیں مطلوب ہے جو تعلیم یافتہ، مہذب، روادار اور دور اندیش ہو، اپنے عہد کے تقاضوں کا پوری طرح ادراک رکھنے والا۔ عصر رواں کے مسائل کا سامنا کرنے کے لیے ہمیں غور وفکر اور جدید دانش کی ضرورت ہے۔ اسلامی تعلیمات کی پابندی لیکن مغرب کے مثبت پہلوؤں سے خوش دلی سے استفادہ...... آخر مغرب میں ہر چیز بری تو نہیں۔ مطلوب نشاۃ ثانیہ کو مغربی مادہ پرستی سے نجات کا حل پیش کرنا چاہیے۔ وہ مادہ پرستی جس نے انسان کو محض صارف بنا دیا ہے۔ ہمارے حکمران طبقات نے جس کے سامنے ہتھیار ڈال

دیئے ہیں حالانکہ ملک کسی طرح بھی اس کا متحمل نہیں۔ اقبآل اور دوسرے جدید مسلمان مفکرین اس حوالے سے بہت فکر مند رہے کہ مسلمان معاشروں میں بہت سے لوگ مغرب کے مثبت پہلوؤں کو ملحوظ رکھنے پر آمادہ نہیں۔ خاص طور پر وہ مولوی صاحبان جو ذہنی طور پر قدیم زمانوں میں زندہ ہیں۔ اس چھوٹے سے حکمران طبقے اور قدامت پسندی پر مبنی معمولی ذہنوں کے اتحاد نے بدلتی دنیا کے ساتھ علمی رفاقت کو مشکل بنا دیا۔ تخلیقی طرز فکر سے اسلام ایک تحریک بن کر اٹھتا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عام اسلام میں اجتہاد سے بیگانگی ہے، جمہوریت اور آزادی افکار پہ پابندی اور تعلیم و تحقیق اور علوم کے نئے آفاق کی تلاش ہرگز کوئی ترجیح نہیں۔ نشاۃ ثانیہ کی اگر کوئی امید ہے تو مغرب کے ان مسلمان مفکرین سے جو ظالم حکمرانوں کے خوف کا شکار نہیں۔ وہ قدامت پسند مولوی صاحبان کی مانند نہیں جن میں سے بعض خود کو دین کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں۔ علوم کے تمام میدانوں میں مغرب ہم سے بہت آگے نکل چکا۔ عالم اسلام نے گویا ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ مغرب سے جو کچھ اسے مل جاتا ہے، اسی پر قناعت۔ اقبآل نے مسلمانوں سے مطالبہ کیا کہ قرآن کریم اور اسلامی قوانین کی تشریح کے لیے کھلے ذہن کے ساتھ سوچ بچار کریں تا کہ وہ بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوسکیں۔ وہ تقلید پرست علما کے خلاف تھے جو عصر حاضر میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے اور ماضی سے چمٹے رہتے ہیں۔ وہ سائنس، فنون اور تازہ فکر کی مزاحمت سے نالاں تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ وہ علما اور مذہبی دانش وروں کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کریں جہاں وہ علوم کے جدید ہتھیاروں سے لیس ہوسکیں۔ ان کا ایمان تھا کہ جدید ایجادات کو غیر اسلامی قرار دے کر مسترد کرنے کی بجائے تکنیکی اور سائنسی آلات کو مغربی اقدار اور ثقافت کے سامنے سجدہ ریز ہوئے بغیر برتا جائے۔ ان کے ایک شعر میں یاد دہانی ہے کہ مغرب کی نقالی نہ کی جائے بلکہ فکر کی نئی اسلامی بنیادوں سے ایک نیا جہاں تعمیر کرنے کی کوشش کی جائے۔ ؎

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

اقبآل کے انقلابی افکار کا ادراک کرنے کے لیے ہمیں ایسے تازہ دماغوں کی ضرورت ہے جو معاشرے اور حکومت کی تشکیل کے اخلاقی اور مقامی تقاضوں کو ملحوظ رکھیں اور مغربی جمہوریت سے استفادہ کی راہ بھی ہموار کریں۔ مقامی حکومت کے قدیم اداروں کی اہمیت پر مجھے اصرار ہے، برصغیر کے دیہات جن میں صدیوں خود کفیل رہے۔ اپنے تعلیمی ادارے اور انجمنیں وہ اپنے آپ ہی چلاتے تھے۔ صحت اور انصاف کا وہ اپنے خود کار نظام رکھتے تھے۔ جھگڑے چکانے کے لیے پنچایت اور جرگہ۔ اس طرح نچلی سطح تک لوگوں کی اکثریت شریک ہو جاتی ہے۔ صرف اسی طرح ہم جاگیردارانہ جبر سے نجات پا سکتے ہیں۔

مغرب سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ خاص طور پر اس کے مضبوط اداروں سے علم کی پیاس اور آزادیٔ اظہار کے تحفظ کی بے تاب خواہش سے۔ میرا احساس یہ بھی ہے کہ ہمیں اس آزادی کا بغور جائزہ لینا چاہیے جو جمہوریت نے مغرب کو بخشی ہے۔ پاکستان سمیت ان مسلم ممالک کے برعکس جہاں جعلی جمہوریت کارفرما ہے، ظلم اور ناانصافی کے خلاف لوگ فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو ایک فرد کے حق کو بھی اکثریت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مشرق کے برعکس جہاں اجتماع کا حق فرد پہ بہر حال فائق رہتا ہے۔

پاکستان کو ہم نے ایسا ملک بنا دیا کہ اگر قائداعظم یا اقبآل لوٹ کر آئیں تو پہچان ہی نہ پائیں۔ اقتصادی طور پر دولت اور اقتدار کی بھوکی اشرافیہ کے چنگل میں چیختا ہوا، یہ عالم اسلام کی واحد ایٹمی طاقت ہے لیکن ہر روز اس کے بے گناہ شہری امریکی بم باری کا نشانہ بنتے ہیں۔ پاکستانی ان چار اقوام میں سے ایک ہیں جہاں ابھی تک پولیو پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ ایک کے بعد دوسرا فوجی حکمران اور بدعنوان سول حکمران ہے۔ منتخب حکومتیں صحت اور تعلیم کی سہولتیں فراہم

کرنے کی کوئی پروانہیں کرتیں۔ یہ ملک حالانکہ انہی کے نام پر اور انہی کے لیے بنا تھا۔ ایک ریاست کے طور پر پاکستان ناکام تو نہیں مگر یہ طرزِ عمل ناکامی کا راستہ نہیں تو اور کیا ہے۔

اسلام مسلمانوں سے اعتدال کی راہ پر چلنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ شائستہ اور تنگ راستہ جو دو انتہاؤں کے درمیان ہوتا ہے۔ صرف باخبر رائے عامہ ہی اسے درست کرسکتی ہے اور باخبر رائے عامہ کے لیے باخبر علما کی ضرورت ہے۔

1960ء کے عشرے میں ایک روشن دماغ پاکستانی سکالر ڈاکٹر فضل الرحمٰن امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی میں پڑھایا کرتے۔ صدر ایوب خان نے انہیں پاکستان مدعو کیا کہ اسلامی تحقیق کا ایک ادارہ قائم کریں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن ملک کے بہترین دماغوں کو یکجا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، تاکہ تاریخی تناظر میں مطالعہ قرآن کے لیے اس کی آیات کو غلط معانی نہ پہنائے جاسکیں۔ ان کا احساس یہ تھا کہ بعض علما اپنے مفادات کے لیے ناقص تعبیر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سیاق و سباق سے ہٹ کر وہ بعض آیات کا حوالہ دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے قدامت پسند علما سے ان کا ٹکراؤ ہوا۔ نہ صرف تحریک چلا کر انہیں ملک سے نکال باہر کیا گیا بلکہ وہ ایوب خان کے زوال کا باعث بھی بن گئے۔

مغرب کے مقابلے میں اسلامی معاشرے کا بنیادی فرق معاشرتی اخلاق کے دائرے میں جھلکتا ہے۔ یہ ہمارے خاندانی نظام کو وہ تحفظ عطا کرتا ہے جو اس معاشرے کی سب سے بڑی قوت ہے۔ بدکاری سب سے زیادہ مطعون ہے، تمام مذاہب میں سب سے بڑا گناہ۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اپنے ساتھی کو وہ دھوکا دے سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو کبھی نہیں۔ اسلام ایک ایسا پاکیزہ معاشرہ قائم کرنے میں مدد دیتا ہے جہاں گناہ کی ترغیب باقی نہ رہے۔ مزید برآں اس طرح یہ متاثر ہونے والے کم عمروں کو بداخلاقی سے بچا لیتا ہے۔ اسلام میں خاندان کی ذمہ داری بہت بنیادی ہے۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ کا ارشاد ہے ''تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو

اپنے خاندان کے ساتھ سب سے بہتر سلوک کرے اور میں تم میں سے، اپنے گھرانے کے ساتھ سب سے زیادہ حسن سلوک کرنے والا ہوں۔'' آج کروڑوں پاکستانی مرد اور عورتیں بھاری بوجھ تلے سسک رہے ہیں بہت مشکل سے اپنے خاندانوں کی ضروریات وہ پوری کر پاتے ہیں، اسی لیے یہ معاشرہ جمود کا شکار ہے۔ تباہ کن غربت اور ناانصافی کے باوجود ملک جس میں مبتلا ہے، معاشرے کا سماجی پیرہن اس لیے محفوظ ہے کہ گھرانوں کیلئے ایثار کرنے والے موجود ہیں۔ ایسے بہت سے لوگوں کو میں جانتا ہوں جو اپنے وسیع و عریض خاندانوں کی خاطر سب وسائل یکجا کرتے ہیں۔ عدم تحفظ کے اس ماحول میں، جہاں مفلس کے لیے سرکاری امداد کا کوئی اہتمام نہیں، ملک کو اسی ایک چیز نے بچا رکھا ہے، ورنہ خون خرابا شروع ہوگیا ہوتا۔

اس خاندانی نظام کا تحفظ کرنے کے باوصف ایک سچا اسلامی معاشرہ مغرب کی فلاحی ریاست سے مختلف نہیں۔ انسانی حقوق، قرآن کریم کا بنیادی موضوع ہیں۔ زندہ رہنا، انصاف حاصل کرنا، آزادیٔ اظہار، آدمیت کی توقیر، سفر اور اظہار کی آزادی اور توہین سے تحفظ، رہائش کے لیے ایک گھر، یہ سب حقوق قرآن کریم نے ہمیں عطا کیے ہیں۔ اسلام ایک سیکولر معاشرے کی سب آزادیاں عطا کرتا ہے لیکن وہ سیکولر نہیں۔ سیکولرازم کو سمجھنے کے لیے یورپ میں عیسائیت کے ارتقا کا ادراک لازم ہے۔ ریاست اور چرچ کی اپنی حدود تھیں۔ آنے والی صدیوں میں ان مختلف تحریکوں اور افکار نے سیکولرازم کی وہ صورت گری کی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ اسلام میں مگر مذہب اور ریاست کو الگ کرنا ممکن نہیں کہ اسلام میں چرچ اور پاپائیت کا وجود ہی نہیں۔

جیسا کہ اقبالؔ نے کہا ''آغازِ کار سے اسلام ایک متمدن معاشرہ تھا جسے قرآن نے چند سادہ اور سچے اصولوں پر استوار کیا تھا۔ ان اصولوں کی بنیاد پر، بدلتے ادوار میں قوانین میں توسیع اور ترقی کے بے پناہ امکانات موجود رہتے ہیں۔'' اپنے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ اسلام میں دین اور سیاست الگ نہیں۔ وہ متنبہ کرتے ہیں کہ حکومت

اگر ان اخلاقی اصولوں کو خیر باد کہہ دے جن کی بنیاد مذہب ہے تو سفاک مادیت لازماً اُس کی جگہ لے گی۔ موہن داس کرم چند گاندھی نے یہی بات کہی تھی ''جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، وہ جانتے ہی نہیں کہ مذہب ہے کیا۔'' اپنے وقت کی دو ظالم ترین حکومتیں نازی جرمن اور سوویت یونین مذہب دشمن تھیں۔

اسلام کی جڑیں روحانیت یعنی زندگی اور کائنات کی بنیادی سچائیوں کے ادراک میں ہیں۔ سرمایہ دار نظام کی مادیت یعنی فقط اس فانی دنیا کی محبت میں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام عملی زندگی کے تقاضوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کے برعکس وہ کاروبار حیات میں سرگرمی اور تحرک کی حوصلہ افزائی کرتا ہے مگر سرمایہ دارانہ انداز میں نہیں۔ مثال کے طور پر ایک سچے اسلامی معاشرے کے لیے لازم ہوگا کہ وہ ماحول کو آلودگی سے پاک رکھے۔ موجودہ اور آئندہ نسلوں کی حفاظت، اکتسابِ زر سے زیادہ اہم ہوگی۔ حقیقی روحانیت، ہر ایسی تحریک کی حمایت کرے گی جو معاشرے کو لالچ کی بلا سے پاک رکھنے کی کوشش کرے۔ قرآن کریم کا دوسرا نام فرقان بھی ہے۔ امتیاز کرنے والا، جھوٹ اور سچ کو الگ کر دینے والا۔ وہ انسانوں کو برائی اور بھلائی میں امتیاز کرنا سکھاتا ہے۔

''دہشت گردی کی جنگ'' شروع ہوئی تو مذہبی جنونیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ سوات کی بغاوت میں ہم نے دیکھا کہ جو لوگ نظام کا حصہ نہیں وہ جرم اور جنون کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ رومان پسند اور خواب پرست کس طرح گمراہ ہو کر اسلحہ اٹھانے پر تل جاتے ہیں۔ ایسے مذہبی جنونی ان کے علاوہ ہیں جو جبر کی بنا پر اپنے جامد مذہبی تصورات کو اندھی قوت سے نافذ کر ڈالنے کے آرزو مند ہیں۔ اسلام کو انہوں نے بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ اسلام قلوب و اذہان کو جیت لینے کا نام ہے۔ کچھ دوسرے ہیں جنہوں نے فرقہ پرستی کے جنون میں مبتلا ہو کر اپنے مسلمان بھائیوں کو قتل کیا۔ یہ بنیاد پرست صرف مغرب کے

دشمن نہیں بلکہ مغرب نواز اشرافیہ کے خلاف بھی ہیں کہ اسے مغرب کا ایجنٹ سمجھتے ہیں۔ پاکستانی عوام مغرب کی عظیم سائنسی ترقی سے متاثر اور سائنس کے فروغ کو پسند کرتے ہیں۔ اس کے اخلاقی نظام کا تصور مگر زیادہ تر ٹیلی ویژن پہ انحصار کرتا ہے۔ اس پر جو کچھ وہ دیکھتے ہیں، اسے قطعاً پسند نہیں کرتے۔ اپنے معاشرے کو مغربی رنگ میں دکھانے، خاص طور پر خواتین کی آزادی کے مصنوعی تصور کی وہ مزاحمت کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس اندازِ فکر کا مقصد خواتین کی دست گیری ہے بلکہ وہ اسے کھلی جنسی آزادی کا لائسنس سمجھتے ہیں۔ پاکستان کے مغرب نواز اخلاقی اعتبار سے کمزور گردانے جاتے ہیں۔ عام لوگ ان کے بارے میں اکبر الٰہ آبادی کی زبان میں یہ کہتے ہیں: ؎

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
اسے غیرت نہیں آتی، انہیں غصہ نہیں آتا

جدیدیت کی اس لیے مخالفت کی جاتی ہے کہ اسے مغربیت مانا جاتا ہے۔ اسی لیے پاکستانی عوام خواتین سے متعلق این جی اوز کے خلاف ہیں۔ پاکستانی معاشرے کے مختلف طبقات میں فاصلہ اب اتنا زیادہ ہے کہ دوسری انتہا کے لوگوں کو ''لبرل جنونی'' کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک عہدِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کا مطلب ہے، پوری طرح مغرب زدہ ہو جانا۔ ان کے خیال میں اسلام ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسلام سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر، مذہب کو وہ مغرب کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عام مسلمانوں کا اندازِ فکر عہدِ قدیم میں زندہ رہنے والے کند ذہنوں کا مسلک ہے جو ایک قدیم صحرا میں پھوٹا تھا۔ افسوس کہ مذہبی جنونیوں سے وہ یہ بات کرنے کے قابل ہی نہیں کہ دین کا مطالعہ تو وہ کرتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک پاکستان کے مسائل کا حل باہر سے درآمد کیا جانا چاہیے۔ یہ لوگ کبھی مارکسزم کی وکالت کرتے ہیں، بعض عورتوں کی مکمل آزادی اور کچھ دوسرے

مغرب کی پیروی میں اس آزاد معیشت کی، جس میں مارکیٹ فیصلہ کن ہوتی ہے۔

ان لوگوں کو پچھلی دو صدیوں کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ انہیں پتہ چلے کہ جب بھی کسی سرزمین پر اجنبی ثقافت مسلط کرنے کی کوشش ہوئی تو کیسی بربادی اس نے پھیلا دی۔ کیسے کیسے ہنگامے برپا ہوئے اور صدیوں سے شاداب چلی آتی زندگی کیسی ویرانی سے دوچار ہوئی۔ آسٹریلیا سے لے کر امریکہ تک تمام قدیم باشندے قتل کر دیئے گئے۔ افریقہ اور ایشیا میں مقامی لوگ اکثر دو حصوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔

چین اور جاپان ایسے کامیاب معاشروں نے مغرب کے علوم سے فیض پایا مگر اپنی مقامی ثقافتوں کی حفاظت کی۔ پاکستان کے لبرل فاشسٹ، سیکولرازم کی وکالت تو کرتے ہیں لیکن مغرب میں سیکولرازم کے ارتقا پر وہ غور نہیں کرتے۔ مارٹن لوتھر کنگ کی تحریک چرچ کے جبر سے نجات حاصل کرنے کی تحریک تھی، مذہب کو خیرباد کہنے کی قطعاً نہیں۔ ہمارے مغرب نواز ایک ایسے معاشرے پر سیکولرازم مسلط کرنے کے آرزومند ہیں، جہاں عوام کی عظیم اکثریت مذہبی اعتقاد کی حامل ہے۔ ان کے پاس مسائل کا صرف ایک حل ہے: ہٹلر کا طریق کار۔ پاکستانی فوج مذہبی بنیاد پرستوں کا صفایا کر دے۔ انہیں مصر، الجزائر اور ایران کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ جب بھی جبر کے ذریعے بنیاد پرستی کا خاتمہ کرنے کی کوشش ہوئی، تشدد پھوٹ پڑا اور معاشرے کو اس نے منہدم کر کے رکھ دیا۔ دہشت گردی کی جنگ نے دونوں طبقات کو مزید تقسیم کر دیا ہے اور وہ ایک دوسرے کی توہین کے درپے ہیں۔ اگر مغربی تعلیم یافتہ لوگ اسلام کا مطالعہ کریں تو نہ صرف وہ اس کی حرکی روح سے آشنا ہو جائیں بلکہ فرقہ پرستی اور انتہا پسندی کا مقابلہ بھی کر سکیں۔ وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ مغرب کو اسلامی عقائد اور تصورات کی حقیقت سے روشناس کرا سکیں۔ وہ لوگ جو اسلام کا دفاع کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن اگر وہ مغرب کی نگاہ سے نظریات اور حالات کا جائزہ لیں تو حقیقت کا ادراک کریں گے۔ ان

دونوں طبقات کے تصادم کا افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ مذہب اور ثقافت کے تحفظ ہی نہیں، اجتہاد اور ارتقا کا راستہ بھی رک گیا۔ اشرافیہ جو ملک کے بیشتر تعلیمی وسائل ہڑپ کر جاتی ہے، علمی قیادت کے قابل نہیں، نہ تو مذہب اور نہ ہی ثقافت کے میدان میں۔ مغربی تعلیم اسے یہ صلاحیت اور اہلیت عطا نہیں کر سکتی۔

عام آدمی ملک میں اسلام کے کردار پر کسی مغالطے کا شکار نہیں۔ اسلامی ورثے پر وہ مطمئن ہے اور اس کے ساتھ شادکام۔ شناخت کا بحران انگریزی بولنے والی اشرافیہ کو درپیش ہے، جو استعمار کی وارث ہے۔ مذہب کا بہت معمولی سا علم رکھنے والے سیکولر یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک ہوتا ہے۔ قائداعظم کی ایک تقریر کا وہ بہت زیادہ ذکر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سیکولر نظام کے خواہاں تھے۔ صرف اسی طرح اقلیت کا تحفظ ممکن ہے۔ حالانکہ وہ تو فقط رواداری کا حوالہ دے رہے تھے جو اسلامی معاشرہ، غیر مسلم سے لازماً روا رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا ”آپ آزاد ہیں، آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ اپنی مساجد میں جانے کی آزادی رکھتے ہیں، یا اس آزاد پاکستان کی کسی بھی عبادت گاہ میں، خواہ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، نسل یا ذات سے ہو۔ ریاست کا اس معاملے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔“

اسلام اور دو قومی نظریہ پاکستان کی بنیاد ہے۔ اسی ایک نظریے نے اس خطہ ارض کو بھارت اور پاکستان میں تقسیم کر ڈالا۔ یہ تو واضح ہے کہ مذہبی عقائد کو تعصب، عدم رواداری اور فرقہ پرستی کو فروغ دینے کے لیے استعمال نہ ہونا چاہیے۔ بدقسمتی سے مذہبی طبقات میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو دوسرے فرقوں اور اقلیتوں سے نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اپنے موقف کی حمایت میں قرآن کریم کی آیات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے وہ پیش کرتے ہیں۔ اس سچائی کو وہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دوسرے مذاہب کے معاملے میں کس قدر

روادار تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی مسجد میں انہوں نے کئی بار عیسائیوں اور یہودیوں کو عبادت کرنے کی اجازت بخشی۔

آپ کا آخری خطبہ، حقوق انسانی کے باب میں ایک درخشاں دستاویز ہے۔ فرمایا:

''تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے پیدا کیے گئے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر ہرگز کوئی فضیلت نہیں۔ نہ ہی گورے کو کالے اور کالے کو گورے پر۔ اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو صاحب تقویٰ ہے۔

سب مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔ تم سب ایک دوسرے کے بھائی ہو...... اور تمہارے غلام! انہیں وہی کچھ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو۔ انہیں وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ اگر وہ خطا کا ارتکاب کریں اور تم انہیں معاف کرنے پر آمادہ نہ ہو، تو احسن طریق سے انہیں الگ کر دو۔ وہ اللہ کی مخلوق ہیں اور بہتر سلوک کے حق دار۔''

آشکار ہے کہ مذہب، نسل یا طبقے کی بنیاد پر امتیازی سلوک سے منع کرتا ہے۔ واضح الفاظ میں قرآن یہ کہتا ہے۔ ''لا اکراہ فی الدین'' دین میں ہرگز کوئی جبر نہیں۔ (آیت 2:256)۔

اسلام میں تو اس سے بھی زیادہ فراخ دلی ہے۔ وہ دوسرے مذاہب کو تسلیم کرتا ہے۔

جیسا کہ ممتاز سکالر کیرن آرم سٹرانگ (Karen Armstrong) نے نشاندہی کر دی۔ انہوں نے لکھا ہے ''قرآن کریم دوسری اقوام اور دوسری قوموں کی مذہبی روایات کے بارے میں ایک مثبت نقطۂ نگاہ کا حامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر قوم تک الہامی ہدایت پہنچی ہے۔'' وہ قرون وسطیٰ کے اس مغربی اعتقاد کی مذمت کرتی ہیں، کہ اسلام عدم رواداری کا شکار ہے۔ ان کی رائے میں آج مسلمان دنیا کی انتہا پسندی کا سبب سیاسی مسائل ہیں۔ تیل، فلسطین، مسلم ممالک پر قبضہ، مشرق وسطیٰ میں آمروں کی پشت پناہی اور مغرب کی منافقانہ روش۔ مذہبی عقائد نہیں، ہرگز نہیں۔

صدیوں تک مسلمان معاشروں میں غیر مسلموں کا ایک بھرپور کردار رہا مثلاً مسلمان مغل بادشاہوں کے بھارت میں راجپوتوں کا، یہودی اور مسلم سپین میں عیسائیوں اور یہودیوں کا، ترکوں کی عثمانی سلطنت میں قدامت پسند مسیحی یونانیوں کا۔ ان ادوار میں مسلمانوں نے غیر مسلموں سے حسن سلوک کا جو مظاہرہ کیا، قرون وسطیٰ کے مغرب میں اس کا تصور تک موجود نہ تھا۔ اس کے باوجود یورپ میں اسلام کو ایک ایسے دین کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو دوسرے مذاہب کے مقابلے میں جارحیت کا قائل ہے۔ اگر کوئی مسلمان تشدد کو ایک حربے کے طور پر برتنے کی کوشش کرے تو قرآن کریم، احادیث رسول اور سنّت سے اس کی توثیق ممکن نہیں۔ قرآن کریم بالکل واضح الفاظ میں عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانے اور بے گناہوں کے قتل سے روکتا ہے۔ مؤرخ اور صحافی پال جونسن (Paul Johnson) کے مطابق بیسویں صدی میں 15 کروڑ افراد ریاستی مظالم کے نتیجے میں قتل ہوئے۔ قتل عام کے ان واقعات میں مسلمان ملکوں کا حصہ برائے نام ہے، تاریخ جن کی نظیر پیش نہیں کرتی۔ ہٹلر ایک رومن کیتھولک عیسائی کے طور پر پیدا ہوا اور پروان چڑھا۔ خاندانی اعتبار سے سٹالن بھی عیسائی تھا، ان دونوں کے جرائم پر مسیحیت کو ذمہ دار ٹھہرانا اگر حماقت ہے تو کسی مسلمان کے غیر انسانی رویے کی بنا پر اسلام کو کیسے ذمہ دار قرار دیا جائے گا؟

یکم جولائی 1948ء کو سٹیٹ بینک آف پاکستان کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے، ملک کے معاشی ماہرین سے قائداعظم کا خطاب ایک نکتے کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے ''اسلام کے معاشی اصول آج بھی اتنے ہی قابل عمل ہیں، جتنے کہ 1400 سال قبل تھے، انہوں نے کہا ''اسلام اور اس کے مثالی نظریات نے جمہوریت کی تعلیم دی، اس نے مساوات کا درس دیا، ہر ایک کے لیے انصاف اور مساوی مواقع، کوئی جمہوریت، مساوات، عدل اور حسن کردار کے ان اعلیٰ تقاضوں سے کیوں پریشان ہو، جو ہر ایک کو میسر ہوں گے۔'' یہ نظریات اقبالؒ کی روحانی

جمہوریت سے ہم آہنگ ہیں۔ جس میں لوگ ہر طرح کے جبر سے آزاد ہوں گے اور جہاں کوئی ایسی پالیسی تشکیل نہیں دی جا سکے گی جس کا مقصد انسانی فلاح سے کسی طرح بھی متصادم ہو۔

میرا یقین یہ ہے کہ پاکستان نے اپنی منزل اس لیے کھو دی کہ اسلامی تعلیمات پر سنجیدگی سے عمل کرنے کی کبھی کوشش نہ ہوئی۔ آخری الہامی کتاب میں لکھا ہے ”اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔“ قرآن کریم، تعلیم اور انصاف پہ بہت زور دیتا ہے۔ ان میدانوں میں اسلامی جمہوریہ پاکستان ناکامی کی ایک المناک تصویر ہے۔ ان میں سے ایک میں نامرادی، دوسرے میں تباہی کا سبب بنتی ہے۔ ہمارا نظام تعلیم ناانصافی پہ استوار ہے۔ ہمارا انصاف سے محروم معاشرہ عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کی اہمیت تسلیم نہیں کرتا۔ اسلامی ریاست کا بنیادی اصول انصاف ہے۔ اسی لیے اپنی جماعت کا نام میں نے تحریک انصاف رکھا۔ قرآن کہتا ہے ”اے اہل ایمان! انصاف کے لیے ڈٹ کر کھڑے ہو جاؤ، اللہ کے گواہ بن کر، خواہ تمہیں اپنے یا اپنے والدین کے خلاف ہی شہادت کیوں نہ دینی پڑے، خواہ رشتہ داروں کے بارے، امیر ہو یا غریب“ (آیت 2:135)

انصاف پسندی اور صداقت شعاری، مذہبی آدمی کا سب سے بڑا وصف تھا۔ قانون کے سامنے سب برابر تھے۔ رسالت مآب ﷺ اس انقلابی تصور کے ساتھ ہی بروئے کار آئے تھے۔ ان سے پہلے تو نسل، رنگ اور زبان کے امتیاز سے پاک انصاف کا تصور تک کہیں موجود نہ تھا۔ قائداعظم اور اقبالؔ کا یہی نقطہ نظر تھا۔ یہی خواب انہوں نے دیکھا تھا کہ اس نئے وطن میں رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر سب شہری ایک امن، آہنگ اور عدل میں جئیں گے۔ استحصال اور ظلم سے پاک ایک معاشرہ۔ مگر آج پاکستان ایک منقسم ملک ہے۔ مضبوط مرکز کے تصور نے سندھیوں، بلوچوں، کشمیریوں اور پشتونوں کو پنجاب کے غلبے سے برگشتہ کیا۔ آغاز ہی میں جنم لینے والے محرومی کے شدید احساس نے مشرقی پاکستان کو بالآخر ہم سے الگ کر دیا۔ مضبوط قومی

شناخت قائم نہ ہو سکی کہ ملک متحد اور مضبوط ہوتا۔ اشرافیہ ملک کو لوٹتی رہی، وسائل برباد کیے جاتے رہے اور محرومی میں مبتلا عام آدمی دکھ سہتا رہا۔ عوام کی اکثریت، تعلیم اور صحت کی سہولتوں کے علاوہ انصاف تک کبھی رسائی نہ پا سکی۔ ایک مربوط اور مستحکم عدالتی نظام کبھی تھا ہی نہیں۔

ملک کے دو سب سے زیادہ بدعنوان اداروں میں پولیس اور نچلی عدالتیں شامل ہیں۔ جمائما کے خلاف ٹائلوں کی چوری کا مقدمہ، اس امر کا اظہار تھا کہ ریاستی ظلم کے مقابلے میں عدالت ایک شہری کے تحفظ میں کس بری طرح ناکام ہو جاتی ہے۔ مجھے میرے اسیری کے تجربے نے بتایا کہ گندے، قیدیوں کی ضروریات کے لیے اخراجات سے محروم اور ٹھونس ٹھونس کر بھرے گئے ہمارے جیل خانوں میں مقید لوگ انصاف حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ وسائل نہیں رکھتے اور ان کی پرواہ کرنے والا کوئی نہیں۔ اسلام میں تو چند استثنائی صورتوں کے سوا، شہریوں کو جیلوں میں بند کرنے کا تصور ہی نہ تھا۔ امیروں کے پاس پیسہ ہے اور وہ انصاف خریدتے ہیں۔ دیہات میں غریب، ہر روز ہر وقت ہراساں کیے جاتے ہیں۔ اس لیے وہاں غریب کا ووٹ سچے اور اجلے امیدوار کو نہیں بلکہ اس شخص کو ملتا ہے، جو طاقتور سے اس کا تحفظ کر سکے۔ سرکاری مشینری حکمران جماعت کے رحم و کرم پہ ہوتی ہے کہ مخالفین کا صفایا کر سکے۔ آزاد اور خود مختار عدلیہ کے بغیر حقیقی جمہوریت کبھی نہ آئے گی۔ پاکستان کا خواب دیکھا گیا تو سوچا یہ تھا کہ عام آدمی کو ظالم سے تحفظ دیا جائے گا مگر ہوا یہ کہ ریاستی ادارے سفاک اور بے رحم اہل اختیار کے مددگار بن کر رہ گئے۔ جب بھی اصلاحات کی بات ہوتی ہے تو ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ان اداروں، پولیس اور عدلیہ کے لیے حکومت کے پاس وسائل ہی موجود نہیں۔ ججوں کو موزوں معاوضے ادا کرنے کے لیے خزانے میں رقم نہیں ہوتی۔ مزید عدالتوں کی تعمیر و تشکیل کے لیے سرمایہ میسر نہیں۔ میرا احساس یہ ہے کہ کم از کم دیہات کی حد تک پنچایت اور جرگے کا نظام مددگار ہو سکتا ہے۔ کیوں نہ ہر گاؤں میں اتفاق رائے سے ایسے پنچ مقرر کیے جائیں جو چھوٹے موٹے

جھگڑوں اور زمین کے معمولی تنازعوں میں فیصلے کریں، روایتی انداز میں جھگڑے نمٹا دیں۔ ضرورت تو یہ ہے کہ جس کے ساتھ زیادتی ہو، اس کے لیے تلافی کا سامان کیا جائے نہ یہ کہ ملزموں سے جیلیں بھر دی جائیں۔

ملک کے بعض حصوں میں برقرار جاگیرداری نظام، ملک اور معاشرے کے لیے ایک لعنت کے سوا کچھ نہیں۔ ان جاگیروں میں ہر کہیں المناک کہانیاں سنائی دیتی ہیں۔ خاص طور پر خواتین کے بارے میں۔ غریب گھرانوں کی عورتوں کو وہ اپنی جائیداد سمجھتے ہیں اور ان کے بے بس ولاچار مرد یہ سب برداشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ سندھ اور جنوبی پنجاب میں 2010ء کے المناک سیلاب میں اطلاعات تھیں کہ بڑے زمینداروں نے اپنی اراضی بچانے کے لیے پشتے توڑ ڈالے اور سیلابی پانیوں کے رخ موڑ دیئے۔ نقصان بے چارے عام لوگوں کو پہنچا۔ جاگیرداروں اور دوسرے طاقتور لوگوں کا یہ طرزِ فکر کہ وہ قانون سے ماورا ہیں، کرپشن کی روئیدگی اور فروغ کا باعث بنا، جیسے برسات میں خودرو جھاڑیاں اگ آتی ہیں۔ پاکستان میں امیروں اور غریبوں کے درمیان حائل اور پھیلتی خلیج کا یہی سبب ہے۔

ایک طرف وہ امرا ہیں جو دنیا بھر میں قیمتی جائیدادوں کی خریداری کرتے ہیں۔ ذاتی جہازوں کے مالک ہیں اور جن کی حفاظت کے لیے مسلح افراد کے جتھے عقب میں بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف وہ محرومی، جسے اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کی اصطلاح میں ''ہمہ جہتی افلاس'' کہا جاتا ہے۔ تعلیم اور صحت کی سہولتوں سے محرومی اور ڈھنگ کی رہائش سے محرومی۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ اور ان کے خلفا کی تقلید کرنے کی بجائے، جو سادہ اور سچی زندگیوں کی مثالیں چھوڑ گئے، وہ مغل بادشاہوں کے مقلد ہیں۔ بالکل برعکس برطانیہ کا وزیراعظم 10 ڈاؤننگ سٹریٹ کے سادہ سے مکان میں مقیم ہوتا ہے۔ سیاستدانوں کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ اپنا سرمایہ بیرون ملک لے جائیں۔ ان میں سے بعض کا بیرون ملک کوئی اور معروف ذریعہ

آمدن نہیں۔ یہ کس طرح کے لیڈر ہیں جنہیں اس انداز کا تحفظ درکار ہے۔ جانے پہچانے لیڈروں میں، شاید میں واحد سیاستدان ہوں، جس کے سارے اثاثے پاکستان میں ہیں اور ان کی پوری تفصیل قوم کو معلوم ہے۔ یہ روپیہ میں نے انگلینڈ میں کرکٹ کھیل کر کمایا لیکن پھر سب کا سب قانونی ذرائع سے ملک میں منتقل کر دیا۔ عام لوگ تب خوشی سے ٹیکس ادا کریں گے، جب انہیں پتہ ہوگا کہ وہ لوٹ کر ضائع نہ کر دیا جائے گا یا سمندر پار نہ جا پہنچے گا۔ جب وہ اقتدار میں ہوتے ہیں تو یہی کرتے ہیں، سوئٹزرلینڈ کے کھاتوں میں لوٹا ہوا مال منتقل ہو جاتا ہے۔ اقتدار سے نکالے گئے تو مغرب جا پہنچے اور عیش وعشرت کے شب وروز بسر کرنے لگے۔ تیسری دنیا میں سیاسی رہنماؤں کے لیے بینک کھاتوں کے اخفا کا قانون ختم کر دینا چاہیے۔ فوجی اور سول افسروں کے لیے بھی، جن پر کرپشن کے الزامات ہوں۔ غیر ممالک میں رکھے گئے سرمائے کو فوراً اس ملک میں منتقل ہونا چاہیے، جہاں سے نوچ کر وہ لایا گیا۔ غریب ممالک کے لیے یہ مغرب کا سب سے بڑا تحفہ ہوگا۔ مفلس اور محتاج عوام کے لیے غیر ملکی امداد یا قرضوں سے یہ کہیں بڑی اعانت ہوگی۔

ہماری معاشی عمارت بھی ناانصافی کے ستونوں پر استوار ہے۔ اشرافیہ نے عالمی مالیاتی فنڈ سے ناپاک گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اور اس کا سارا بوجھ عوام پر ہے۔ ہر نئے بجٹ میں بالواسطہ ٹیکس بڑھا دیئے جاتے ہیں کہ عامیوں کا مزید خون چوسا جائے۔ امیر براہ راست ٹیکس ادا کرنے پر آمادہ نہیں اور ان کے اس جرم کی سزا عام آدمی کو دی جاتی ہے۔ چونکہ ردِعمل نہیں ہوتا؛ لہٰذا ہر نئے دن کے ساتھ یہ بوجھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

بے تحاشا بیرون ملک سے قرضے لیے گئے تو عوام سے کس نے پوچھا تھا؟ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ چکائے کس طرح جائیں گے؟ کبھی کسی نے حساب نہ دیا کہ یہ ڈالر کہاں خرچ ہوئے۔ 2008ء سے 2011 کے دوران پاکستان کا سرکاری قرضہ 5 کھرب سے بڑھ کر

گیارہ کھرب ہو گیا۔ 59 بلین ڈالر سے 122 بلین ڈالر۔ ٹیکسوں کی سالانہ قومی آمدن میں سے 65 فیصد قرض کی ادائیگی پہ اٹھ جاتا ہے۔ بجٹ کا ساٹھ فیصد قرضوں کی واپسی اور دفاع پہ خرچ ہوتا ہے اور تعلیم پر محض 1.5 فیصد، صحت پر 0.5 فیصد۔ اس کے علاوہ امیر لوگوں کو دیئے گئے 226 ارب روپے کے قرضے معاف کر دیے گئے۔ افراط زر کی لعنت اس کے سوا ہے کہ حکومت سٹیٹ بینک سے مسلسل قرض لیتی اور نوٹ چھاپتی رہتی ہے۔ گیس، پانی، بجلی، پٹرول اور ڈیزل اس طرز عمل کے نتیجے میں گراں تر ہوتے جاتے ہیں۔ تنخواہ دار طبقے میں اسی لیے رشوت کا مرض پھیلتا جا رہا ہے۔ جوں جوں افسر شاہی میں یہ مرض پھیلتا ہے، عام آدمی کی زندگی اور بھی اجیرن ہونے لگتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی سول سروس کے ساتھ سرکاری پالیسیوں کا نفاذ مشکل ہے۔

معیشت ہی نہیں قومی عزت نفس کا معاملہ بھی یہی ہے۔ پاکستانی عوام کی پوری صلاحیت کیونکر بروئے کار آئے جب کہ ہم بیرونی امداد کے بغیر آگے بڑھنے کا تصور ہی نہیں رکھتے۔ کرکٹ کے تجربے سے مجھ پر منکشف ہوا کہ جس ٹیم کو خود پر اعتماد ہو اور جو اپنی عزت کے معاملے میں حساس رہے وہ اپنی صلاحیت سے بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوگی، خود سے بہتر حریف کو بھی گاہے وہ ہرا دیتی ہے۔ بدقسمتی ہماری یہ ہے کہ ہم امریکہ اور دوسروں پر انحصار کے عادی ہو گئے۔ ایک نتیجہ ہے کہ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی عادت نہ ڈال سکے اور دوسرا یہ نتیجہ کہ ہماری بدبخت اشرافیہ کو ہر بار باہر سے تعاون مل جاتا ہے۔ 2010ء کے سیلاب میں ہماری 167 بلین ڈالر کی معیشت کو بدترین دھچکا لگا، جو ہماری تاریخ میں بدترین تھا۔ اپنی قوم کی صلاحیت اور عزم پر انحصار کی بجائے، ہماری حکومت نے کشکول اٹھایا اور دنیا کے سامنے جا جھکی۔ وہی طرز عمل جو اس نے 2003ء کے زلزلے میں اختیار کیا تھا۔ دنیا اب ہماری مدد میں متذبذب تھی لیکن پھر کیا ہوا۔ خود ہمارے عوام کی محنت عزم، ریاضت اور فیاضی سے کسی نہ کسی قدر بہتری آ گئی۔ صرف ایک ماہ کے دوران میں نے دو ارب روپے کے عطیات جمع کیے۔ ہر

اس شخص نے مدد کی، جس سے میری شناسائی تھی۔

عوام کا اعتماد جیت کر، ہم ان کی پوری قوت کو بروئے کار لا سکتے ہیں۔ آنے والے شاندار مستقبل کی اُمید میں یہی سب سے اچھی سرمایہ کاری ہوگی۔ وسائل بہت ہیں مثلاً اربوں ڈالر کا سونا، تانبا اور کوئلہ۔ ہماری زبردست زرعی زمین، سنگ مرمر، اعلیٰ قسم کا گرینائٹ اور سوات میں ہیروں کی کانیں، سمندر پار ساٹھ لاکھ پاکستانی، جن کی آمدن اندرون ملک کی اٹھارہ کروڑ آبادی کے برابر ہے۔ زراعت، کاروبار اور صنعت کو فروغ دینے کے لیے کیا یہ سب کافی نہیں، پھر وہ نوجوان نسل، جس کا جواب ہی نہیں کہ پاکستان میں نوجوانوں کا تناسب اور صلاحیت غیر معمولی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ پاکستان برصغیر کے تمام مسلمانوں کے لیے بنایا گیا، اب ہر سال ہزاروں پاکستانی سمندر پار چلے جاتے ہیں۔ خوشحال لوگ امریکہ کے گرین کارڈ اور کینیڈا کی شہریت کے متلاشی رہتے ہیں۔ ہمارے غریب تعمیراتی منصوبوں میں خون پسینہ ایک کرنے کے لیے مشرق وسطیٰ کا رخ کرتے ہیں۔ شوکت خانم کینسر ہسپتال کی ایک تہائی نرسیں ہر سال عرب ممالک کو سدھارتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے برابر ہم دے نہیں سکتے۔

کس طرح اپنی قوم کی صلاحیت کو پوری طرح ہم برت سکتے ہیں کہ ہمارا نظام تعلیم دنیا بھر میں بدترین ہے۔ انگریز اپنے پیچھے بہترین تعلیمی ادارے چھوڑ گئے تھے۔ جب میں تعلیم پا رہا تھا تو میں دیکھتا کہ ہماری یونیورسٹیوں میں مشرق وسطیٰ ہی نہیں، دور دراز کی سرزمینوں سے حصول علم کے آرزومند آیا کرتے، ایچی سن کالج میں ملائیشیا کے شہزادے پڑھا کرتے۔ افسوس کہ ایک کے بعد دوسری حکومت نے ان اداروں کو زوال آمادہ ہونے دیا۔ بہت سے تجزیہ کار نشان دہی کرتے ہیں کہ دسیوں لاکھ غیر تعلیم یافتہ اور بے روزگار نوجوان عدم استحکام کا سبب بنتے جائیں گے۔ ان کے لیے وسائل مختص نہیں۔ آدھا پاکستان بیس سال سے کم عمر کے لڑکوں پر مشتمل ہے اور اگر انہیں تیس سال تک شمار کیا جائے تو وہ آبادی کا ستر فیصد ہوتے ہیں۔ نصف

صدی میں آبادی تین گنا ہو گئی۔ آئندہ بیس برس کے اندر ساڑھے آٹھ کروڑ مزید بڑھے گی۔ میں نے یہ اعداد و شمار برٹش کونسل کی ایک رپورٹ سے لیے ہیں۔ ساڑھے آٹھ کروڑ کا مطلب ہے کراچی جیسے پانچ اور شہر۔ تلافی اور تیاری کے لیے ہمارے پاس اب بہت تھوڑی سی مہلت باقی ہے۔ ناراض اور محروم لوگوں کی ایک فوج ظفر موج کی بجائے اس عظیم آبادی کو ہمیں محنت کشوں کے ایک بے بہا لشکر اور صف بہ صف صارفین کی صورت دینی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اکثر غریب ممالک کے مقابلے میں بھی تعلیم پر ہمارے اخراجات نصف کے قریب ہیں۔ تین طرح کے تعلیمی ادارے ہیں، انگلش میڈیم، اُردو میڈیم اور مدرسے۔ ان میں سے ہر ایک کا مزاج اور ماحول مختلف ہے اور وہ سب الگ اقسام کے طالب علم پیدا کرتے ہیں۔ بہترین قسم کے انگلش میڈیم سکولوں کا نصاب امریکہ اور برطانیہ سے درآمد کیا جاتا ہے۔ سرکاری سکول عشروں کی بے توجہی اور مالی بے نیازی کے سبب زوال کا شکار ہوتے ہوتے بہت ہی پست ہو گئے۔ اب ان میں تعلیم پانے والے طلبہ، انگریزی والوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے، جب کہ بیسویں صدی کے ساتویں عشرے تک بہترین دماغ، انہی اداروں سے ابھر کر آتے تھے۔ پھر مدارس ہیں، بے شک ان میں سے بعض کا معیار بہت بلند ہے۔ ان میں درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے وہ طالب علم ہوتے ہیں جن کے والدین کو دینی تعلیم سے شغف ہے۔ بھاری تعداد مگر ایسی ہے جو خود مدارس یا مساجد ہی میں کھپ سکتی ہے۔ عصر حاضر کے علوم سے وہ ناآشنا رہتے ہیں۔ معیشت کے مرکزی دھارے میں وہ شریک نہیں ہو سکتے اور فرقہ پرستی کا ان سے اندیشہ رہتا ہے۔ غریب والدین اپنے بچوں کو ان مدارس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ان لیے کہ فقط تدریس ہی نہیں، اکثر کھانا اور رہائش بھی مفت ہوتی ہے۔

سرکاری سکولوں کی تباہی کے نتیجے میں نجی تعلیمی اداروں کا قیام، ایک پرکشش کاروبار بن چکا ہے۔ سارے کے سارے امیر لوگ اپنے بچوں کو ان اداروں میں پڑھاتے ہیں۔ دیہی

علاقوں میں بھی بعض والدین، اپنے وسائل کا بڑا حصہ بچوں کی تعلیم پر صرف کر ڈالتے ہیں۔ اس سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ سب مجبوریوں کے باوجود تعلیم کو وہ کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ کتنی ہی رپورٹیں اور کتنے ہی قرطاس ابیض چھپ چکے۔ ان سب میں تمام تعلیمی اداروں کے لیے ایک ہی نصاب کی سفارش تھی لیکن عمل قطعاً نہ ہوا۔ ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اشرافیہ اس بات کو پسند نہیں کرتی۔ اپنے لیے وہ ترجیحی سلوک کی آرزو مند ہے۔ 1972ء میں نجی اداروں کو سرکاری تحویل میں لینے کا فیصلہ بھی تعلیمی اداروں کی تباہی کا سبب بنا۔ پیپلز پارٹی کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ یہ اقدام درست نہیں تھا۔ اساتذہ کو سرکاری ملازم بنا کر سیاست کا دروازہ کھول دیا گیا۔ کرپشن جو اس سیاست کی سگی بہن ہے، تعلیم کے میدان میں بھی داخل ہو گئی۔ استاد کو اب اپنے ادارے کا وفادار رہنے کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ اس لیے کہ وہ نہ اسے ملازمت دینے کا اختیار رکھتا ہے اور نہ خراب کارکردگی پہ الگ کر دینے کا۔ جن کے مراسم اچھے ہیں، جب چاہیں وہ بہترین سکولوں میں اپنا تبادلہ کرا لیں۔ اساتذہ کی تقرری اب سرپرستی کے ایک نظام کی مرہونِ منت ہے۔ اہلیت اور صلاحیت سے قطع نظر سیاستدان ان کے مددگار ہوتے ہیں۔ ایسے ''بھوت سکول'' پورے ملک میں موجود ہیں جہاں استاد تنخواہیں تو وصول کرتے ہیں لیکن در و دیوار ان کی صورت کبھی نہیں دیکھ پاتے۔ پاکستان بیکن ہاؤس نیشنل یونیورسٹی کی ڈین اور واشنگٹن کے وڈرو ولسن انٹرنیشنل سنٹر فار سکالرز کی صبیحہ منصور نے صورت حال کی تصویر کشی اس طرح کی: ''ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے سکولوں کو قومیانے کے بعد افسر شاہی کے ایک عفریت نے جنم لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اور زیادہ بھیانک اور طاقتور ہوتا گیا۔ کرپشن کے امکان بڑھتے گئے۔ پاکستان اب ان ملکوں کی فہرست میں شامل ہے جہاں تعلیمی نظام کے اندر اساتذہ کے مقابلے میں دوسرے ملازمین کا تناسب نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ سرکاری تسلط کا مطلب یہ بھی ہے کہ حکومت بدلنے کے ساتھ ہی، تعلیمی اداروں کا کردار بھی تبدیل ہو جائے۔''

اسی تعلیمی نظام سے پریشان ہو کر میں نے میانوالی میں نمل یونیورسٹی قائم کی۔ دیہی علاقے میں یہ ملک کی واحد جامعہ ہے۔ اوّل اوّل میں اپنے حلقہ انتخاب میں شدید بے روزگاری سے متاثر ہو کر اس طرف متوجہ ہوا۔ بعض دیہات میں معاملہ بے حد سنگین تھا۔ بے روزگاری کے سبب نوجوان جرائم اور منشیات کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ ایک ٹیکنیکل کالج بناؤں۔ اسی اثناء میں برطانیہ کی بریڈفورڈ یونیورسٹی نے مجھے چانسلر کے منصب کی پیش کش کی۔ اس موقع سے میں نے فائدہ اٹھانے کا سوچا کہ ملک میں ایک یونیورسٹی ہی بنا دوں۔ جب اس نواح کے دیہاتیوں سے بات کی تو انہوں نے بہت فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اس کام کے لیے زمین وہ مفت فراہم کریں گے چنانچہ میں نے اس منصوبے کو وسیع تر کرنے کا ارادہ کیا۔ صرف ایک کالج ہی کیوں؟ ایک سرسبز و شاداب اور خود انحصار شہرِ علم کیوں نہیں؟ تعمیر کا پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا۔ 2007 میں طلبہ کی پہلی کھیپ ادارے میں داخل ہوئی۔ 2012ء میں ان کی تعلیم انشاءاللہ مکمل ہو جائے گی۔ ان سب کے ہاتھوں میں بریڈفورڈ یونیورسٹی کی ڈگریاں ہوں گی۔ ماہرین اور کاریگروں کی ملک میں اس قدر کمی ہے کہ انشاءاللہ ان میں سے ہر ایک کو فوراً ہی ملازمت مل جائے گی۔ خوبصورت نمل جھیل کے کنارے اب میں ایک ٹیکنالوجی پارک کا خواب دیکھتا ہوں۔ پہاڑوں کے پیچھے برطانیہ نے ایک سیر گاہ بنا دی ہے۔ میری آرزو ہے کہ نمل یونیورسٹی کے طلبہ کی خاطر میں یہاں موسم گرما کا ایک صحت افزا مقام تعمیر کروں۔ اس یونیورسٹی کے منصوبے کی مزاحمت مقامی سیاستدانوں کی طرف سے ہوئی۔ جتنی رکاوٹیں وہ کھڑی کر سکتے تھے، کر گزرے۔ جیسے ہی میں نے منصوبہ پیش کیا، دس کلو میٹر دور، صوبائی حکومت نے ایک کالج کی تعمیر شروع کر دی۔ تین گنا زیادہ روپیہ صرف کرنے کے باوجود کہ اس اثنا میں ہماری یونیورسٹی طلبہ کی آوازوں سے زندہ ہو گئی۔ وہ اب بھی ایک ڈھانچے کے سوا کچھ نہیں۔

سیاسی اشرافیہ کو تعلیم کے فروغ اور حالات میں تبدیلی پیدا کرنے سے ہرگز کوئی دلچسپی نہیں۔ تین طرح کا موجودہ تعلیمی نظام ملک میں موجود ہے اور ظاہر ہے کہ پیچیدگیوں کا ذریعہ۔ مغرب زدہ امراء اور غریبوں میں پہلے سے واقع خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔ بنیاد پرستی کو اس سے فروغ ہے۔ اگر کوئی بیک وقت انگریزی اور اردو اخبارات کا عرق ریزی سے مطالعہ کرے تو وہ محسوس کیے بغیر نہ رہے گا کہ ان کا تعلق دو مختلف ممالک کے ساتھ ہے۔ انگریزی لکھنے والوں میں مقامی ثقافت کی تضحیک کرنے والے کم نہیں۔ اگرچہ اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ ایک چھوٹا سا طبقہ ہی ان کا قاری ہے۔ انگریزی سکولوں کے طلبہ اپنے ہی وطن میں اجنبی بن کر رہ جاتے ہیں اور اپنے ہی لوگوں کے ساتھ ابلاغ میں انہیں دشواری رہتی ہے۔ جب ہم نے لاہور کے ایک ایسے ہی ممتاز کالج سے فارغ التحصیل نوجوانوں کو شوکت خانم ہسپتال کی مارکیٹنگ ٹیم کا حصہ بنایا تو ہم نے دیکھا کہ اپنے سب سے بڑے عطیہ دہندگان عام تاجروں سے بات کرنے میں انہیں مشکل پیش آتی ہے۔ ہمارے محسن دکاندار بے چارے، روانی سے اردو میں بھی اظہار مدعا نہیں کر سکتے کہ ان کی زبان پنجابی ہے۔ یہ نوجوان ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے ہیں۔ ان کے جملوں میں انگریزی الفاظ کی بھرمار ہوا کرتی ہے۔ یہ ایک بہت ہی افسوس ناک صورتحال ہے۔ کاروباری امور کی تعلیم دینے والے مذکورہ ادارے نے ان کی تربیت میں بین الاقوامی کمپنیوں یا بیرون ملک ملازمت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔ دوسری طرف اردو میڈیم سکولوں اور مدارس سے نکلنے والے طلبہ مغربی کلچر کا ادراک نہیں رکھتے۔ نام نہاد اشرافیہ سے وہ بیزار نظر آتے ہیں۔ اس وقت جب مشرق وسطیٰ کے ممالک نہ صرف مغربی استعمار اور اپنے آمروں سے نجات پانے کی تحریک سے دوچار ہیں، جب وہ اپنی آزادی کی تکمیل پر تلے ہیں، پاکستان بھی ایک سماجی اور سیاسی انقلاب کی طرف گامزن ہے۔ مشرق وسطیٰ کی ہی مانند ہمارا معاشرہ حالات کو جامد رکھنے کی خواہش مند چھوٹی سی اشرافیہ اور تبدیلی کی آرزومند نئی نسل میں بٹ ہو چکا۔ نوجوان نسل ایسی

جمہوریت کے لیے بے تاب ہے جس میں ان کا ایک کردار ہو۔ مشرق وسطیٰ کے مقابلے میں بعض اعتبار سے پاکستان افضل اور بہتر حالات میں ہے۔ ہر چند کہ تین عشروں کی ڈکٹیٹرشپ اس نے بھگتی ہے، مکمل آزادی کی طرف گامزن نیم جمہوری نظام کے وار بھی سہہ چکا، اس تجربے سے اب بھی وہ گزر رہا ہے۔ سیاسی جماعتیں اس میں کارفرما ہیں۔ بڑی حد تک میڈیا آزاد ہے اور اظہار خیال کے مواقع اب میسر ہیں، جن سے مدتوں اسے محروم رکھا گیا۔ عام آدمی کی قوت تخلیق اور پیش قدمی کو پولیس کے جبر سے تباہ کیا گیا یا شخصیت پرستی کی جہالت سے، اس کے باوجود اب خلق خدا ان دیوتاؤں سے بیزار ہے۔ پُرخلوص جدوجہد کے ساتھ ہمیں ان متصادم تصورات میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے جو اس پر مسلّط کیے گئے۔ مختلف علاقوں اور نسلوں میں رفاقت استوار کرنی ہے۔ یہ خطۂ ارض، مشرق وسطیٰ، وسطی اور جنوب مغربی ایشیا کے درمیان واقع ہے۔ تہذیبوں اور آبادیوں کا سنگم۔ اس کی غیر معمولی جغرافیائی اہمیت کو اس کا اثاثہ بننا چاہیے نہ کہ بوجھ۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہر چند نوجوانوں کو قومی معاملات سے الگ رکھا گیا۔ پولیس گردی اور جعلی سیاست سے وہ بیزار ہیں لیکن پھر بھی قومی معاملات میں ان کی دل چسپی روز افزوں ہے۔ مشرق وسطیٰ سے پہلے تحریک پاکستان میں اٹھی۔ جب نوجوانوں کے کاررواں وکلاء تحریک میں جا شامل ہوئے۔ ناقابل بیان دشواریوں کے باوجود انہوں نے چیف جسٹس کی بحالی کو ممکن بنا دیا۔ اس تحریک کو اگرچہ اغوا کرنے کی کوشش ہوئی۔ راکھ کے نیچے مگر چنگاریاں اب بھی سلگ رہی ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جیسے ہی الیکشن کا اعلان ہو گا، نرم انقلاب کا ایک عظیم دھارا پھوٹ بہے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مفاد پرستوں کو وہ بہالے جائے گا۔

یہ دھارا تو 30 اکتوبر کو لاہور کے تاریخی جلسہ عام ہی میں ابل پڑا۔ جیسے پتھر کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے!

آخری باب

وہ وقت قریب آپہنچا ہے

2 مئی 2011ء: صبح سویرے کراچی سے سکھر جاتے ہوئے میں نے ایک سنسنی خیز خبر سنی۔ ایبٹ آباد میں امریکی فوجیوں کے حملے میں اسامہ بن لادن کی جان لے لی گئی۔ دنیا کا سب سے مطلوب آدمی کسی غار میں نہیں بلکہ اسلام آباد سے صرف 50 کلومیٹر دور ایک مشہور قصبے میں پایا گیا، پاکستان ملٹری اکیڈمی سے صرف ایک میل دور۔ بدترین بات یہ تھی کہ امریکہ ہی نہیں، پاکستان اور دنیا بھر کے شہریوں کو یہ خبر صدر اوباما نے دی۔

چند گھنٹے بعد ہماری حکومت نے امریکہ بہادر کو مبارک باد دی۔ یہ کہہ کر داد وصول کرنے کی کوشش بھی کہ اسامہ بن لادن کے بارے میں معلومات پاکستان ہی نے فراہم کی تھیں۔ فطری طور پر ہر پاکستانی کے ذہن میں ایک سوال ابھرا! اگر ہمیں معلوم تھا تو کیوں نہ خود ہم نے جا پکڑا۔ بھارت اور دوسرے ملکوں کے میڈیا نے پاکستان پر یلغار کر دی۔ الزام دھرا گیا کہ آئی ایس آئی، دوسرے لفظوں میں پاک فوج، نے چھ برس سے اس شخص کو ایبٹ آباد میں چھپا رکھا تھا۔ عالمی میڈیا نے سندھ میں مجھے تلاش کر لیا۔ اب میں تو یہ جانتا ہی نہ تھا کہ معاملہ کیا ہے اور

سوچنا یہ تھا کہ سول اور فوجی قیادت اس بارے میں ہماری رہنمائی کرے۔ اہل وطن خاص طور پر بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے لیے یہ توہین آمیز اور اذیت ناک دن تھا۔ ہمارے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے ہمارے لیڈران کرام نہایت تیزی کے ساتھ، بار بار اپنا موقف بدلتے نظر آئے۔

تین دن بعد چیف آف آرمی سٹاف نے اعلان کیا کہ پاکستان کو مکمل طور پر تاریکی میں رکھ کر امریکیوں نے کارروائی کی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آئندہ پاکستان کی خودمختاری اور سلامتی کی ایسی سنگین خلاف ورزی گوارا نہ کی جائے گی۔ ہفتہ بھر کے بعد وزیراعظم نے کنفیوژن میں مزید اضافہ کیا۔ انہوں نے یہ ارشاد کیا کہ پاکستان کے تزویراتی (Strategic) ایٹمی اثاثوں کے خلاف کسی کارروائی کا اتنی ہی شدت سے جواب دیا جائے گا۔ سی آئی اے کے سربراہ پنیٹا (Panetta) نے ہمارے زخموں پر نمک چھڑکا کہ اس معاملے میں حکومت پاکستان ملوث تھی یا پھر نالائق۔

آٹھ برس سے ہم امریکی جنگ لڑنے میں مصروف ہیں حالانکہ 9/11 سے ہمارا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس جنگ میں پاکستان نے اپنے چونتیس ہزار شہریوں کو کھو دیا جس میں چھ ہزار فوجی بھی شامل تھے۔ 68 ارب ڈالر کا نقصان اسے برداشت کرنا پڑا جب کہ امداد بیس ارب ڈالر تھی۔ قبائلی علاقوں سے 5 لاکھ افراد کو ہجرت کرنا پڑی ہے۔ بدترین غربت کا شکار لوگوں کے لیے یہ کتنا بڑا عذاب ہے۔ ایک لاکھ چالیس ہزار فوجی قبائلی علاقوں میں تعینات ہیں۔ اس کے باوجود تاریخ میں شاید یہ پہلا واقع ہے کہ ایک حلیف ملک یعنی امریکہ، پاکستان پر مسلسل بمباری کر رہا ہے، اپنے ڈرون طیاروں کے ذریعے۔ افغانستان میں ایک امریکی فوجی پر سالانہ دس لاکھ ڈالر خرچ ہوتے ہیں جبکہ قبائلی علاقوں میں ایک پاکستانی فوجی پر 900 ڈالر۔ اس کے باوجود ہمیں تنگ کیا جاتا ہے اور ہماری توہین کی جاتی ہے۔

خوف عوام کے رگ و پے میں سرایت کر چکا کہ امریکہ اپنی ہی قائم کردہ، کٹھ پتلی حکومت پر دباؤ بڑھائے گا، ڈومور (Do more) کا نعرہ پھر لگے گا۔ اس کا مطلب قبائلی علاقوں بالخصوص شمالی وزیرستان میں فوجی کارروائیوں کا مطالبہ ہوتا ہے۔ ہر پاکستانی جانتا ہے کہ ایسی فوجی کارروائیوں کا وبال شہری علاقوں میں مزید خودکش حملوں کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔ القاعدہ اور طالبان پہلے ہی اعلان کر چکے تھے کہ امریکہ کے ساتھ مل کر اسامہ کو قتل کرانے کا انتقام پاکستان سے لیا جائے گا۔ یہی ہوا، خودکش حملہ آور ہم پر ٹوٹ پڑے۔ بدترین واقعہ کراچی میں بحریہ کے صدر دفتر پر حملہ تھا پھر خیبر پختونخوا میں ایک فوجی کیمپ پر۔ ایک سو قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔ ہم دو طرح سے عذاب میں مبتلا ہو چکے۔ ادھر امریکہ کارروائی کے لیے دباؤ ڈالتا ہے اور اُدھر اندر سے انتہا پسند قیمتی زندگیوں کی فصلیں اُجاڑتے ہیں اور بدترین یہ کہ اگر دنیا میں کہیں بھی خاص طور پر امریکہ میں دہشت گردی کا واقعہ ہو تو پاکستان میں بم باری کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

مجھے لگتا ہے 2 مئی کے واقعہ نے پاکستانیوں کی نفسیات پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ہر کوئی سوچتا ہے اگر ہم نے اپنی حکمت عملی تبدیل نہ کی تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔

حکمران مکمل طور پر بے نقاب ہیں۔ 30 مئی کو جنرل مشرف دور کے سابق آئی ایس آئی چیف جنرل ضیاء الدین بٹ نے کہا کہ موصوف نے اسامہ بن لادن کو ایبٹ آباد میں خفیہ ایجنسی کے ایک خفیہ ٹھکانے پہ رکھ چھوڑا تھا تا کہ زیادہ سے زیادہ ڈالر بٹورے جائیں۔ اگر یہ بات غلط ہے تب بھی ایک چیز تو واضح ہے کہ ہماری حکومت نے پاکستان کو جنگ کی بھٹی میں صرف ایک وجہ سے ڈالا، ڈالروں کی خاطر۔ ملک برباد ہوتا رہا اور حکمران اپنے لیے مفادات سمیٹتے رہے۔ اب پاکستانی عوام کو ان پر اعتماد ہے اور نہ باقی دنیا کو۔ امریکہ کھلے عام پاکستان کو دوہری پالیسی کا مرتکب ٹھہراتا ہے۔

سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ اگر ہم امریکہ سے مدد لے کر اپنے شہریوں پر بم باری کرتے رہے تو ایک وقت آئے گا خود ہماری فوج اس عمل سے تنگ آجائے گی۔ اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ کہیں بغاوت ہی نہ پھوٹ پڑے۔ 2 مئی کے بعد فوج کو اندر اور باہر، ملک اور بیرونِ ملک خصوصاً مغرب سے ایسی سخت تنقید کا سامنا رہا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ سب یہ کہتے ہیں کہ 80 فیصد پاکستانی امریکہ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اُنہیں یقین ہے کہ امریکہ دہشت گردی نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں مصروف ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہی رائے پاکستانی فوج کے اندر بھی موجود ہوگی۔ اگر فوج کے اندر سے تخریب کاری اور دہشت گردی میں تعاون کے صرف چند ہی واقعات ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اس ادارے میں زبردست نظم وضبط قائم ہے۔

فوج میں توہین کا سخت احساس پایا جاتا ہے۔ ویسا ہی جیسا کہ 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے ہنگام میں 90 ہزار پاکستانی فوجیوں کی گرفتاری پہ تھا۔ اپنے شہریوں کو مار کر امریکہ سے مدد حاصل کرنے کا راستہ قابلِ عمل نہیں۔ معلوم نہیں کب تک فوجی جوان اس صورتِ حال کو برداشت کریں گے۔ معلوم نہیں کب ان کے اندر ردِعمل پھوٹ پڑے۔ وِکی لیکس کی مصدقہ شہادت نے ثابت کیا کہ حکمران طبقہ منافق اور امریکہ کی خوشامد پہ تلا ہوا ہے ہمارے لیڈر اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں اس صورتِ حال کے ادراک نے تبدیلی کی خواہش پیدا کردی ہے۔

ایک دن یہی ہونا تھا۔ جب آپ بھیک مانگ کر جی رہے ہوں تو جلد یا بدیر توہین کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک ہی راستہ ہے کہ کٹھ پتلی حکومت مستعفی ہو اس لیے کہ وہ ناکام ہو چکی۔ سپریم کورٹ کی نگرانی میں نئے انتخابات کرائے جائیں تاکہ خود مختار اور باوقار حکومت تشکیل پائے جو پاکستانی عوام کے احساسات کی نمائندگی کرتی ہو۔ پاکستان اس بے مقصد جنگ

سے علیحدہ ہوجائے۔ عسکری گروپوں سے بات کی جائے جس طرح کہ امریکہ افغانستان میں کر رہا ہے۔ قبائلی علاقوں سے پاکستانی فوج کی واپسی کا ٹائم ٹیبل طے کیا جائے۔ ایک واحد کام جو پاکستانی حکومت کرسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ افغانستان سے امریکہ کی باعزت واپسی کا راستہ ہموار کرے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ جیتنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ لوگوں کے دل ودماغ جیتے جائیں۔ جن لوگوں کے درمیان بیٹھ کر دہشت گرد بروئے کار آتے ہیں اگر وہ انہیں خطرناک مان لیں تو یہ جنگ جیت لی جائے گی۔ تاریخ یہ کہتی ہے کہ اگر وہ انہیں حریت پسند سمجھیں گے تو ان کی مدد کریں گے۔

نئی حکومت کو چاہیے کہ وہ اب تک دی جانے والی امداد پر امریکہ کا شکریہ ادا کرے اور ”مزید کچھ نہیں“ (No More) کہہ دے۔ اسے آئی ایم ایف کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دینا چاہیے اس لیے کہ یہ ادارہ امیروں کو امیر تر اور غریب کو مزید مفلس بنا سکتا ہے۔ جب غیرملکی مدد ہوگی ہی نہیں تو حکومت مجبور ہوجائے گی کہ آمدن اور اخراجات میں توازن اختیار کرے۔ تبھی وہ اصلاحات ممکن ہوں گی جو بہت پہلے ہوجانی چاہئیں تھیں۔ حکومت کو خود مثال بن کر عوام کی رہنمائی کرنا ہوگی۔ صدر، وزیراعظم اور پوری پارلیمنٹ کو اپنے اصل اثاثے بتانا ہوں گے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار ہمارے طاقت ور لوگ ٹیکس ادا کریں گے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ فرانسیسی انقلاب سے پہلے اس ملک کی اشرافیہ کو ٹیکسوں سے مکمل استثنیٰ حاصل تھا۔ ملک وقوم کی معاشی تعمیر صرف اُسی صورت ممکن ہے کہ جب ہر کوئی اپنی آمدن کے تناسب سے ٹیکس دے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ موجود ہی نہیں۔ برعکس طرزِ عمل سے بہرحال تباہی آئے گی۔ اسی طرح معاشرے میں انتشار پھیلا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سادگی کی ایک سچی اور بھرپور مہم چلانا ہوگی۔ تب لوگوں کو یقین آئے گا کہ حکومت ان کا پیسہ برباد نہیں کرتی اور خود ان کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ پاکستان ایک غریب ملک ہے جہاں لوگ دنیا میں ٹیکس سب سے کم اور

عطیات سب سے زیادہ دیتے ہیں۔ عطیات کی بابت مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میں پاکستان میں سب سے زیادہ صدقات جمع کرنے والوں میں شامل ہوں۔ المیہ صرف یہ نہیں کہ حکمران لوگ ٹیکس نہیں دیتے بلکہ یہ بھی ہے کہ جو کچھ وصول ہوتا ہے اس کا بڑا حصہ کرپشن کی نذر ہو جاتا ہے۔ عجیب معاملہ ہے محنت اور دیانت داری پر انعام کی بجائے سزا ملتی ہے اور کرپشن کرنے پر رسوخ اور تحفظ۔

بددیانتی اور بدعنوانی کا خاتمہ کرنے کے لیے پورے عزم کے ساتھ وسیع تر اقدامات کی ضرورت ہے۔ پولیس اور نچلی عدالتوں کو بہتر بنانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ مقامی حکومت کو ایک مؤثر نظام قائم کرنا ہوگا اور ایسا ماحول کہ سمندر پار پاکستانی یہاں سرمایہ کاری کریں۔ وہی ہمارا سب سے بڑا اثاثہ ہیں۔ تعلیم میں نہ صرف انقلابی اصلاحات کی ضرورت ہے بلکہ بجٹ میں کم از کم تین گنا اضافہ بھی ضروری ہے۔ قبائلی علاقوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت بدل جانی چاہیے، جہاں ساٹھ لاکھ باعزت اور غیرت مند لوگ بستے ہیں اور اُن کی زندگیاں اُجاڑ دی گئی ہیں۔ جنوبی افریقہ کی طرح ہمیں بھی مفاہمت کی راہ اختیار کرنا ہوگی۔ اُن کے ساتھ بات کرنی چاہیے، نہ صرف قبائلی علاقوں بلکہ مسلح گروپوں سے بھی۔ ان سے بھی جو ہم نے خود اُس وقت تخلیق کیے تھے جب ہماری اشرافیہ، امریکہ کی چھتری تلے افغان جہاد کرنے نکلی تھی۔ صرف انتہا پسند گروپ ہی نہیں بلکہ سیاست دانوں کے نجی محافظوں پر بھی پابندی لگا دینی چاہیے جو بعض اوقات اتنی بڑی تعداد میں ہوتے ہیں کہ تعجب ہونے لگتا ہے۔ پورے ملک کو اسلحہ سے پاک کر دینا ہوگا۔

ہماری خارجہ پالیسی مکمل طور پر آزاد ہونی چاہیے۔ وقت آ گیا ہے کہ اس پر مکمل طور پر نظرثانی کی جائے، خاص طور پر بھارت کے معاملے پر۔ تمام معاملات پاکستان اور ہندوستان کے درمیان سیاسی مذاکرات کے ذریعے حل کیے جائیں۔ دونوں ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں کی

سرگرمیاں محدود کر دی جائیں صرف ایک بااعتبار حکومت ہی امریکہ کو یہ ضمانت دے سکتی ہے کہ آئندہ پاکستان سے کوئی دہشت گردی نہ ہوگی۔ یہ امریکہ کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ پاکستان میں ایک خودمختار حکومت کو خلوصِ دل سے تسلیم کر لے۔ اس کی کٹھ پتلی حکومتوں والی پالیسی ناکام ہوگئی ہے، نہ صرف پاکستان بلکہ پورے مشرقِ وسطیٰ میں، تیونس سے شام تک پھیلی انقلاب کی لہر نے یہ بات واضح کر دی ہے۔ کٹھ پتلی حکمرانوں کی سرپرستی کا ایک ایک فیصلہ دہشت گردوں کی مدد کرتا رہے گا۔ اُسامہ بن لادن اگر مصر میں ہوتا تو آج وہاں امریکہ کے خلاف نعرے لگ رہے ہوتے ایران میں بھی یہی ہوا تھا جہاں امریکیوں نے شہنشاہ ایران کی حمایت کی اور اس کی سزا بھگتی۔

دنیا کو اسلام یا کسی اور مذہب سے نہیں بلکہ ننگی مادیت پرستی سے خطرہ ہے۔ اپنا مفاد محفوظ کرنے کے نام پر طاقت وروں نے ہمیشہ غریبوں کو لوٹا ہے۔ دنیا کو بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ باہمی تصادم کی بجائے عظیم مذاہب تعاون کی راہ اختیار کریں۔ جس طرح کہ دنیا کو ماحولیاتی آلودگی سے پاک کرنے کے لیے ساری دنیا ایک دوسرے کی مدد کرنے کے سوا اور کوئی راہ اختیار کر ہی نہیں سکتی۔ یہاں یہ نکتہ دلچسپ ہے کہ اسلام اپنے پیروکار سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ماحول کا خیال رکھے۔ قرآن مجید میں لکھا ہے کہ: ''زمین پر نرمی کے ساتھ چلا کرو''۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تھا ''دنیا میں اس طرح رہو گویا تمہیں ہزار برس جینا ہے اور آخرت کی اس طرح تیاری کرو گویا تمہیں کل ہی رخصت ہو جانا ہے''۔ آخری بات یہ کہ صرف بااعتماد حکومت ہی پاکستانی فوج کو بچا کر طاقت ور بنا سکتی ہے، اس طرح کہ وہ اپنی آئینی حدود میں رہے۔ وِکی لیکس کے مطابق ہمارے سابق وزیرِ خزانہ شوکت ترین نے جو ہمارے ہسپتال کے بورڈ کے ممبر بھی رہے، امریکی سفیر این پیٹرسن (Anne Patterson) سے پوچھا تھا کہ پاکستان آرمی کو امریکہ سے کتنی مدد مل رہی ہے؟ اب یہ تماشہ ختم ہونا چاہیے کہ سیاستدان الگ اور فوجی قیادت

امریکہ سے الگ بات کرے۔ ہمارے آرمی چیف کو امریکہ یا کسی اور ملک سے براہ راست بات نہ کرنی چاہیے۔ ترکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے، فوج وہاں اس لیے مداخلت کیا کرتی کہ سیکولرازم کی حفاظت کے لیے اس کا آئینی کردار تھا، پھر وہاں طیب اردگان جیسا طاقت ور اور سچا لیڈر اُبھرا جس کی اخلاقی ساکھ بہت تھی۔ اس نے فوج کو اُس کے اصل کردار تک محدود کر دیا تبھی ترکی میں ایک حقیقی جمہوریت ابھرنے لگی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشی طور پر یہ ملک فروغ پذیر ہو گیا۔ اردگان اس لیے کامیاب رہے کہ انہوں نے ترکی کے ایک عام شہری کی آمدن تین گنا بڑھا کر 10 ہزار ڈالر سالانہ کر دی۔ چین کے بعد ترکی میں ترقی کی شرح ساری دنیا سے زیادہ رہی۔ ہمیں اگر صحیح زندگی گزارنا اور ترقی کرنا ہے تو اُس عظیم لیڈر اور پاکستان کے بانی محمد علی جناح کی پیروی کے سوائے ہمارے سامنے اور کوئی دوسری راہ نہیں۔ اُن کا انتخاب جمہوریت تھا، سچی جمہوریت۔

7 سال پہلے جب میری پارٹی بدترین حال کو پہنچ گئی تھی تو اپنے سب سے پُرانے اور سب سے اچھے دوست گولڈی کے ساتھ میں میاں بشیر سے ملنے گیا، اُن کی صحت خراب تھی۔ ادھر ہماری پارٹی کا حال یہ تھا کہ ہم ڈوبتے ہی چلے جا رہے تھے۔ عام طور پر وہ اس طرح نہیں سوچتا لیکن اب گولڈی مایوس تھا اس نے اداس لہجے میں میاں بشیر سے پوچھا: ''ہماری پارٹی کو اقتدار کب ملے گا؟'' میاں بشیر نے آنکھیں بند کر لیں۔ پانچ منٹ تک وہ گہرے استغراق میں رہے، پھر میری طرف دیکھا اور کہا: ''جب عمران یہ بوجھ اُٹھانے کے قابل ہو جائے گا۔'' اچانک مجھے یہ احساس ہوا کہ واقعی وہ سچ کہتے ہیں ابھی میں ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل نہیں۔ تحریکِ انصاف کی تشکیل کو 15 برس گزر چکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج میں اور ہماری جماعت اقتدار کی ذمہ داریوں سے نہ صرف انصاف کرنے کے قابل ہیں بلکہ میرا یقین ہے کہ اب یہی واحد پارٹی ہے جو ملک کو بحران سے نکال سکتی ہے۔ صرف میں ہی نہیں 30 اکتوبر کو

اس مقام پر، تاریخی جلسہ عام کے بعد جہاں کبھی پاکستان کا خواب دیکھا گیا لاکھوں نوجوان اب یہی باور کرتے ہیں برصغیر کی تاریخ میں کبھی کسی ایک عوامی اجتماع نے ایسے گہرے اثرات مرتب نہ کیے ہوں گے جتنے اس روز ہوئے۔ تاریخ لکھ دی گئی اور ملک کے طاقتور میڈیا نے، جس کا ثانی ساری دنیا میں نہیں کروڑوں دلوں میں گہرے نقوش ثبت کر دیئے۔ یہ میری زندگی کے مشکل ترین 15 برس تھے۔ سخت ترین جدوجہد کا زمانہ۔ جنگل میں لگی آگ کی مانند تحریکِ انصاف اب چاروں طرف پھیلتی جا رہی ہے۔ 30 سال کی عمر سے کم 70 فیصد نوجوان اس پارٹی کے ساتھ ہیں۔ دو حالیہ سروے اس بات پر شاہد ہیں۔ ایک معروف ادارے یو گوو (YouGov) کے سروے کا نتیجہ یہ تھا کہ 61 فیصد لوگ تحریکِ انصاف کے حامی ہیں ایک اور سروے میں جو امریکی پیو ریسرچ سنٹر (Pew Research Centre) نے کیا، 68 فیصد نے یہی بات کہی۔ ایک سال کے اندر ہماری حمایت میں 16 فیصد اضافہ ہوا۔ کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ تحریک انصاف کے پاس ڈھنگ کے امیدوار ہی نہیں۔ اللہ کے فضل سے اب تانتا بندھا ہے جن میں سے پارٹی کے پارلیمانی بورڈ کو انتخاب کرنا ہوگا۔ ہر خواب کے پورا ہونے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ جب یہ وقت آتا ہے تو دل یقین سے لبریز ہونے لگتا ہے۔ پانچ بار میں نے کرکٹ کا عالمی کپ کھیلا لیکن صرف آخری بار مجھے جیت جانے کا پورا یقین تھا۔ اس کے باوجود کہ دنیا میں کوئی ایک شخص بھی پاکستان کے ظفرمند ہونے پہ اعتبار نہ رکھتا تھا لیکن ہم جیت گئے۔ اب اتنا ہی مجھے یقین ہے کہ تحریکِ انصاف کے جیت جانے کا وقت آپہنچا۔

ع جیسے پتھر کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے

یہ ایک روحانی سفر ہے۔ یہ جواں سال جو کرکٹ کی تاریخ کے عظیم ترین کھلاڑیوں میں سے ایک ہے، کبھی خود کو نا قابلِ تسخیر سمجھتا تھا۔ کوئی منزل ایسی نہ تھی اپنی غیر معمولی صلاحیت، ریاضت اور یقین کی قوت سے جسے وہ حاصل نہ کر سکتا۔ لاہور کے ایچی سن کالج، پھر رائل لندن کے گرائمر سکول اور اس کے بعد اوکسفرڈ یونیورسٹی کے کیبل کالج سے تعلیم پانے والے اس آدمی کے لیے کبھی اللہ کا وجود فقط مسجد کی چار دیواری تک محدود تھا۔

(ڈیلی ٹیلیگراف، لندن)

کمال ذہانت سے لکھی گئی یہ کتاب پاکستان کی تاریخ اور عمران خان کی آپ بیتی کا امتزاج ہے۔ یہ ہر اس چیلنج کی داستان ہے، جو اوّل کرکٹ اور پھر خدمت انسانی کی مہمات میں اسے درپیش ہوئے۔ انہی امتحانوں سے جو سبق اس نے سیکھے، انہی سے سیاست کے میدان میں اس کے داخلے کا ماحول مرتب ہوا۔

(دی انڈیپنڈنٹ، لندن)

خان نے پشتون قبائل، کے علاوہ اہل سوات کی ثقافت اور اندازِ فکر کے بارے میں سحر انگیز انداز میں لکھا ہے۔ اسلامی شدت پسندی، اور سی آئی اے کی طرف سے جاری ڈرون حملوں کے پس منظر میں، ان لوگوں کے طرزِ احساس کے حوالے سے یہ فکر و نظر کے بہت ہی قابلِ غور نکات ہیں۔

(فائنینشل ٹائمز، لندن)

عمران خان کا مقدمہ، سادہ الفاظ میں بیان کی گئی ایک دلکش کہانی ہے۔ یہ پاکستانی قوم کے طرزِ حیات اور سیاست کے علاوہ عظیم کھلاڑی کی ناکامیوں اور فتوحات کی داستان ہے۔

(دی سپیکٹیٹر، لندن)

Published by:
Jahangir Books
www.jbdpress.com, www.jworldtimes.com

ISBN: 978-969-573-359-2
9 789695 733592